فضائل نامہ



مفسر قرآن آیت اللہ علامہ حسین بخش جاڑا

فضائل نامہ

مناقبِ علیؑ کے موضوع پر مشتمل شاہکار کتاب

تحریر:

آیت اللہ علامہ حسین بخش جاڑا فاضلِ نجف اشرف

تلخیص:

حجۃ الاسلام ناصر مہدی جاڑا فاضلِ قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین لاہور

جناح ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ لاہور

فون: 042-5425372

کتاب : فضائل نامہ

مؤلف : علامہ حسین بخش جاڑا مرحوم

مترجم : علامہ ناصر مہدی جاڑا

کمپوزنگ: ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

تعداد : 1000

اشاعت : 2012

ھدیہ : [redacted] روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین لاہور

الحمد مارکیٹ۔ فرسٹ فلور۔ دکان نمبر ۲۰

اردو بازار لاہور 042-7225252

فہرست

فضائل نامہ

محمدؐ وآلِ محمدؑ باعثِ تخلیق کائنات ہستیاں ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کے محامد و اوصاف کا بیان پوری کائنات کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو قرآن وحدیث اور روایات متواترہ کا احسان ہے کہ ہم اللہ رب العزت کی محترم ومقدس ہستیوں کے اوصاف و فضائل سے آشنا ہیں اور ان نورانی جھلکیوں سے دلوں کو روشن اور ذہنوں کو منور کرتے رہتے ہیں۔

فضائل آلِ محمدؑ کا بیان کرنے والے برصغیر کے علماء میں علامہ حسین بخش جاڑا صاحب قبلہ ایک خصوصی مقام رکھتے تھے اور اُن کی تصانیف وتقاریر فضائل کے حوالے سے بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ افسوس کہ یہ کتب آج تقریباً ناپید ہو چکی ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کا معیار اشاعت ایسا نہیں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں پر پورا اُتر سکے۔ بعض جگہوں پر فنی سقم بھی کھٹکتے ہیں، چنانچہ ہم نے ان کتب سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کے لیے اور دورِ حاضر کے مؤمنین کو ان سے مستفید کرنے کے لیے علامہ ناصر مہدی جاڑا صاحب کی خدمات حاصل کی ہیں جو اسی علمی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ موصوف نے علامہ حسین بخش جاڑا کی اکثر وبیشتر کتب کا خلاصہ تیار کر دیا ہے، جس میں فضائل آلِ محمدؑ کے جواہر کا جوہر سمٹ آیا ہے۔ جبکہ ہم نے اسے نظرِ ثانی کے بعد شایانِ شان طریق پر شائع کر کے نذر قارئین کیا ہے۔

یہ بھی ذہنِ عالی میں رہے کہ تلخیص یا خلاصہ نگاری اختصار کا کام ہرگز نہیں بلکہ اس انداز سے طویل تحریر کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تمام اوصاف وکمالات جوں کے توں موجود رہتے ہیں اور کوئی حصہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ گویا کل جزو میں سمو دیا جاتا ہے اور اُسے پڑھنے کے بعد طویل تحریر کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ فضائل نامہ ایسا ہی جامع مرقع ہے جس کا مطالعہ آپ کو علامہ حسین بخش جاڑا کی تمام کتب کے مطالعہ کے برابر مزا دے گا اور اس لطف میں سرشار ہو کر آپ کہہ اُٹھیں گے بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر۔

اس کتاب مستطاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں معاونت پر میں اپنے ادارہ کے بھی اراکین کا تہہ دل سے ممنون ہوں خصوصاً اپنے علمی و اشاعتی مشن کی وارث نورچشم معصومہ بتول کی توفیقات میں اضافے کے لیے دعا گو ہوں۔ آخر میں دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو محمدؐ و آلِ محمدؑ کے اس عظیم مشن کو جاری وساری رکھنے میں ہماری امداد فرمائے اور ہر تعصب، تنگ نظری اور گروہ بندی سے محفوظ رکھے۔ آمین بحق آلِ محمدؑ یاسینؑ۔

طالب دعا

ریاض حسین جعفری فاضل قم

سرپرست ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ط وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

''اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے (شروع کرتا ہوں) حمد صرف اللہ کے لئے ہی ہے، جو عالمین کا پروردگار، رحمٰن، رحیم (اور) مالکِ روزِ جزا ہے (میرے اللہ) صرف تیری ہم عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ ثابت رکھ ہم کو سیدھے رستے پر (یعنی، ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے اِنعام کیا نہ کہ جن پر غضب ہوا، اور نہ گمراہوں کا۔''

سورۂ فاتحہ کے فضائل

مجمع البیان میں ابی بن کعب سے مروی ہے کہ جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا: جو مسلمان سورہ فاتحہ کو پڑھے اس کو دو تہائی قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا اور تمام مومنین ومومنات پر صدقہ کرنے کا اجر اس کو عطا ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ سورہ فاتحہ کو پڑھنے کا ثواب پورے ختم قرآن کے ثواب کے برابر ہے (یعنی جو شخص قرآن پڑھا ہوا نہ ہو تو اُس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے، بلکہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے۔ خدا اُس کو پورے قرآن کے پڑھنے کا

اجر دے گا۔

نیز ابی بن کعب سے مروی ہے کہ میں نے حضرت رسالت مآب ؐ کے حضور میں سورہ فاتحہ پڑھی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ خداوند کریم نے تورات، انجیل اور زبور بلکہ قرآن میں بھی اس کی مثل نازل نہیں کی۔ یہ اُم الکتاب ہے اور یہی سبع مثانی ہے اُور یہ اللہ اور بندے کے درمیان تقسیم شدہ ہے اور بندے کے لئے ہے کہ وہ جو بھی سوال کرے۔

ایک روایت میں ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا: میں تجھے ایک ایسی سورت کی تعلیم دوں جس سے بہتر خداوند کریم نے کوئی سورت قرآن میں نازل نہ فرمائی ہو؟

جابر نے عرض کی: جی ہاں۔

میرے ماں باپ آپ ؐ پر فدا ہوں یارسول اللہ ؐ پس آپ نے اس کو سورۂ حمد تعلیم فرمائی۔

پھر آپ ؐ نے فرمایا: اے جابر! اس کے متعلق میں تجھے کچھ بتاؤں؟

جابر نے عرض کی: جی ہاں۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔

آپ ؐ نے فرمایا: یہ موت کے سوا ہر مرض کے لئے شفا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: ''جس کو الحمد تندرست نہیں کرسکتی اس کو کوئی چیز تندرست نہیں کرسکتی۔''

(حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآب ؐ نے فرمایا کہ مجھے ارشاد خداوندی ہوا ہے:

یَا مُحَمَّدُ وَلَقَدْ آتَیْنَاکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِیْمِ۔

''ہم نے تجھے سبع مثانی اور قرآنِ عظیم عطا کیا۔''

پس اللہ تعالیٰ نے مجھے فاتحہ کا احسان الگ جتلایا اور پورے قرآن کے مقابلہ میں اس کو ذکر فرمایا اور تحقیق عرش کے تمام خزانوں میں سے فاتحہ زیادہ وزنی وقیمتی جوہر ہے۔ اور اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے ساتھ مختص فرمایا اور کسی نبیؑ کو اس نعمت میں شریک نہیں کیا۔ سوائے حضرت سلیمانؑ کے کہ اس کو اس کی ایک آیت عطا کی۔ چنانچہ بلقیس کے قول کو بیان فرماتا ہے:

إِنِّيْ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيْمٌ ○ إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

پس جو شخص محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی ولا کا اعتقاد رکھتے ہوئے اور اس کے امر کی اطاعت کرتے ہوئے، نیز اس کے ظاہر و باطن پر ایمان لاتے ہوئے، اس کو پڑھے گا، خداوند کریم ہر ہر حرف کے بدلہ میں اس کو ایسی نیکی (نعمت) عطا فرمائے گا، جو دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے افضل ہوگی، اور جو شخص سورہ فاتحہ کو کسی سے اور سے سنے گا تو جس قدر پڑھنے والے کو ثواب ملے گا اس کا ایک تہائی سننے والے کو عطا ہوگا۔ پس ہر ایک کو یہ آسان نیکی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنی چاہیے، کیونکہ یہ غنیمت ہے ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور تمہارے دلوں میں حسرت باقی ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ اگر سورہ فاتحہ کسی درد کے مقام پر ستر مرتبہ پڑھی جائے تو وہ درد ضرور ختم ہو جائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ پانی کے پیالہ پر چالیس مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر مریض پر چھڑکا جائے تو اس کو شفا ہوگی۔ بہر کیف سورہ فاتحہ کے فضائل اور اس کے خواص شیعہ وسنی ہر دو فریق کی کتابوں میں بہت زیادہ منقول ہیں۔ گویا یہ سورۂ مجیدہ روحانی وجسمانی ہر دو بیماریوں کے لئے شفا بخشتی ہے، بشرطیکہ نیت صاف ہو۔

چنانچہ علامہ علی اکبر نہاوندی نے کتاب خزینۃ الجواہر (ص ۲۸۵، ص ۵۷۲) میں کتاب جامع النورین سے نقل فرمایا ہے: حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کسی صحابی کا ہاتھ ایک جنگ میں کٹ گیا پس وہ حضرت کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے اس کا کٹا ہوا ہاتھ اپنے مقام پر جوڑ کر آہستہ سے کچھ پڑھا، پس وہ تندرست ہو گیا اور خوشی سے چلا گیا۔ پھر دوسرے دن حضرت کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی: حضور! میرے دست بریدہ پر آپ نے کیا پڑھا تھا کہ وہ تندرست ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: میں نے سورہ فاتحہ پڑھا۔ اس شخص نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ اچھا! آپ نے سورہ فاتحہ پڑھا تھا۔ پس یہ کہنا تھا کہ اس کا وہی ہاتھ اسی مقام سے دوبارہ جدا ہو کر گر گیا اور مرتے دم تک ویسے کا ویسا رہا۔

کلام خدا میں یہ برکت ہے کہ بیماری تو بجائے خود مردہ بھی اس سے زندہ ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک مقام پر خدا ارشاد فرماتا ہے کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جا سکتے ہیں۔ زمینوں کی مسافتیں طے کی جا سکتی ہیں اور مردوں سے کلام کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض احادیث میں ہے:

> ''قرآن میں جو کچھ ہے وہ سورہ فاتحہ میں موجود ہے، بلکہ گزشتہ روایت میں بھی موجود ہے کہ سورہ فاتحہ باقی تمام سورتوں سے افضل ہے اور خداوند کریم نے بھی اس کو پورے قرآن کے مقابلہ میں ذکر فرمایا ہے تو سورہ فاتحہ کے پڑھنے سے بیماری کی تندرستی تو درکنار اگر مردہ میں روح پلٹ آئے تو یہ بھی بعید نہیں۔''

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

''اگر کسی مردہ پر ستر مرتبہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کی جائے اور خدا اس میں

روح کو پلٹ دے تو تعجب کی بات نہیں۔"

لطیفہ

علامہ نہاوندی قدس سرہ نے محدث نوری قدس سرہ کی کتاب دارالسلام سے نقل فرمایا ہے کہ سید محمد موسوی نجفی ذکر کرتے ہیں کہ میں بچپنے کے زمانہ میں کند ذہن تھا لیکن نوافل وتعقیبات کا دلدادہ تھا۔ ایک دن مصباح کفعمی کا مطالعہ کیا تو اس میں یہ حدیث نظر سے گزری، جس کا مضمون یہ ہے:

اگر میت پر چالیس مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھی جائے تو اس کے زندہ ہو جانے میں کوئی تعجب نہیں۔"

میں نے دل میں کہا کہ لوگوں پر تعجب ہے کہ اس بات کے ہوتے ہوئے اپنے مردوں کو دفن کر دیتے ہیں اور سورہ فاتحہ پڑھ کر ان کو زندہ نہیں کر لیتے۔ پس ایک مکھی کو پکڑ کر میں نے ایک حوض میں ڈبو دیا اور عصر تک اسے ڈبوئے رکھا جب مجھے اس کی موت کا یقین ہو گیا تو اس کو پانی سے باہر نکال کر خشک مقام پر رکھا اور اس کے دوبارہ زندہ کرنے کی نیت سے اس پر سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کیا اور اس پر دم کرتا گیا، جب تیس مرتبہ پڑھ چکا تو اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اس مکھی نے اپنے پاؤں کو حرکت دی اور اپنے پروں کو مس کیا اور ابھی چالیس مرتبہ تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ مکھی پرواز کر کے چلی گئی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ مکھی شاید پہلے سے زندہ ہو۔ اور اس پر موت واقع نہ ہوئی ہو اور مجھے اس کی موت کا اشتباہ ہوا ہو۔ پس دوسرے دن ایک اور مکھی پکڑ لی اور اس کو صبح سے لے کر ظہر تک برابر پانی میں ڈبوئے رکھا اور پھر نکال کر عصر تک زمین پر اسے ڈال دیا۔ اس میں کوئی حس وحرکت نہ تھی۔ جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ پس میں نے سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کر دیا اور اس مرتبہ بھی چالیس تک نہ

پہنچا تھا کہ مکھی باذنِ خدا زندہ ہو کر ہوا میں پرواز کر گئی۔

سورہ فاتحہ کے مقدم ہونے کی وجہ

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک مشہور فرمان جس کو علامہ نہاوندی قدس سرہ نے خزینۃ الجواہر (ص ۳۳۶ و ۵۷۴) میں نقل فرمایا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''تمام آسمانی کتابوں کا علم قرآنِ مجید میں ہے۔ اور تمام قرآن کا علم سورہ فاتحہ میں موجود ہے۔ اور جو کچھ سورہ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے۔ اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ باءِ بسم اللہ میں ہے وہ اس نقطہ میں ہے جو باء کے نیچے ہے اور میں وہی نقطہ ہوں۔''

اسی ذیل میں علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ من جملہ باقی وجوہ کے سورہ فاتحہ کے باقی قرآنی سورتوں پر مقدم ہونے کی یہ بھی وجہ ہے کیونکہ سورہ فاتحہ کے ساتھ اجمال وتفصیل کی نسبت حاصل ہے، یعنی قرآن میں جو کچھ تفصیل کے ساتھ درج ہے وہ سورہ فاتحہ میں اجمالاً موجود ہے۔

اَلْحَمْدُ: قرآن مجید میں خداوند کریم کی تمجید، تحمید، تسبیح، تقدیس، تہلیل، تکبیر اور شکر و رضا جس قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لفظ اَلْحَمْدُ ان کا اجمالی خاکہ ہے۔

لِلّٰہِ: قرآنِ مجید میں جس قدر صفات جلال وکمال ذات احدیت کے لئے بیان ہوئے ہیں لفظ للہ ان سب کا اجمال ہے۔

رَبِّ: قرآن مجید میں جہاں جہاں ربوبیت کا تفصیلی ذکر ہے لفظ رب میں وہ سب کچھ اجمالاً موجود ہے۔

اَلْعَالَمِیْنَ: کتاب مجید میں آسمانوں، زمینوں، جنوں، انسانوں، وحوش، طیور،

اولیاء، نیکوں اور بروں بلکہ جمیع مصنوعات کی جس قدر تفصیل ہے وہ لفظ اَلْعٰلَمِیْنَ میں بند ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ : قرآن میں جس قدر، رزق، انعام، احسان، اکرام وغیرہ مذکور ہیں لفظ اَلرَّحْمٰنِ ان سب پر مشتمل ہے۔

اَلرَّحِیْم: کلام مجید میں جہاں کہیں وسعتِ رحمت اور گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے لفظ اَلرَّحِیْم سب کو شامل ہے۔

مَالِكِ: قرآنِ شریف میں خدا کی قدرت و عظمت، اُس کی بقاو سرمدیت اور اس کا بے مثل و بے مثال اور لاشریک ہونا یہ سب کچھ کلمہ مالک میں جمع ہیں۔

یَوْمِ الدِّیْن: پورے قرآن میں جس قدر قیامت، مواقفِ حساب۔ نعمات و جملہ احوال بہشت اور درکات وخطراتِ جہنم اور میزان وصراط وغیرہ کے تفصیلی تذکرے ہیں وہ لفظ یَوْمِ الدِّیْن میں سمائے ہوئے ہیں۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ: جملہ عبادات جن کا قرآن میں ذکر ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے اندر موجود ہیں۔

وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ: کلام اللہ میں ذکرِ استعانت، توکل اور طلب مدد جہاں بھی مذکور ہے وہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں مندرج ہیں۔

اِھْدِنَا: قرآن میں ہدایت وارشاد، دعا وسوال اور تضرع وغیرہ کا جہاں ذکر ہے اِھْدِنَا اس کا جامع ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ: قرآن پاک میں جملہ حلال و حرام، اوامر ونواہی اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ: کتاب پاک میں جس قدر نیک لوگوں کے

حالات، ان کے طریقے، اُن کی سنتیں، سیرتیں، ان کا سببِ نجات اور بلندی درجات وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ان لفظوں میں اختصار کے ساتھ مندرج ہیں۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ: بنی اسرائیل کے حالات وقصص، ان کا کفرانِ نعمت، تکذیبِ انبیاء، وقتلِ انبیاء اور ان کا گناہوں پر اصرار اور پھر ان پر غضب خدا اور عذاب کا نزول قرآن میں جتنی تفصیل سے مذکور ہے وہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ میں سمایا ہوا ہے۔

وَلَا الضَّآلِّیْنَ: فرعونوں، جابر بادشاہوں، نصرانیوں اور مشرکوں، گمراہوں کی پوری قرآنی تفصیل کا یہ اجمالی عنوان ہے۔ پس اسی لئے سورہ فاتحہ کو تمام قرآنی سورتوں پر مقدم کیا گیا ہے، کیونکہ اجمال تفصیل سے پہلے ہوا کرتا ہے۔

اَقُوْلُ: جس طرح سورہ فاتحہ پورے کلام اللہ کا اجمال ہے۔ اسی طرح آیہ کریمہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پورے سورہ فاتحہ کی اجمالی تصویر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ: لفظ اللہ علم ہے اس ذات کا جو واجب الوجود اور جامع جمیع صفاتِ کمال ہے۔ لہٰذا اس لفظ میں جملہ صفاتِ جلال وکمال اور تمام صفاتِ ثبوتیہ وسلبیہ اجمالاً درج ہیں۔ پس تحمید وتسبیح وتہلیل اور عبادت اور استعانت وغیرہ کا سزاوار ہونا اسی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ: تمام نعماتِ دنیاویہ ودینیہ کا بیان اسی مختصر سے لفظ میں سمویا ہوا ہے۔

اَلرَّحِیْمِ: چونکہ یہ لفظ خصوصی انعامات کے لئے ہے جو قیامت کے روز مومنین پر کئے جائیں گے اور دشمنانِ خدا ان سے محروم ہوں گے۔ لہٰذا قیامت کے حالات اور اُخروی انعامات اور کفار کی بری بازگشت وغیرہ کے لئے لفظ الرحیم کو جامع کہا جا سکتا ہے۔

روایت گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ذات رب العزت نے جناب رسالت

مآبؐ پر قرآن مجید کے ساتھ سورہ فاتحہ کا بالخصوص امتنان فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔

''ہم نے تجھے سبع مثانی (فاتحہ) اور قرآنِ عظیم عطا کیا۔''

پس سورہ فاتحہ کا قرآن کے مقابلہ میں ذکر کرنا بھی غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جو کچھ تفصیل سے بیان ہوا ہے وہ سورہ فاتحہ میں اجمالاً درج ہے۔ یہ سورہ المجیدہ اُصولِ دین، توحید، نبوت، امامت اور قیامت کے بیان کو جس طرح متضمن ہے اسی طرح جملہ فروعِ دین نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، تولّی اور تبرا کو اجمالاً اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ گویا اس سورہ کے ہر ہر لفظ میں علوم قرآنیہ اور مطالب شرعیہ کے دفتر پنہاں ہیں، جن کو کما حقہ سوائے راسخین فی العلم کے اور کوئی نہیں پا سکتا۔ چنانچہ مولائے کائنات، حلالِ مشکلات حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تفسیر باء بسم اللہ بیان کرنا شروع کی حتیٰ کہ صبح نمودار ہوگئی، اور ایک مقام پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کرتا جاؤں تو اس سے ستر اونٹ بار ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ میرا اور جنابِ رسالت مآبؐ کے تمام صحابہ کا علم حضرت علی علیہ السلام کے علم کے مقابلہ میں اس طرح ہے جس طرح ایک قطرۂ آب سات سمندروں کے مقابلہ میں۔ ہم نے یہ حدیث اور اس باب کی اکثر احادیث بمعہ حوالہ کتب اسی کتاب کی پہلی جلد یعنی مقدمہ انوار النجف میں اصل عبارتوں کے ساتھ مختلف عناوین کے تحت بیان کر دی ہیں۔ (مقدمہ تفسیر ص ۸۷، ۱۳۹)

کور باطن یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ سورہ فاتحہ کی آیات آپس میں بالکل بے ربط و بے جوڑ ہیں۔ لہٰذا اس سے ایک مسلسل مضمون حاصل نہیں ہو سکتا، حالانکہ چشم بصیرت سے

لمعاتِ حقیقت پر نظر ڈالنے سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ جو لطافتِ بیان سورہ مجیدہ فاتحہ میں پائی جاتی ہے اور جس حسنِ انداز سے علوم قرآنیہ کو اس مختصر سورہ میں سمو دیا گیا ہے وہ صرف اسی کلام پاک کا حصہ ہے جو اس کی اعجازی حیثیت کی واضح دلیل ہے۔

گویا پورے قرآنِ مجید کے تفصیلی بیان کے لئے سورہ فاتحہ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور سورہ فاتحہ کے لئے بسم اللہ الرحمن الرحیم موضوع بیان ہے تو پس آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم پورے قرآنِ مجید کا موضوع ٹھہری اور سورہ فاتحہ اس کا ایک سرسری ترجمہ ہے اور الم سے لے کر والناس تک پورا کلام پاک انہی مطالب کا تفصیلی بیان ہے۔ اب یہ کہنا بالکل درست اور قرینِ عقل ہے کہ کتب سماویہ کے تمام علوم قرآن میں ہیں اور قرآن کے تمام علوم سورہ فاتحہ میں ہیں۔ اور سورہ فاتحہ کے تمام علوم بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے جمیع علوم بائے بسم اللہ میں اور بائے بسم اللہ کے جملہ علوم اسی نقطہ میں ہیں جو باء کے نیچے ہے تو اس میں اشکال تب ہو سکتا ہے کہ باء سے مراد یہی حرف لیا جائے جو حروف تہجی میں دوسرے پر نمبر لکھا جاتا ہے اور نقطہ سے مراد وہی ظاہری نقطہ لیا جائے جو حرف باء کے ساتھ لازم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے بیان کے آخیر میں اس خیال کی تردید فرمادی ہے کہ نقطہ سے مراد میں ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باء سے مراد باطناً وجود ذیجود جناب رسالت مآبؐ ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک حقیقت نوری کے دو حصے ہیں (اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ) اب مطلب صاف ہے کہ وہ تمام علوم جو بسم اللہ میں ہیں وہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس ہیں۔ اور وہ تمام علوم جو جناب رسالت مآبؐ کے پاس تھے وہ حضرت علیؑ کے پاس ہیں۔

چنانچہ خود رسالت مآب کا ارشاد ہے:

اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا عَلِيٌّ خَازِنُ عِلْمِیْ عَلِيٌّ وِعَاءُ عِلْمِیْ

یہ حدیثیں باختلاف عبارات بمعہ حوالہ جات کتب اسی کتاب کی پہلی جلد میں بیان کی جا چکی ہیں (مقدمہ تفسیر ۸۷،۰ ۱۷) نقطہ باء بسملہ کا مفصل بیان ایک مستقل عنوان کے تحت ہوگا۔ نیز سورہ فاتحہ کا نام ''ام الکتاب'' ہونا بھی اسی بات کی دلیل ہے۔ کہ قرآن کے جملہ مضامین کی یہ اصل ہے کیونکہ ام کا معنی ماں ہے اور ماں اولاد کے لئے اصل اور اولاد اس کی فرع ہوتی ہے اور اصل کا فرع سے مقدم ہونا ضروری ہے۔ اور اسی سورہ کا نام ''الاساس'' بھی اسی کا موید ہے کیونکہ اساس کا معنی بنیاد ہوتا ہے گویا سورہ فاتحہ بنیاد ہے پورے قرآن کی لہٰذا اس کا مقدم ہونا لازمی ہے اور ترتیب آیات سورہ فاتحہ کے عنوان میں اس بیان کی مزید وضاحت آجائے گی۔

سورۂ فاتحہ کے اَسماء اور وجہ تسمیہ

اَلفَاتِحہ: فاتحہ اس لئے کہتے ہیں کہ تمام قرآنی سورتوں سے یہ پہلے ہے اور اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

الم الکتاب، اَلاَسَاس: ان دو ناموں سے سورہ مجید فاتحہ کی وجہ تسمیہ ابھی بیان کر دی گئی ہے۔

اَلشِّفَاءُ: سورہ مذکورہ کے فضائل کے بیان سے وجہ تسمیہ صاف ظاہر ہے۔

اَلسَّبع: چونکہ اس سورہ کی کل آیات سات ہیں اور سبع بھی سات کو کہتے ہیں۔

اَلحَمدُ: کیونکہ اس میں پروردگار عالم کی حمد بیان کی گئی ہے۔

اَلوَافِیہ: کیونکہ ہر نماز میں خواہ واجب ہو یا سنت اس کا پورا پڑھنا ضروری ہے اور وافیہ کا معنی ہے پوری۔

اَلکَافِیہ: یہ اس لئے کہ یہ سورہ نماز نفلی میں تنہا کافی ہے اور واجبی نمازوں میں بھی بعض مقامات پر تنہا کافی ہو سکتی ہے۔ اور دوسری کوئی سورت نماز میں تنہا کافی نہیں ہے۔

اَلصَّلٰوۃُ: یہ اس لئے کہ نماز میں اس سورہ کا پڑھنا ضروری ہے۔

چنانچہ مشہور حدیث ہے:

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الکِتَابِ۔

"یعنی کوئی نماز بغیر فاتحہ کے درست نہیں۔"

اَلْمَثَانِیْ: اس نام کے متعدد وجوہ بیان کئے گئے ہیں:

① چونکہ ہر نماز میں خواہ فرض ہو یا سنت اس کو دو دفعہ پڑھنا ضروری ہے، اس لئے اس کو مثانی کہتے ہیں۔

② یہ سورہ مبارکہ دو دفعہ نازل ہوئی۔ ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں، اس لئے اس کو مثانی کہا جاتا ہے۔

③ یہ سورہ دو حصوں میں منقسم ہے: ثناء خالق اور سوال مخلوق جیسا کہ بعض احادیث سے یہ مضمون مذکور ہو چکا ہے۔

④ اس سورہ کی سات آیتیں ہیں اور ہر آیت دو معنے رکھتی ہے۔

اسماء وصفات حق تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: ایک اس کی عظمت وقدرت پر دلالت کرتی ہیں، اور دوسرے اس کی رحمت اور مہربانی کو ظاہر کرتی ہیں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم میں دونوں پائے جاتے ہیں۔

شکر کی دو قسمیں ہیں:

ایک ذات وصفات پر اور دوسرے احسانات وانعامات پر اور الحمد للہ میں دونوں شکر کی قسمیں موجود ہیں۔

عالم دو ہیں: دنیا وآخرت اور رب العالمین دونوں کو شامل ہے۔

رحمت کی قسمیں دو ہیں:

دنیا میں اور قیامت میں اور الرحمٰن الرحیم میں دونوں موجود ہیں۔ بدلہ وجزا دو چیزوں کے مقابلہ میں ہوتا ہے، ایک نیکیوں کا، دوسرا برائیوں کا اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

میں دونوں آجاتے ہیں۔

اطاعت کی دو قسمیں ہیں:

عبادت اور عبودیت اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں دونوں پائی جاتی ہیں۔

طلب مدد دو چیزوں کے لئے ہوتی ہے:

اچھی چیز حاصل کرنے کے لئے اور بُری چیز کو روکنے کے لئے اِیَّاكَ نَسْتَعِین دونوں معنوں کو شامل ہے۔

ہدایت دو مقام کے لئے ہے: ایک معرفت اور دوسرے اطاعت اھدنا سے دونوں مراد ہیں۔

گمراہی دو قسم کی ہے:

ایک اہل کتاب کی اور دوسری مشرکین وغیرہ کی اور آخر سورہ میں دونوں کا بیان ہے۔ ان وجود کے علاوہ اس سورہ کو المثانی کہنے کے اور وجوہ بھی بیان کئے گے ہیں۔ جن کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔

ترتیب آیات سورہ فاتحہ

مراتب ارتقاء میں پہلا مرتبہ علم کا ہے۔ اس کے بعد عمل اور پھر نتیجہ ذات احدیت نے جنوں اور انسانوں کے مقصد خلقت کے متعلق ارشاد فرمایا:

مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ

''ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں خلق کیا مگر عبادت کے لئے۔''

عبادت

معرفت اور جزا دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔

معرفت عبادت سے پہلے اور عبادت جزا سے مقدم ہے۔ پس خداوند کریم نے انسان کو پہلے پہل معرفت کا درس دیا اور کلام مجید کو لفظ بسم اللہ سے شروع فرمایا اور بندے کو تعلیم دی کہ ہر کام سے پہلے اللہ کا نام لینا ضروری ہے اور چونکہ ذات اللہ کا تصور حقیقی بندہ کے لئے ناممکن تھا، اس لئے اس کے بعد الرحمٰن الرحیم کا اضافہ کر دیا، تا کہ یہ سمجھ میں آ جائے کہ تمام نعمات میں اہم نعمت وجودِ ممکنات ہے اور اللہ ہی اس کا منعم ہے تو اس کی ذات قدیم ہے اور وجود ممکنات حادث ہے۔ اور وجود ممکنات کا حُسنِ نظام سے برقرار رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا صانع حقیقی قادر بھی ہے، علیم وحکیم بھی ہے اور چونکہ ممکنات تغیر سے کالی نہیں تو ماننا پڑے گا کہ ان کا موجد باقی وغیر فانی ہے۔ اس میں تغیر آ ہی نہیں سکتا اور نیز اس کا مرید و مدرک ہونا بھی ضروری ہے۔ بس صرف اسی آیت میں غور وفکر کرنے سے اس کی جملہ صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی معرفت ہو جائے گی اور پتہ چل جائے گا کہ اللہ اس ذات کا نام ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ورنہ نظام کا درہم برہم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ خود فرماتا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلاَّ اللَّهُ لَفَسَدَتَا

"اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہوتے تو ان کا نظام فاسد ہو جاتا۔"

یعنی نظام کائنات کی بقا اس کے باقی اور لاشریک ہونے کی ظاہر واضح دلیل ہے۔

پس جب انسان کے ذہن میں خدا کی معرفت آ گئی اور یہ سمجھ لیا کہ میرا، بلکہ کل کائنات کا وجود اور دنیا کی تمام نعمات اللہ ہی کی طرف سے ہیں تو عقل انسان کو خود پکار کر کہے گی کہ اس منعم حقیقی کا شکر ادا کیا جائے جو عالمین کا رب ہے۔ اب شکر کا وجود بھی

لینے کے بعد اس کی طرف سے آئے ہوئے تمام اوامر و نواہی کو معلوم کر کے ان پر عمل کی کوشش کرے گا اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کے دروازہ پر دستک دیئے بغیر چونکہ یہ مرحلہ طے کرنا مشکل ہے، لہٰذا معرفت خدا کے بعد عمل و عبادت کے لئے معرفت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و امام علیہ السلام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اسی کتاب کی جلد اول میں توحید و ضرورت نبیؐ اور ضرورت امام علیہ السلام کے عناوین میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے پس آیہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ معرفت کے بعد عبادت کی منزل کو ظاہر کرتی ہے۔

منعم حقیقی کا شکر ادا کرنے کے لئے جب نبیؐ یا امام سے احکام شرعیہ کی تعلیم پالی تو مقتضائے بشریت کے لحاظ سے اس میں بھول چوک کا ہونا ضروری تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ مبادا انسان اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔ لہٰذا بعد میں پھر اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمِ کا اعادہ فرمادیا جس میں لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ اے انسان مقام اطاعت و ادائیگی شکر میں اگر تجھ سے کچھ کوتاہی ہو بھی جائے تو مایوس نہ ہو کیونکہ میں رحمٰن و رحیم ہوں۔ جس طرح وجود کائنات اور اس میں تمام ظاہری انعامات میری طرف سے ہیں، اسی طرح آخرت کے انعامات و مہربانیاں بھی میری ہی طرف سے ہوں گی اور جس طرح میں رب العالمین ہوں اسی طرح رحمٰن و رحیم بھی ہوں۔ خطا سرزد ہو جانے کے بعد تو اگر توبہ کرے گا تو میں اپنے رحم و کرم سے تجھے معافی دے دوں گا۔ اور اس کے بعد فرمایا: مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی قیامت کا معاملہ میری ذات سے ہی وابستہ ہے، کیونکہ اس دن اور کسی کی کوئی ملکیت نہ ہوگی۔ نیز اس آیت سے متنبہ کر دیا کہ اے انسان اپنے نتیجہ سے غافل نہ ہو۔ جس طرح میں ایجاد خلق میں منفرد ہوں اور میں نے اپنے ارادہ سے ہی تمام کائنات کو وجود بخشا ہے اور تجھے مقام اطاعت پر لا کھڑا

کیا ہے، اسی طرح تجھے اپنی کارکردگی کا بدلہ دینے کے لئے بھی صرف میں ہی ہوں. جس طرح ایجاد میری قدرت سے ہے اسی طرح اعادہ بھی میری قدرت سے ہوگا۔ مجھ سے بھاگ کوئی نہیں سکتا۔ تجھے شکرگزاری کی جزا ضرور دوں گا اور اگر احسان فراموشی کر کے سرکشی کرے گا تو اس کی سزا بھی ضرور دوں گا۔

پس یہاں تک پہنچ کر انسان نے مقام دنیا میں اپنے پیش و پس کو یعنی مبداء ومعاد کو سمجھ لیا یا یہ کہ دیجئے کہ مِنَ اَینَ وَفِی اَینَ وَاِلیٰ اَینَ۔ یعنی کہاں سے آیا اور کہاں آیا اور کہاں جانا ہے، تینوں منازل کا تصور سامنے آ گیا کہ اللہ نے بھیجا اور مقام اطاعت اور عبادت و شکر میں بھیجا اور مقام جزا و سزا (قیامت) میں حاضر ہونا ہے۔ جب انسان اس منزل تک پہنچ چکا اور جان لیا کہ میرے ماضی، حال اور مستقبل سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ مبداء و معاد کا مالک صرف وہی ہے۔ تو پس اس کی عظمت وقدرت اور ہیبت وجلالت آنکھوں کے سامنے آ گئی اور غیب سے خطاب کی طرف پلٹ گیا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

اَلْمَعْرِفَةُ بَذْرُ الْمُشَاهِدَةِ وَالرُّوْيَةُ ثَمْرَةُ الْيَقِيْنِ۔

''یعنی معرفت مشاہدہ کا بیج ہے اور رویت یقین کا پھل ہے۔''

یعنی کسی چیز کی معرفت جب کامل ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے ہے اور گویا میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اسی طرح جب کسی شے کے وجود کا یقین کامل ہو جاتا ہے تو وہ شے اگرچہ ظاہراً آنکھوں سے اوجھل ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ چنانچہ بحار الانوار جلد ۴ میں منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے کبھی اپنے خدا کو دیکھا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

"میں نے بے دیکھے خدا کی عبادت کبھی نہیں کی۔"

سائل نے عرض کیا: وہ کیسے؟

آپ نے فرمایا: آنکھیں اس کو بصارت ظاہریہ سے نہیں دیکھ سکتیں، بلکہ دل بصیرت ایمانیہ سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

پس معرفت کے بعد زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔

"اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔"

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (بقرہ آیت ۱۲۰)

اس مقام پر نَعْبُدُكَ نہیں کہا اور اِيَّاكَ کو مقدم کیا تا کہ انسان مقام اطاعت وعبادت میں بھی پہلے معبود کا تصور کرے اور پھر عبادت کو سامنے لائے، یعنی عبادت کو معرفت کے پیچھے قرار دے اور چونکہ مقام عبادت میں حق عبادت کا ادا کرنا انسان کے اپنے بس سے باہر ہے تو فوراً دوسرا جملہ انسان کی تعلیم کے لئے ارشاد فرمادیا کہ انسان کہے:

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

"اے اللہ ہم اس مرحلہ عبادت میں بھی تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔"

کیونکہ اگر تیری توفیق شامل حال نہ ہو تو ہماری کوتاہیاں ہمیں منزل مقصود تک پہنچنے سے مانع رہیں گی۔ نیز یہ بھی احتمال ہو سکتا تھا کہ مقام عبادت میں مبادا یہ خیال پیدا ہو کہ میں عابد ہوں اور حق واجب شکر ادا کر رہا ہوں۔ پس میں اپنے کمال پر پہنچ

گیا۔ اس تکبر کے شائبہ کو رفع کرنے کے لئے اس طرف متوجہ کیا گیا کہ توفیق عبادت بھی بغیر اسی ذات کی عنایت وامداد کے نہیں ہو سکتی، یعنی انسان کا عبادت گزار ہونا بھی اس کی ایک جدا نعمت ہے اور اسی کا فیض ہے، اس پر بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔

مقام عبادت میں کھڑے ہو کر یہ خیال کرنا چونکہ ضروری ہے کہ آیا جس کو میں عبادت واطاعت سمجھ رہا ہوں یہی عبادت واطاعت ہے بھی سہی؟ کیونکہ اپنی عقل تعیین عبادت میں کوتاہ ہے (جیسا کہ ہم نے کتاب کی جلد اول ضرورتِ نبی کریمؐ کے باب میں اس کو کافی تفصیل سے بیان کیا ہے) پس ضرورت محسوس ہوئی کہ مقام اطاعت ومعصیت کے سمجھانے کے لئے خود خدا نے جن برگزیدہ افراد کو نامزد فرمایا ہے اور ان کو اپنی طرف سے بندوں کی طرف عہدہ سفارت عطا فرما کر رسولؐ نبی اور امام کے لقب سے ملقب فرمایا ہے یہ طریقے ان ہی سے حاصل کیے جائیں۔ اور یہ مرحلہ بھی چونکہ اس کی توفیق وتائید کے بغیر طے ہونا مشکل تھا اس لئے ہماری تعلیم کے لئے ارشاد فرمایا:

اے انسان! راہ ہدایت اور ہادی کی تلاش میں بھی مجھ سے توفیق طلب کر اور پھر راہِ حق پر ثابت قدم رہنے کے لئے بھی مجھ سے توفیق کی دعا مانگ اور کہہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

''اے اللہ! سیدھے رستہ پر گامزن ہونے کی اور اس پر ثابت قدم رہنے کی مجھے توفیق دے۔''

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

''یعنی ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام نازل فرمایا نہ ان لوگوں کا رستہ جو مقام اطاعت میں اپنے من گھڑت طریقوں پر چلنے کی وجہ سے

غضب کے نیچے آ گئے اور گمراہ ہو گئے۔"

یا یوں عرض کر دوں کہ انسان مرکب ہے دو اہم جزوں سے ایک روح اور دوسرے جسم۔ روح جزو اشرف و اعلیٰ ہے اور جسم جزو اخس و ادنیٰ ہے۔ روح راکب ہے اور جسم اس کا مرکب ہے۔ روح محلِ معرفت ہے اور جسم محلِ عمل ہے۔ پس خداوند کریم نے تعلیم معرفت سے ابتداء فرمائی، جس کا اہل روح ہے۔ پس جملہ صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی طرف اس کو متوجہ فرمایا اور اپنی ربوبیت الوہیت کا اعتراف لیا اور اپنے مبداؑ معاد میں مالک کل ہونے کا درس دیا: جب روح نے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پہنچ کر منازل معرفت طے کرلیں تو جسم چونکہ روح کے تابع اور مرکب کی حیثیت سے ہے لہٰذا اس کے اعضا بول اٹھے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور اپنی خطا کے امکان کو محسوس کر کے دعا مانگ لی کہ میرے مالک تو مجھے اس مقام پر ثابت قدم رکھ کہ انعام پانے والوں کے رستہ سے ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں، تا کہ مستحقین غضب اور گمراہوں کی طرح ہمارا حشر نہ ہو۔ اور جمع کی ضمیریں ذکر کی گئیں، جس سے لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ بندوں کے لئے لازم ہے کہ مل جل کر بارگاہ پروردگار میں کھڑے ہو کر یہ آیات اپنی زبانوں سے جاری کریں تا کہ بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت کو پہنچیں، گویا ضمنی طور پر یہ آیات نماز جماعت کی تاکید پر دلالت کر رہی ہیں۔

نیز اس تفصیلی بیان سے سورہ فاتحہ کا علوم قرآنیہ کے لئے جامع ہونا مدلل طور پر معلوم ہو گیا اور باقی سورہ قرآنیہ پر اس کی تقدیم کی زیادہ وضاحت ہو گئی، کیونکہ علوم کل تین ہیں: مبداء کا علم، معاد کا علم اور دار التکلیف میں انسان کے اپنے فرائض کا علم۔ جس کو علم الوسیط کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، کیونکہ یہ مبدا و معاد کے وسط (درمیان) میں ہے اور پورے قرآن مجید میں ان ہر سہ علوم کی ابحاث ہیں۔ اور انہیں کے بیانات

وبراہین اور توضیحات ہیں اور سورہ فاتحہ میں یہ تینوں علم اجمالی طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ پس یہ ام الکتاب بھی ہے اور الاساس بھی اور پورے قرآنی بیانات کے لئے بحیثیت موضوع بھی ہے، لہٰذا تمام قرآنی سورتوں پر مقدم ہے۔ اس بیان کی ایک اور توجیہ مستقل طور پر (آیات فاتحہ کی معنوی توجیہ) کے عنوان میں بیان ہوگی۔

فـائدہ: چونکہ تلاوت کلام اللہ معنوی طور پر حق سبحانہ، سے مکالمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا شروع سے پہلے تمام ان علائق خارجیہ سے جو فیضان انوار قدسیہ سے حرمان یا بعد کا موجب ہوں۔ اپنے دل ودماغ کو پاک وصاف کر لینا ضروری ہے اور وساوسِ شیطانیہ کے جال سے طائرِ خیال کو آزاد کر کے تلاوت کرے، تا کہ فیوضِ قدسیہ الٰہیہ سے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور ہو سکے۔ لہٰذا تلاوت سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم پڑھے: ''یعنی اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس شیطان سرکش سے جو راندہ درگاہ خدا اور لعنت کا نشانہ ہے۔'' خود ذاتِ احدیت کا ارشاد ہے:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

''یعنی جب قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

اور اسی کو استعاذہ کہتے ہیں۔ سورہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے اور اسی وجہ سے سورہ فاتحہ بلکہ قرآن کے کسی سورہ کا یہ جز نہیں لیکن سورہ فاتحہ سے پہلے اس کو لکھا جاتا ہے، تا کہ پڑھنے والا جب بھی ابتداء سے تلاوت کرے تو پہلے استعاذہ کر لیا کرے اور پھر قرآن پڑھے، اسی طرح نماز میں بھی سورہ فاتحہ سے پہلے آہستہ سے استعاذہ پڑھنا مستحب ہے۔

فـائدہ: سورہ فاتحہ میں جب انسان اولاً منازلِ معرفت کی سیر کرتا ہے۔ اور پھر مقام اطاعت میں اپنے آپ کو پاکر اپنے مالکِ حقیقی سے مکالمہ کا شرف حاصل کرتا ہے

اور اس سے راہ حق پر ثبات قدمی کی دعا مانگتا ہے تو اس وقت گویا تمام علائق وموانع خارجیہ سے منقطع ہو کر اپنی ذات کو اللہ کی بارگاہِ قدس میں پا کر قربتِ خداوندی کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے غضب کردہ اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے میرا شمار نہیں۔ لہٰذا اختتام سورہ فاتحہ میں اگر نماز باجماعت ہو تو پیش نماز جب کہے وَلَا الضَّالِّيْنَ آہستہ سے مقتدی کہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ گویا معنوی طور پر پیش نماز کی قرأت اپنے اور مقتدیوں کے راہ حق پر گامزن ہونے اور نماز کے مقبول ہونے کی بشارت ہوتی ہے۔ لہٰذا مقتدیوں کے لئے بطور شکر آہستہ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پڑھنا مستحب ہے۔ ہمارے نزدیک آمین کہنا اس مقام پر بے جا ہے اور اگر نماز میں عمداً کہے گا تو نماز باطل ہوگی۔

فضائل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر برہان میں جناب رسالتِ مآبؐ سے مروی ہے کہ جو شخص بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے خداوند کریم اس کے لئے جنت میں ستر ہزار محل یاقوت سرخ کے بناتا ہے کہ ہر محل میں ہزار گھر سفید موتی کے اور ہر گھر میں ستر ہزار تخت زبرجد سبز کے اور ہر تخت پر ستر ہزار فرش سندس واستبرق کے اور ہر ہر فرش پر ایک ایک حور العین اور ہر ہر حور کے ستر ہزار گیسو جو موتیوں اور یاقوتوں سے آراستہ ہوں گے اور ان کے دائیں رخسار ہ محمد رسول اللہ بائیں رخسارہ پر علی ولی اللہ اس کی پیشانی پر حسن علیہ السلام اور ٹھوڑی پر حسین علیہ السلام اور دونوں ہونٹوں پر لکھا ہوگا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ راوی نے دریافت کیا کہ حضور! یہ انعام کس شخص کو ملے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ: جو حرمت وتعظیم سے پڑھے گا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ روایت کی طرز بتلاتی ہے کہ یہ انعام آلِ محمدؐ کے موالیان اور محبان ہی کے لئے مختص ہے۔

نیز حدیث نبوی میں ہے کہ مومن جب پل صراط سے عبور کرے گا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو زبان پر جاری کرے گا تو جہنم کے شعلے خاموش ہو جائیں گے اور جہنم کہے گی: "گزر جا اے مومن کیونکہ تیرا نور میرے شعلوں کو بجھا رہا ہے۔"

حدیث نبوی میں ہے کہ جب معلم کسی بچے کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تعلیم دیتا ہے تو خداوند کریم اس بچے اور اس کے والدین اور معلم کے لئے آتشِ جہنم سے آزادی فرض کر دیتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب ہمارا شیعہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ترک کرتا ہے تو خدا اس پر کوئی آزمائش نازل کر دیتا ہے اور اس کو اپنے شکر کی طرف متوجہ فرماتا ہے، پھر اس کی وہ کوتاہی معاف کر دیتا ہے۔

تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ جناب رسالت مآب فرماتے ہیں کہ شب معراج میں نے پانی، دودھ، شہد اور شراب کی چار نہریں دیکھیں۔ جبریل سے دریافت کیا تو جبریل نے عرض کی: مجھے حکم ہے کہ آپ کو ان نہروں کے منبع کی سیر کراؤں۔ پس ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک قبہ ہے جس کا دروازہ مقفل ہے۔ جبریل نے کہا: آپ انگلی کا اشارہ اس قفل کی طرف کریں، تاکہ قفل کھل جائے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے انگلی کا اشارہ کیا، وہ قفل کھل کر گر گیا۔ میں اس قبہ میں داخل ہوا، اور اس قبہ کے اندر ایک ستون دیکھا جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا: پانی کی نہر "بسم اللہ" کے حلقہ سے جاری ہے اور دودھ کی نہر لفظ اللہ کے "ہاء" کے حلقہ سے جاری ہے اور شہد کی نہر "الرحمٰن" کے میم کے حصہ سے اور شراب کی نہر "الرحیم" کے میم کے حلقہ سے جاری ہے۔ اور بسم اللہ کی باء پر لکھا ہوا دیکھا کہ جو کوئی دنیا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے گا یہ قبہ اور جاری نہریں اس کو عطا کروں گا۔

بعض روایات میں ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جہر سے پڑھنا علامات مومن میں سے ہے۔ تمام جہری نمازوں میں اسے جہر سے پڑھنا واجب ہے اور بغیر اس کے نماز باطل ہو جاتی ہے اور اخفاتی نماز میں اس کا جہر سے پڑھنا مستحب ہے۔ روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کام سے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی جائے اس میں شیطان شریک ہوتا ہے۔ اپنی عورت سے ہمبستر ہونے سے پہلے بسم اللہ پڑھے۔ کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھے، بلکہ دستر خوان پر جتنے کھانے حاضر ہوں ہر ایک کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھے۔ پانی پینے سے قبل بسم اللہ پڑھے۔ غرضیکہ ہر امرِ خیر کو بسم اللہ سے شروع کرے۔ حدیثِ نبویؐ میں ہے کہ جو کوئی اہم کام بغیر بسم اللہ کے شروع کیا جائے وہ ناقص و ناتمام ہوتا ہے۔ جب کوئی ذبیحہ اللہ تعالیٰ کے نام لئے بغیر حلال نہیں رہ سکتا، حالانکہ ان کی اصل حلال ہے تو انسان کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے کہ تمام حلال رزق گو حلال ہیں، لیکن شکرِ منعم کے طور پر عظمتِ خدا کو یاد کرنا اور اس کے ذکر کے بعد حلال خداوندی میں تصرف کرنا اُمورِ ضروریہ میں سے ہے۔ گویا اس حکم کو شرعی وجوب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تاہم مستحب موکد ضرور ہے، کیونکہ معصوم نے جہر بسم اللہ کو علائم شیعہ میں سے قرار دیا ہے۔

بسم اللہ کا جزو سورہ ہونا

باتفاق مذہب امامیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سوائے سورہ برأت کے قرآن کی تمام سورتوں کا جزو ہے اور کتب شیعہ و سنی میں اس آیت کریمہ کے فضائل حدِ احصاء سے زیادہ ہیں۔ بایں ہمہ مقام عمل میں سوائے شیعہ کے باقی مذاہب والوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ حتیٰ کہ نماز جیسی اہم عبادت میں بھی دوسرا سورہ شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اعتراف کرتے

ہیں کہ قرآن مجید کے اندر جو کچھ مرقوم ہے اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ اور قرآن مجید میں کوئی فقرہ ایسا نہیں جو غیرِ قرآن ہو۔ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں اور ہر سورہ کے پہلے بسم اللہ شریف کا ہونا تسلیم کرتے ہیں، لیکن جب بارگاہِ خدا میں عبادت کے عنوان سے کھڑے ہوتے ہیں تو سوائے فاتحہ کے اور کسی سورہ کو بسم اللہ سے شروع نہیں کرتے اور سورہ فاتحہ میں بھی جزوِ سورہ بنا کر نہیں بلکہ تبرکاً پڑھتے ہیں۔ اب مجھ سے یہ بات بالا ہے کہ کتابوں میں بسم اللہ کے فضائل کی اس قدر بھرمار کہ دفتر پُر ہو جائیں اور مقامِ عمل میں اس قدر پہلوتہی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا تھا: تمام علوم کا جامع قرآن ہے اور علوم قرآنیہ کی جامع سورہ فاتحہ ہے اور سورہ فاتحہ کے علوم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہیں اور بسم اللہ کے جمیع علمی خزائن باء بسم اللہ میں ہیں اور باء بسم اللہ کے علمی ذخائر نقطہ باء میں موجود ہیں اور وہ نقطہ میں ہوں۔"

پس یہ سنتے ہی بعض علی علیہ السلام کے متوالوں نے فضائل بسم اللہ کے تمام فرامین نبویہ پر قلم نسخ پھیرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی قرآنیت کا سرے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ آیتِ مجیدہ جن سورتوں کی ابتداء میں واقع ہے سب تبرک وتیمن کے طور پر ہے اور کسی سورت کی جزو نہیں، سوائے سورہ نمل کے، جہاں وسط سورہ میں واقع ہے کیونکہ وہ جزوِ سورہ ہے۔

لیکن اگر حقیقت میں آنکھوں سے تعصب کی عینک اتار کر عقلی ونقلی ادلہ پر نظر ڈالی جائے تو عقلِ سلیم کے لئے یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ بسم اللہ کو جزوِ سورت نہ ماننا اور اس کے محض تبرکاً ہونے کا قائل ہونا وقارِ عظمت بسم اللہ کے خلاف مفت کی ہنگامہ آرائی اور مصداقِ نقطہ باء بسم اللہ کی علمی جلالت ووجاہت کے خلاف فضول وبے معنی

کی صدائے صحرائی ہے۔ کیونکہ سورج کے مقابلہ میں گرد اُڑانے سے سورج کی روشنی میں کمی نہیں ہو جایا کرتی، بلکہ دھول اُڑانے والوں کی اپنی آنکھیں گرد آلود ہو جاتی ہیں اور ان کو داد دینے والوں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے اور ان کے سامنے دُنیا تاریک ہو جاتی ہے حالانکہ حقیقت میں تاریک نہیں ہوتی۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۲ ص ۷ سے ۲۰)

تکمیل مطلب کے لئے اس مقام پر دو اعتراضوں کا جواب دینا ضروری ہے۔

اعتراض: اگر بسم اللہ کو جزِ قرآن تسلیم کیا جائے تو بسم اللہ قرآن ہو جائے گی اور حکم ہے کہ قرآن کی تلاوت کے وقت سے بسم اللہ پڑھی جائے اور بسم اللہ سے پہلے ایک اور بسم اللہ کا پڑھنا لازم ہوگا اور یہ سلسلہ کبھی نہ رکے گا۔

جواب: اس طرح تو حمد کے متعلق بھی ایک اور مشہور حدیث ہے کہ جو کام اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے اور ناقص ہے۔ لہذا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کو جزئیت سے خارج ہونا چاہئے پس جو جواب اس اشکال کا ہوگا، اسی کا بھی وہی ہے کیونکہ آیت الحمد للہ کو اگر قرآن مانیں تو اس سے پہلے ایک اور الحمد پڑھنی چاہیے اور یہ سلسلہ پھر آگے چلا جائے گا۔

جواب: بسم اللہ الرحمن الرحیم جزو سورہ ہے اور یہ کہ ہر امر خیر کو بسم اللہ سے شروع کرنا ضروری ہے۔ خود بسم اللہ کو شامل نہیں جس طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ ابوالبشر ہیں یعنی تمام انسانوں کے باپ ہیں حالانکہ خود بھی بشر اور انسان ہیں۔ اور ابوالبشر کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ معاذ اللہ اپنے بھی باپ ہیں، بلکہ وہ خود اس سے مستثنےٰ ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے بدنِ انسانی میں سر تمام اعضاء سے بلند ہے، حالانکہ خود بھی عضو ہے۔ پس مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات کو چھوڑ کر باقیوں سے بلند ہے۔ اسی طرح حضرت محمدؐ تمام نبیوں کے سردار ہیں، حالانکہ خود بھی نبی ہیں۔ یعنی اپنی ذات کے

علاوہ تمام نبیوں کے سردار ہیں وَعَلٰی ھٰذَا الْقِیَاس ۔ پس اس مقام پر بھی یہی کہا جائے گا کہ بسم اللہ پڑھنے کا حکم اس کے ماسوا باقی قرآن کے لئے ہے۔

اعتراض: اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورۂ فاتحہ کی جز قرار دیا جائے تو آیت الحمد للہ رب العالمین کے بعد الرحمٰن الرحیم کا دوبارہ تکرار خالی از فائدہ ہوگا۔

جواب: آیت بسم اللہ میں الرحمٰن الرحیم اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو ذات دنیا وعقبیٰ کی نعمات کے عطا کرنے والی ہے۔ انسان کے لئے سزاوار ہے کہ اس کی نعمات میں سے ہر نعمت کے تصرف میں لانے سے پہلے اس کا ذکر زبان پر جاری کرے اور حمد کے بعد پھر ان دونوں صفتوں کا لانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہر نعمتِ الٰہیہ کے تصرف کے بعد اس کے منعم حقیقی ہونے کا لحاظ رکھتے ہوئے کلمہ حمد زبان پر جاری کرے یعنی اس کی رحمانیت اور رحیمیت جس طرح ہر کام کی ابتداء میں اس کے ذکر کو واجب کرتی ہیں، اسی طرح اس کی رحمانیت ورحیمیت ہر کارِ خیر کے انجام پر اس کے شکر کو ضروری قرار دیتی ہے۔ گویا آیت بسم اللہ میں یہ دونوں صفتیں اس کے وجوب ذکر کی علت ہیں۔ اور آیہ حمد کے بعد یہ دونوں صفتیں اس کے وُجوبِ شکر کی مقتضی ہیں، پس ان کا تکرار بے فائدہ نہیں بلکہ ان کے بغیر دعوائے حمد بلا دلیل ہو کر افادیت کی منزل سے ہٹ جاتا ہے۔

❷ وہی جواب ہے جس کو ترتیب آیات فاتحہ کے عنوان میں بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی آیت میں پہلے پہل معرفتِ توحید کا درس دینا مطلوب تھا اور چونکہ اللہ کی ذات کا تصورِ کنہ حقیقت سے محال ہے پس یہ صفتیں لائی گئیں، تاکہ ان صفات سے اس کی معرفت ہو جائے اور انسان اس کی نعمات کا شکر ادا کرنے میں آگے بڑھے اور اس کے بعد الرحمٰن الرحیم کے ذکر سے ایک طرف تو شکر بجالانے والے کے لئے اُخروی

بشارت ہے، کیونکہ رحیم کا معنی کیا گیا ہے۔ اُخروی نعمات کے عطا کرنے والا، اور دوسری طرف ادائیگی حمد میں کوتاہی ہو جانے کے بعد رحمانیت ورحیمیت انسان کو مایوس وناامید ہونے سے بچاتی ہیں اور توبہ کی طرف مائل کرتی ہیں پس پہلی آیت میں یہ دونوں صفتیں موجب معرفت ہیں اور حمد کے بعد باعث شکر، داعی توبہ اور مژدہ جنت بھی ہیں۔

3 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ میں چونکہ عالمین کی ربوبیت ذات اللہ کے لئے ثابت ہے اور ربوبیت کو صفتِ قرار دیا گیا تھا۔ اور نیز صفات چونکہ اس کی عین ذات ہیں لہٰذا اس صفتِ ربوبیت کے تصور سے خیال پیدا ہوتا ممکن تھا کہ یہ صفت بھی عین ذات ہوگی، پس اللہ فاعلِ موجب ہوگا۔ یعنی یہ صفت اس سے جدا ہو سکتی ہی نہیں پس وہ مجبور ہے اس امر پر کہ فرائضِ ربوبیت انجام دے، کیونکہ ربوبیت اس کی عین ذات ہے۔ اگر ربوبیت نہ رہے گی تو وہ نہ ہوگا۔ جس طرح سورج کی ذات سے روشنی جدا نہیں ہے اور وہ مجبور ہے کہ روشنی پھیلائے۔ اگر روشنی اس سے جدا ہو جائے تو سورج سورج نہ رہے گا۔ اور یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ فاعلِ موجب یعنی جو اپنے فعل میں مجبور ہو حمد کا سزاوار نہیں ہوتا، کیونکہ حمد کا سزاوار تو وہ ہوتا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی احسان کرے۔ پس اس احتمال وخدشہ کو دور کرنے کے لئے رب العالمین کی لفظ کے بعد فوراً الرحمٰن الرحیم کا اضافہ فرمادیا کہ صفتِ ربوبیت میں میں مجبور نہیں ہوں بلکہ یہ بھی میرے احسانات میں سے ہے اور میں اس کا فاعلِ مختار ہوں۔ پس صفتِ ربوبیت اس کا اختیاری فعل ثابت ہوا۔ اور محسن کے اختیاری وارادی فعل پر اس کی حمد ضروری ہوا کرتی ہے۔ اگر الرحمٰن الرحیم کا اضافہ نہ ہوتو اس شبہ کا کوئی اور جواب نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ الرحمٰن الرحیم کا دوبارہ آیۂ حمد کے بعد ذکر ہونا افادۂ مطلب کے لئے ضروری

ہے۔ یہ وجوہات میں نے نہ کسی کتاب سے اخذ کی ہیں اور نہ اس تفسیر کے لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں تھیں، بلکہ جب اس مقام پر پہنچا تو ذاتِ اَحدیت نے دماغ میں القاء کر دیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِى اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

نقطہ ءبائے بسم اللہ

علامہ نہاوندی نے خزینۃ الجواہر (۵۷۴) میں سید نعمت اللہ جزائری کی کتاب مقامات النجات سے نقل فرمایا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

عِلْمُ مَاكَانَ وَمَا يَكُوْنُ كُلُّهٗ فِى الْقُرْآنِ وَعِلْمُ الْقُرْآنِ كُلِّهٖ فِى الْفَاتِحَةِ وَعِلْمُ الْفَاتِحَةِ فِى بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَعِلْمُ الْبَسْمَلَةِ كُلِّهٖ فِى بَائِهَا وَاَنَا النُّقْطَةُ تَحْتَ الْبَاءِ

مَاكَانَ وَمَا يَكُوْنُ کا تمام علم قرآنِ مجید میں ہے اور قرآنِ مجید کا تمام علم سورہ فاتحہ میں ہے۔ اور سورہ فاتحہ کا تمام علم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے۔ اور بسم اللہ کا تمام علم اس کی باء میں ہے اور میں باء کے نیچے والا نقطہ ہوں۔"

تقدیم فاتحہ کے عنوان میں یہ روایت بیان کی جا چکی ہے لیکن کَانَ وَمَا يَكُوْنُ کی بجائے اس میں کتبِ سماویہ کے الفاظ ہیں اور آخری لفظ یہ ہیں کہ باء بسم اللہ میں جو کچھ ہے وہ نقطہ باء میں موجود ہے اور میں وہی نقطہ ہوں۔

اعتراض: کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں قرآنِ مجید پر نقطے لگائے نہیں گئے تھے۔ جب نقطے نہ تھے تو کیسے درست ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے کہا ہوگا کہ میں باء بسم اللہ کے نیچے والا نقطہ ہوں پس معلوم ہوا کہ یہ حدیث محلِ اعتبار سے ساقط ہے۔

جواب: یہ درست ہے کہ نقطے بعد میں لگائے گئے ہیں لیکن نقطے کا بنانا اور بات ہے اور لگانا اور شے ہے۔ ایسا نہیں کہ نقطے بعد میں بنائے گئے بلکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ نقطے بعد میں لگائے گئے، کیونکہ اگر نقطے پہلے سے بنے ہوئے نہ ہوتے تو ب، ت، ث، ج ح خ وغیرہ متشابہ حروف کی تمیز کیسے ہو سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ مسلسل تحریر میں ماہرین لوگ مطلب کو بغیر نقاط کے سمجھ سکتے ہیں، اور پڑھ سکتے ہیں۔ اور آج کل بھی شکستہ تحریروں میں عموماً نقاط کا اعتبار نہیں کیا جاتا اور بایں ہمہ قرائن کے ملانے سے مکتوب الیہم کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حروف تہجی میں سے بھی نقطہ اُڑا دیے جائیں، ورنہ ابتدائی تعلیم والوں کے لئے تعلیم کا راستہ ہی بند ہو جائے گا۔ پس اس زمانہ میں بھی نقطے موجود تھے اور تعلیم و تعلم میں حروف تہجی کی باہمی شناخت کا دارومدار نقطوں پر تھا لیکن عربی ان کی مادری زبان تھی۔ لہٰذا کاتب حضرات لکھتے وقت نقطوں کو نظر انداز کر دیتے تھے اور ان کے بغیر بلا دقت پڑھ سمجھ لیا کرتے تھے۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اسلام جب اطراف عالم میں پھیلنا شروع ہوا اور غیر عربوں نے قرآنِ مجید کو حاصل کرنا چاہا تو ان کی چونکہ مادری زبان نہ تھی لہٰذا بغیر نقاط کے ان کے لئے پڑھنا مشکل تھا۔ پس نقاط لگا دیئے گئے اور یہ مشکل غیر عربوں کی ختم ہو گئی۔

2 جس طرح نقطے بعد میں لگوائے تھے اسی طرح اعراب زبر، زیر، پیش، جزم) وغیرہ بھی بعد میں لگوائی گئیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے عربی زبان اور قرآنِ مجید میں اعراب نہ تھے اور بعد میں ہوئے؟ معلوم ہوا کہ اعراب و نقاط بعد میں بنائے نہیں گئے صرف لگائے گئے ہیں۔ پہلے اسلام چونکہ صرف عرب میں تھا پس ماہرین لسان کے لئے اپنی زبان کے لکھنے یا پڑھنے میں اعراب لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ جب اسلام عجم

میں پھیلا تو دونوں چیزوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسے پورا کر دیا گیا۔

3 اگر نقطے اور اعراب وغیرہ پہلے سے نہ ہوتے تو بعد میں ان کا اضافہ تحریف قرآن کا موجب ہوتا اور چونکہ بعد میں ان کا لگنا تحریف کا موجب نہیں ہوا معلوم ہوا کہ یہ پہلے سے داخل قرآن تھے۔ پس حضرت امیر علیہ السلام کے فرمان پر اس قسم کے اعتراضات چشم کوری اور بد باطنی ہی ہے۔

سوال: فاتحہ میں تمام علوم کا ہونا تو مسلم ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے لیکن تمام باء میں ہونا یا باء کے نقطہ میں ہونا سمجھ میں نہیں آ سکتا، بلکہ ظاہراً صرف مفرد میں یا نقطہ میں علوم قرآنیہ کا سمانا محالات میں سے ہے۔

جواب: اس کی توجیہہ علامہ نہاوندی نے اس طرح فرمائی ہے کہ حروف تہجی میں الف تمام حروف سے پہلے بھی ہے اور مجرد بھی ہے سیدھا بھی ہے اور بلند بھی ہے۔ پس عالم حروف میں اس کی حیثیت ایسی ہے جس طرح عالم موجودات میں ذات رب العزت کا وجود کہ وہ سب سے پہلے بھی ہے، مجرد بھی ہے، بلند و متعالی بھی ہے اور الف کے بعد عالم حروف میں باء حروف اول ہے جس طرح وجودِ ذیجود جناب رسالت مآبؐ موجودات میں موجودِ اول ہے۔ ہم شکل حروف کی باہمی امتیاز نقاط سے کرتے ہیں۔ لہٰذا باء کو عالم حروف میں اپنے ہم شکل حروف سے تحتانی نقطہ کے ذریعہ سے تمیز حاصل ہے۔ اسی طرح عالم موجودات میں مخلوقِ اول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ ذیجود کو وجودِ علی علیہ السلام کے ساتھ اختصاص و تمیز عطا کی گئی۔ انتہیٰ عالم حروف یا وجود کتابی میں باء اور نقطہ ایک ہی وجود رکھتے ہیں۔ اسی طرح عالم موجودات یا وجود خلقی میں نور محمدؐ اور نور علیؑ ایک ہی نور ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ

''میں اور علی علیہ السلام ایک ہی نور سے ہیں۔''

کتاب ہذا کے حصہ اول (۲۳۵) پر حضرت امیر علیہ السلام کا فرمان ملاحظہ ہو (جناب رسالت مآبؐ کی خلقت نوری کی تفصیل روایاتِ کتب مفصلہ میں مذکورہ ہے۔اس مقام پر ان کا ذکر کرنا موضوع سے خارج ہے) نیز عالم حروف میں باقی تمام حروف سے باء کو الف سے انتہائی قرب حاصل ہے۔ اسی طرح عالم موجودات میں حضرت رسالت مآبؐ کو اللہ سے جو قرب حاصل ہے اور کسی کو حاصل نہیں۔ باء چونکہ الف سے وضعی طور پر قرب رکھتا ہے یعنی حروف بنانے والے نے باء کو الف کے قریب رکھ دیا ہے لہٰذا باء میں قربِ الف کی وجہ سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر آج بھی دنیا والے حروف کی وضعی ترتیب کو بدل کر باء کے قرب کو الف سے ہٹا دیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں، نہ پہلے سے اس میں کوئی خصوصیت تھی اور نہ بعد قربِ الف حاصل ہونے کے اس میں کوئی خاص استحقاق کی وجہ پیدا ہوئی ہے۔ لیکن وجود ذی جود رسالت مآبؐ کی پہلی کی خصوصیت ارادہ کاملہ ذاتِ احدیت ہے، جو خالی از مصلحت نہیں اور اس کا قربِ حقیقی اسی مخلوق کے لئے سزاوار ہے۔ جس کو اس نے اپنے اختیار و ارادہ کاملہ سے تمام فضائل و کمالات ممکنہ سے سرفراز فرمایا ہو، اور ان کمالات میں باقی کسی کو اس کا شریک نہ کیا ہو پس اس نے اس مخلوق اول کو تمام امکانی کمالات میں امتیاز کامل عطا فرمایا اور افضل موجودات قرار دیا، اور وہ تمام صفاتِ حسنہ جو حدودِ امکان کے اندر کسی کو عطا ہو سکتی ہیں۔ آنحضرتؐ کو ان سے مشرف فرما کر ارشاد فرمایا:

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

اور علم چونکہ تمام کمالات میں سے اشرف کمال ہے۔ لہٰذا حضورؐ کو علم مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ میں سے اس قدر عطا فرمایا کہ نطاق امکان میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہ

تھی۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اس فرمان میں کہ جمیع وَمَا كَانَ يَكُوْنُ یا جمیع علوم کتب سماویہ باء بسم اللہ میں ہیں اس باء سے مراد تاویلی طور پر وجود حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے نہ کہ ظاہری حرف باء، جو حروف تہجی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام کا آخری فقرہ کہ نقطہ باء میں ہوں، صاف طور پر اس امر کا کاشف ہے کہ باء سے مراد آنحضورؐ ہی ہیں۔

اب مطلب صاف ہوا کہ تمام علوم قرآنیہ بائے بسم اللہ میں ہیں اور بائے بسم اللہ کے تمام علوم نقطہ باء میں ہیں، جو باء کے نیچے ہے۔ یعنی تمام علوم قرآنیہ کا خزانہ حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت رسالت مآبؐ کے تمام علوم کا خزانہ وجود علی علیہ السلام ہے، جو باقی کائنات سے افضل اور حضرت رسالت مآبؐ کے ماتحت ہے اور حضرت علی علیہ السلام کا علوم رسالت کا وارث ہونا کتب آثار میں تواتر سے ثابت ہے۔ اسی کتاب کی جلد اول میں بعض احادیث نقل کی گئی ہیں جن سے منصف طبائع اطمینان حاصل کر سکتے ہیں اور علوم قرآنیہ میں حضرت علی علیہ السلام کی کمال وسعت کے مظاہرے کتب آثار میں اتنی کثرت سے منقول ہیں کہ ان کے یکجا کرنے سے ضخیم کتابیں پُر ہو سکتی ہیں جبھی تو ارشاد فرماتے تھے:

لَوْ ثُنِيَتْ لِيَ الْوِسَادَةَ لَذَكَرْتُ فِيْ تَفْسِيْرِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حِمْلَ بَعِيْرٍ اَلدمعَةُ السَّاكِبَةُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اِنَّهٗ شَرَحَ لَهٗ فِيْ لَيْلَةٍ وَّاحِدَةٍ مِنْ حِيْنَ اَقْبَلَ ظَلَامُهَا حَتّٰى صَبَاحِهَا فِي شَرْحِ الْبَاءِ مِنْ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَمْ يَتَعَدَّ اِلَى السِّيْنِ وَقَالَ لَوْشِئْتُ اَوْقَرْتُ اَرْبَعِيْنَ بَعِيْرًا مِنْ شَرْحِ بِسْمِ اللّٰهِ۔

”اگر میں تکیہ لگا کر بیٹھ جاؤں تو صرف بسم اللہ کی تفسیر اس قدر بیان

کروں کہ اونٹ بار ہو جائے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے میرے سامنے ایک رات شروع تاریکی سے سفیدی، صبح تک باء بسم اللہ کی شرح فرمائی اور سین تک نہ پہنچے اور فرمانے لگے کہ اگر چاہوں تو بسم اللہ کی شرح سے چالیس اونٹ بار کردوں۔"

(الدمعة الساكبه)

تعظیم ضرائح مقدسہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے منافی نہیں

اعتراض: عبادات کا معنی ہے انتہائی خضوع اور اِیَّاکَ کا مقدم ہونا دلالت کرتا ہے کہ خضوع صرف اللہ کی ذات کے لئے ہی ہے، لہٰذا کسی غیر اللہ کے سامنے انتہائی خضوع موجب شرک ہے۔ پس شیعوں کا آئمہ طاہرین علیہم السلام کی ضرائح مقدسہ کی زیارت اور ان کی تعظیم اور اُن کو بوسہ دینا وغیرہ یہ سب عبادت غیر اللہ ہے اور شرک ہے اور اسی طرح ضرائح مقدسہ کی شبیہیں بنا کر ان کی تعظیم کرنا بھی شرک ہے اور ان افعال کو بت پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جواب: عبادت کا مفہوم بے شک غایتِ خضوع ہے، لیکن غایتِ خضوع کا مطلب یہ نہیں کہ جس کو عبد خضوع سمجھے وہ خضوع ہے اور جس کو عبد خضوع نہ سمجھے وہ خضوع نہیں ہے۔ آقا اپنے غلام سے کہے کہ میرے آگے چل اور غلام کہے نہیں حضور! اس میں گستاخی ہے، میں تو آپ کے پیچھے ہی چلوں گا۔ اس کو خضوع نہیں کہتے، بلکہ خضوع یہ ہے کہ آپنے آقا و مولا کو بلا پس و پیش قبول کرے۔ خواہ اس کی اپنی دانست میں اس حکم پر چلنا خضوع ہو یا خلاف خضوع، کیونکہ آقا اپنے حکم کی مصلحت کو جس طرح خود سمجھتا ہے غلام نہیں سمجھ سکتا اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر حکم کی مصلحت کو اپنے غلام پر واضح کردے۔

حجرِ اسود، کعبۃ اللہ، صفا و مروہ وغیرہ ان سب چیزوں کی تعظیم کا چونکہ اس نے امر فرمایا اور شعائر اللہ کی تعظیم کو تقوئی سے تعبیر فرمایا: اب عبد جس نے فرائضِ عبدیت ادا کرنے ہیں اس کو یہ دریافت کرنے کا حق نہیں کہ تو نے یہ حکم کیوں دیا۔ ہم کیوں ان جمادات کی تعظیم کریں، جب کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں؟ پس جب معلوم ہے کہ خدا ان کی تعظیم کو محبوب رکھتا ہے تو ان کی تعظیم کرنا ہی غایتِ خضوع ہے، اگرچہ وہ غیر اللہ ہیں اور در حقیقت یہ تعظیم ان چیزوں کی نہیں، بلکہ اللہ کے حکم کی تعظیم ہے۔ اسی طرح حجرِ اسود کو بوسہ دینا گو مصلحت معلوم نہ ہو، چونکہ ذات خدا کی فرمانبرداری ہے لہٰذا واجب ہے اور عبادت ہے، اگرچہ ظاہراً غیر اللہ کی تعظیم ہے۔ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنا ملائکہ کی شانِ عبودیت کے منافی نہیں تھا، بلکہ شیطان کا سجدہ نہ کرنا منافی خضوع و عبودیت تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم کی اطاعت کا نام ہے خضوع اور اس کی اطاعت سے گریز کرنا ہے خلافِ خضوع۔

مناسکِ حج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی سنت کو زیادہ تر دہرایا گیا ہے اور وہ مقامات جو ان کی طرف منسوب ہیں ان کو مشاعر یا شعائر اللہ سے موسوم کیا گیا ہے اور ان کی حرمت وعزت واجب کر دی گئی ہے، تاکہ اللہ کے مخصوص بندوں کی راہِ حق میں قربانیاں اور خوشنودی خالق کے لئے ان کی جانفشانیاں یادگار رہ کر آنے والی نسلوں کو درسِ عبرت دیں اور قبولِ موعظہ میں ممد ثابت ہوں اور وہ یہ مناظر و منازل اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اللہ کی اطاعت کرنے والے رضائے خدا کے لئے کونسی کٹھن منزلوں اور پُر خطر وادیوں اور ہوش ربا مشقتوں سے دوچار ہوئے لیکن پائے اثبات میں تزلزل نہ آیا اور مقامِ عبودیت میں لغزش نہ آئی۔

اور حضرت رسالت مآبؐ جو تمام گزشتہ انبیاء کے سید و سردار تھے اُن کے ساتھ جن مقامات کو خصوصی نسبت و تعلق حاصل ہے جن کی یاد یقیناً جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جن کی زیارت آنحضورؐ کے ساتھ رشتۂ محبت کے استوار کرنے میں انتہائی ممد و معاون ہے۔ خصوصاً وہ ضریح پاک جس میں جسم اطہر صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیر خاک ہے۔ وہ خطیرہ قدس جو قدسین کے آقا کے جسدِ نوری کا گہوارہ ہے۔ وہ مقام مشرف جس کو مالکِ شرافت کے ابدی بیت الشرف ہونے کا برقرار رکھنا اور اس کے عہد کا تازہ کرنا کیوں ناجائز ہے اور اس کو بوسہ دینا کیوں شرک ہے جب کہ حجر اسود کو بوسہ دینا عین عبادت ہے؟

اعتراض: حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام کی یادگاروں کی تعظیم کا حکم چونکہ ثابت ہے اور جناب رسالت مآبؐ کے روضۂ قدس کی تعظیم اور اس کو بوسہ دینا کسی حکم شرع سے ثابت نہیں لہٰذا وہ عبادت ہے اور یہ بدعت ہے۔

جواب: جب ایک عالم اپنے شاگرد کو کہے کہ فلاں شخص کی عزت کیا کرو، کیونکہ وہ ایک عالم دین کی اولاد اور اس کی نشانی ہیں۔ اب یہ عالم اگر مر جائے تو کیا شاگرد یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے استاد نے اپنی اولاد کی عزت کرنے کا حکم تو نہیں دیا تھا، لہٰذا میرے اوپر صرف اسی عالم کی اولاد کی تعظیم کرنا واجب ہے جس کے متعلق استاد نے حکم دیا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ ایسے شاگرد کو احسان فراموش اور بدترین انسان سمجھا جائے گا، کیونکہ عقل بتلاتی ہے کہ جب استاد نے ایک معیار بتلا دیا تھا تو افراد کی تطبیق اپنا فریضہ تھا اور استاد کی اولاد اس معیار کی رو سے بہ نسبت بتلائے ہوئے عالم کی اولاد کے زیادہ قابلِ تعظیم اور لائقِ عزت ہے۔

بعض روایات کا مفہوم ہے کہ جس نے کسی کو ایک حرف پڑھا دیا گویا کہ اس نے

اس کو اپنا غلام بنا دیا۔ اس سے شاگرد یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ جس نے اس کو زیادہ تعلیم دی ہو وہ اس کلیہ سے خارج ہے، بلکہ زیادہ پڑھانے والے کی اسی قاعدہ کی رو سے بدرجہ اولیٰ زیادہ تعظیم کرنا واجب ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

پس حضرت ابراہیمؑ کی یاد میں ان کی بعض سنتوں پر عمل کرنے کا ہم کو حکم ہے اور وہ تا قیامت ہمارے لئے دستور العمل ہیں تو فخرِ ابراہیم علیہ السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی پوری زندگی کا ہر قول وفعل ہمارے لئے مشعل راہ اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ ان کے نشانات اور مقدس مقامات ہمارے لئے کیوں نہ محلِ عزت واحترام ہوں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی طرف منسوب چیزیں جن کی راہِ خدا میں قربانی ایک محدود حیثیت کی حامل تھی شعائر اللہ ہوں اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترتِ طاہرین کے عتباتِ عالیات جن کی راہ حق میں قربانی عالم میں نظیر نہیں رکھتی، کیوں نہ شعائر اللہ ہوں؟ اور ان کی یاد کو تازہ کرنا کیوں نہ اعظم قربات سے قرار دیا جائے، جب کہ ان کی سیرت وکردار پر عمل کرنا جسد انسانیت کی روح وجان اور عالمی تشتت وافتراق کے لئے دعوتِ اتحاد اور پیغامِ امان واطمینان ہے۔ پس ان ضرائح مقدسہ کی زیارت اور ان کے آستان قدس پر جبہ رسائی اور ان کی حرمت وعظمت کی پاسبانی تاکہ ان کے واقعات کی یاد کو تازہ کر کے اپنے جسدِ ظلمانی کو روح ایمانی سے زندہ کیا جا سکے، یا حضیض حیوانیت سے اُوجِ انسانیت کی طرف قدم بڑھایا جا سکے یقیناً مطلوب بارگاہ رب العزت ہے اور قرب خدا تک رسائی کا بہترین زینہ ہے۔

اگر بوسہ دینا شرک فی العباد ہے تو گزارش ہے کہ کیا احترام کی غرض سے قرآن مجید کے حروف اور وہ کاغذ جس پر قرآن لکھا ہے ان کو بوسہ دینا شرک نہیں ہے؟ محبت کی غرض سے اپنی اولاد کو بوسہ دینا بدعت وشرک نہیں تو پھر اظہار محبت یا مقام احترام کے

پیشِ نظر مقاماتِ مقدسہ کو بوسہ دینا کیوں کہ بدعت وشرک ہے؟ جب کہ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ والوں کی یادگاریں ہیں، جن کی یاد یادِ خدا کا درس دیتی ہے اور جن کا ذکر ذکرِ خدا کا شوق دلاتا ہے۔

ہاں آئمہ طاہرین علیہ السلام کے عتباتِ عالیات کی زیارت اس لئے کی جاتی ہے کہ طبیعت میں جذبہ عبادت پیدا ہو۔ اس لئے نہیں کہ وہ خود مقصودِ عبادت ہیں، ورنہ ہمارے نزدیک ضریحِ مقدسہ کو بجائے خود کعبہ (بیت اللہ) کا سجدہ کرنا بھی ناجائز ہے جب کہ بیت اللہ کو معبود قرار دیا جائے۔ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم اس لئے ضروری ہے کہ ان سے درسِ عبادت حاصل ہو، نہ اس لئے کہ خود ان کو مقصودِ عبادت قرار دیا جائے۔ پس صفا۔ مروہ، مقامِ ابراہیم حجرِ اسود، کعبہ وغیرہ یہ سب چیزیں غیر اللہ ہیں اور خود ان کو معبود ماننا کفر وشرک ہے۔ جب ہم کعبہ کو معبود نہیں جانتے تو کسی اور مقام کو کیوں معبود قرار دینے لگیں؟

یہی وجہ ہے کہ ہمارے نزدیک آئمہ معصومینؑ کی ضرائحِ مقدسہ کی زیارت پڑھنے کے بعد مستحب ہے کہ دو رکعت نماز زیارت سر کی جانب پڑھی جائے یعنی ضرائح کے سیدھا پیچھے ہو کر پڑھنے سے بچا جائے، تاکہ ضرائحِ مقدسہ کے سامنے آجانے کی صورت میں یہ شائبہ تک پیدا نہ ہو کہ غیر اللہ کو سجدہ ہو رہا ہے ورنہ جب مقصودِ عبادت جنابِ رب العزت ہوتا ہے تو ضرائح کے پیچھے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوا کرتی۔ البتہ کوئی نااہل اپنی کوتاہ علمی کی بناء پر ایسا فعل کرے، جس سے شرک وکفر لازم آجائے تو یہ تعلیمِ مذہب نہیں، بلکہ اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

اب رہا ضرائحِ مقدسہ کی شبیہات کا معاملہ جو ہمارے ملک میں مروج ہے تو ان کی تعظیم کو بت پرستی یا شرک سے تعبیر کرنا صرف چشم کوری اور عناد شعاری سے ہی تعبیر کیا

جا سکتا ہے، کیونکہ کسی ذی روح کی سایہ دار تصویر کو بت کہا جا سکتا ہے اور غیر ذی روح کی شبیہ قطعاً نہ بت ہے نہ بت پرستی، ورنہ اگر کسی مکان کی غیر مستقل شبیہ ناجائز ہو تو پھر مکان کی مستقل شبیہ یعنی ایک مکان جیسا دوسرا مستقل مکان بنانا تو بدرجہ اولی بت پرستی ہوگا، بلکہ ہر وہ کام جس میں کسی دوسرے کی نقل اُتاری جارہی ہو وہ بدعت وشرک سے موسوم ہوگا، حالانکہ ان چیزوں کو کوئی بھی شرک سے تعبیر نہیں کرتا اور صرف ایوانِ امامت کی نقل کو بت اس لئے کہا جاتا ہے تاکہ امامت حق کی یاد لوگوں کے دلوں سے اتر جائے اور ان کی صداقت وحقانیت اور مظلومیت کے قصے فراموش ہو جائیں اور مبادا بنائی ہوئی امامت کی دکان کی شہرت مدہم پڑ جائے اور لوگ اس طرف سے کنارہ کش ہو کر حق سے ہم آغوش ہو جائیں، بالجملہ نہ عتبات عالیات خود مقصودِ عبادت ہیں اور نہ ان کی شبیہات مقصود عبادت ہیں اور قابلِ احترام اس لئے ہیں کہ ان کو خدا والوں سے نسبت ہے۔ ان کی زیارت ان خدا والوں کی یاد تازہ کرتی ہے، جن کی طرف یہ منسوب ہیں اور ان کی یاد خدا کی یاد کا وسیلہ اور عبادت کا ذریعہ ہے۔

پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ جس طرح ہم زبان سے جاری کرتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد بھی یہی ہے۔ اور جو لوگ عمل شیعہ پر بے جا اعتراض کرتے ہیں وہ صرف لفظ عبادت جانتے ہیں، حقیقی معنی اور مفہومِ عبادت سے غافل ہیں۔ ان کے پاس صرف ظاہر ہے۔ دامنِ حقیقت سے ان کے ہاتھ کوتاہ ہیں۔ خلاصہ یہ کہ خوشنودی خدا کے لئے ہر واجب التعظیم شیء کی تعظیم کرنا مفہوم عبادت کے منافی نہیں، بلکہ عینِ عبادت ہے۔ پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ کی آڑ لے کر کفر وشرک اور بدعت وبت پرستی وغیرہ کی ارزاں تقسیم بلکہ مفت تقسیم اپنے ہاں ان جنسوں کی فراوانی وبہتات کی دلیل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ برتن سے وہی

چیز برآمد ہوتی ہے جو اس میں ہو۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور شیعی عقیدہ

اس مقام پر یہ سوال عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا مطلب ہے: "اے اللہ! ہم صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں" لہذا آئمہ طاہرینؑ سے مدد طلب کرنا اور ان کو خطاب کرکے پکارنا اس فقرۂ آیت کی صریح منافی ہے لہذا ناجائز بلکہ کفر ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے متعلق ان سے مدد طلب کرنے میں عقیدہ کی دو قسمیں ہیں:

① تفویض کا قول یعنی یہ کہ خداوند کریم نے امر خلق و رزق اور موت و حیات وغیرہ کے تمام معاملات محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سپرد کردیے ہیں پس وہی پیدا کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور وہی خلائق کو رزق دیتے ہیں اور خدا اپنے مقام میں بے کار سا رہ گیا ہے۔

② وسیلہ کا قول کہ خداوند کریم نے ان ذواتِ مقدسہ کو چونکہ تمام کائنات سے افضل اور کل مخلوق کا سردار بنایا۔ پس یہ لوگ اللہ تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں جس طرح احکامِ خدا کے ہم تک پہنچانے کے لئے وہ مامور من اللہ ہیں۔ اسی طرح ہماری دعا و مناجات کی قبولیت کا بھی وہی وسیلہ ہیں۔ پس اگر پہلی قسم کا اعتقاد رکھا جائے تو اس سے کفر و شرک لازم آتا ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے اس عقیدۂ فاسدہ کی پُر زور تردید کی گئی ہے جیسا کہ کتاب کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں عقلی و نقلی طریقہ سے اس کو بالکل باطل کیا گیا ہے اور اگر حضرات محمدؐ و آلِ محمدؑ کو وسیلہ قرار دے کر ان کو پکارا جائے اور امداد طلب

کی جائے تو جائز اور موجب نصرتِ خدا ہے اور اس بارہ میں اہلِ بیت عصمت سے جو آثار و روایات منقول ہیں حد تواتر سے زیادہ ہیں۔

تفسیر برہان جلد نمبر 1 میں بروایت سلیم بن قیس ہلال جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے جس میں اہل بیت عصمت کے متعلق یہ الفاظ تصریح سے موجود ہیں (وہ قرآن کے ساتھ ہوں گے اور قرآن ان کے ساتھ ہوگا، قرآن ان کو نہ چھوڑے گا اور وہ قرآن کو نہ چھوڑیں گے، میری امت پر اللہ کی مدد انہی کے ذریعہ سے نازل ہوگی، انہی کے ذریعہ سے مینہ برسے گا اور انہیں کے وسیلہ سے مصائب دور ہوں گے اور انہی کے واسطہ سے دعا مستجاب ہوگی) اس کے بعد حضورؐ نے بارہ اماموں کی تعداد بیان فرمائی اور نام بھی بتائے۔ (تفسیر انوار النجف جلد نمبر ۲ پارہ ۱ صفحہ ۲۳ تا ۳۱)

یوم مولود کی زیارت کا ترجمہ (دعاؤں میں مقصود ذات باری تعالیٰ)۔

''اے میرے آقا! اے اللہ کی حجت! اے اللہ کے امین! اے اللہ کے ولی! تحقیق اللہ کے سامنے میرے پاس اتنے گناہ ہیں کہ انہوں نے میری پیٹھ جھکادی اور مجھے نیند سے محروم کر دیا۔ ان کی یاد میرے دل کو تڑپا دیتی ہے اور میں ان سے بھاگ کر اللہ کی طرف آیا ہوں اور آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ پس اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس نے آپ کو اپنے راز کا امین اور معاملاتِ خلق کا محافظ بنایا اور آپ کی محبت واطاعت کو اپنی محبت واطاعت کے ساتھ ملا دیا کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں میرے شفیع بنیں اور آتشِ جہنم سے مجھے پناہ دلانے والے بنیں۔

اسی طرح باقی آئمہ کی زیارات اور ان کی بارگاہوں میں منقول دعاؤں

کے الفاظ اسی نہج پر ہیں۔ اگر تمام کو جمع کیا جائے تو کتاب موضوع سے خارج ہو جائے گی۔ پس ان سب دعاؤں میں مقصود ذات جناب رب العزت ہے اور حضرات طاہرین محمدؐ و آل محمدؐ کو اس کی بارگاہ تک رسائی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ طلب مدد اللہ سے کی جاتی ہے اور آل محمدؐ واسطہ ہیں، چونکہ ان کے وسیلہ قرار دینے کے بغیر دعاؤں کی استجابت مشکل ہے لہٰذا اس کی ذات تک پہنچنے کے لئے ان ذوات طاہرہ کو قرار دینا ضروری امر ہے۔

اشتباہ

اس مقام پر بعض لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے کہ بعض دعاؤں کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ حضرات طاہرین علیہ السلام قضائے حاجت کے لئے خود کفیل ہیں اور وسیلہ نہیں۔ گویا مطلب یہ نکلتا ہے کہ صرف انہی کو پکارا جائے اور انہی سے مدد وغیرہ طلب کی جائے۔ اللہ سے مانگنے اور مدد مطلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یعنی ان دعاؤں سے تفویض کے مسلک کی درستی ثابت ہوتی ہے چنانچہ دعائے فرج کے الفاظ یہ ہیں:

يَا مُحَمَّدُ يَا عَلِيُّ يَا عَلِيُّ يَا مُحَمَّدَ اِكْفِيَانِيْ فَاِنَّكُمَا كَافِيَانَ وَانْصُرَانِيْ فَاِنَّكُمَا نَاصِرَايَ يَامَوْلَانَا يَاصَاحِبَ الزَّمَانِ اَلْغَوْث الْغَوْث الْغَوْث اَدْرِكْنِيْ اَدْرِكْنِيْ اَدْرِكْنِيْ اَلسَّاعَةَ اَلسَّاعَةَ اَلْعَجَلْ اَلْعَجَلْ اَلْعَجَلْ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّاهِرِيْنَ۔

''اے محمدؐ! اے علیؑ آپ دونوں میری کفایت کریں، کیونکہ آپ دونوں مجھے کافی ہیں۔ اور آپ میری مدد کریں، کیونکہ آپ میرے مددگار

ہیں۔ اے ہمارے مولا صاحب الزمان فریاد، فریاد، میری مدد کو پہنچیے، پہنچیے، پہنچیے، ابھی، ابھی، ابھی، جلدی، جلدی، جلدی، اے ارحم الراحمین! حضرت محمدؐ اور اس کی آل طاہرؑ کے صدقہ ہیں۔

پس اس دعا میں وسیلہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

جوابِ اشتباہ

صرف تخریب عقائد کے لئے انہی جملوں کو پیش کرنا ناخدا ترسی بلکہ تعلیمات ائمہؑ کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے۔ اگر چشم بصیرت سے ان کو ملاحظہ کیا جاوے تو اس دعا میں عقائد حقہ کے خلاف کوئی بات نہیں نکلتی، بلکہ دعا بھی پہلی دعاؤں کے اقتباسات گزشتہ کی تائید کرتی ہے کیونکہ انہی جملوں سے پہلے صاف طور پر یہ کلمات ہیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ اُولِی الْاَمْرِ الَّذِيْنَ فَرَضْتَ عَلَيْنَا طَاعَتَهُمْ وَعَرَّفْتَنَا بِذٰلِكَ مَنْزِلَتَهُمْ فَفَرِّجْ عَنَّا بِحَقِّهِمْ فَرَجًا عَاجِلًا قَرِيْبًا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ

"اے اللہ! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر رحمت نازل فرما وہ جو صاحبانِ امر ہیں جن کی تو نے ہم پر اطاعت فرض کی ہے اور اسی سے تو نے ہم کو ان کی منزلت کی معرفت عطا کی ہے۔ پس انہی کے حق کا واسطہ دے کر ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمیں جملہ مصائب سے فوری پلک جھپکنے یا اس سے بھی جلدی نجات عطا فرما۔"

اب یہ الفاظ بآنگ دہل پکار رہے ہیں کہ مقصود بالذات نداء ذاتِ احدیت ہے اور محمدؐ اور آلِ محمدؐ وسیلہ و واسطہ ہیں۔ اب اس کے بعد یا محمدؐ اور یا علیؑ کہہ کر یہ کہنا کہ تم ہی میری مدد کرو اور تم ہی میری کفایت کرو، کیونکہ تم دونوں مددگار اور کافی ہو۔ اور حضرت

حجت کو ندا کر کے ان سے فریاد کرنا اور طالب دعا ہونا۔ اس سب کا مطلب یہی ہے کہ تم وسیلہ و واسطہ بننے میں میرے لئے کافی ہو۔ اور اس امر کے لئے مجھے کسی اور سے مدد طلب کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ سوائے تمہارے وسیلہ کے باقی ذرائع میری کفایت کے لئے ناکافی ہیں اور نیز دعائے مذکور کے آخری کلمات کہ یَا اَرحَمَ الرَّاحِمِینَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ آلِہِ الطَّاھِرِینَ بھی اسی مطلب کی تائید کر رہے ہیں ان کو پکارنا اور ان سے فریاد کرنا صرف وسیلہ قرار دینے کی خاطر تھا ورنہ اللہ کو خطاب کر کے بحق محمد و آلہ الطاہرین کہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔

یا علیؑ مدد

سوال: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت ہر مقام پر حاضر و ناظر ہونا خداوند کریم کی ذات سے مخصوص ہے اور اس میں کسی اور کو شریک کرنا کفر و شرک ہے لہٰذا شیعوں کا یا علیؑ مدد کہنا یا یَا عَبَّاسَ اَدرِکنِی کہنا وغیرہ ناجائز و شرک ہے۔

جواب: خداوند کریم سے جو صفت اختصاص رکھتی ہے ہمارا اعتقاد ہے کہ واقعی اس میں کسی کو شریک ماننا ناجائز اور کفر ہے، لیکن جہاں تک محمدؐ و آلِ محمدؐ کے علوم کا تعلق ہے جو خدا نے ان کو عطا فرمائے ہیں اور کائناتِ عالم میں جس حد تک ان کی رسائی ہے جس کو شیعہ عقیدہ درست قرار دیتا ہے۔ آیا خدا کا اختصاص انہی حدود سے ہے اور بس؟ تو یہ نا خدا شناسی ہے، بلکہ یہ عقیدہ دامن علم اور اس کی قدرت کی کوئی حد نہیں اور محمدؐ و آل محمدؐ ممکن ہیں۔ ان کا علم و قدرت محدود ہے، خواہ ہم اپنے ناقص دماغ سے ان کی حدود معین کرنے سے قاصر ہیں، لیکن ہمارے ان کی حدود معین نہ کر سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی طور پر ان کے علم و قدرت کی کوئی حد نہیں۔

2 روح جب عناصر کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی ہوتی ہے، اس کے تصرفات کافی حد تک پابند عناصر ہوتے ہیں، لیکن جب قفسِ عنصری کی تاروں کو توڑ کر آزادی کی وادی میں قدم رکھتی ہے تو اس کے اختیارات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نیند اور موت کسی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی دو چیزیں ہیں۔ عالم خواب میں روح انسانی کچھ تھوڑی سی آزاد ہو جاتی ہے اور موت مر جانے کے بعد بالکل آزاد ہوتی ہے۔ عالم خواب کی تھوڑی سی آزادی حاصل ہوتے ہی اپنے بستر پر لیٹ کر گو ظاہری جسمانی آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن روح اسی جسم ظاہری جیسا ایک مثالی جسم لے کر دور دراز کے سفر کرنے پر موفق ہوتی ہے۔ اس مثالی جسم جس کی آنکھیں یہ آنکھیں نہیں ہوتیں، جس ظاہری کی جزو ہو کر بستر پر موجود ہیں اسی طرح مثالی جسم کے ہاتھ پاؤں اس ظاہری جسم کے ہاتھ پاؤں سے الگ الگ ہیں، حتی کہ مثالی جسم جس کے تمام اعضا اس واقعی اور ظاہری جسم کے تمام اعضا سے الگ ہوتے ہیں کیونکہ یہ تو ایک جگہ موجود ہیں اور وہ اسی وقت مثالی جسم کی معیت میں اطراف عالم کی سیر میں مصروف ہوتے ہیں لیکن ان کا ہر فعل ان کا فعل کہا جاتا ہے اور ان کی تمام سیر و تفریح ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے مثلاً خواب میں دیکھنے والا بیدار ہو کر خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے بیان کرتا ہے کہ میں خواب میں فلاں جگہ گیا، یہ دیکھا وہ دیکھا فلاں سے ملا۔ اس نے مجھے یہ کہا، وہ کہا۔ فلاں زیارت کی، فلاں خوشی دیکھی۔ فلاں مصیبت میں مبتلا ہوا وغیرہ۔ اب یہ میں کہتا کہ میرے مثالی جسم کے ساتھ پیش آیا اور سننے والا کوئی ہوش مند اس کو غلط بیانی سے بھی تعبیر نہیں کرتا اور کوئی موحد اس پر کفر و شرک کا فتویٰ بھی نہیں لگاتا کہ حاضر ناظر ہونا تو اللہ کا خاصہ ہے تو کس طرح ہر جگہ حاضر و ناظر ہو گیا؟ سویا یہاں تھا اور ایک ہی وقت میں پہنچ وہاں گیا؟ اور طرہ یہ کہ فتویٰ لگانے والے خود بھی انہی حالات سے

دوچار ہوتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ظاہری جسم کی آنکھیں بند ہیں اور مثالی جسم کی آنکھیں کھلی ہیں۔ اس کے پاؤں ساکن ہیں اور اُس کے متحرک ہیں۔ اس کے ہاتھ ایک جگہ پڑے ہیں اور وہ ہل جل رہے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

بیان کے وقت یہ بند آنکھیں کہتی ہیں کہ وہ کھلی ہوئی آنکھیں نم تھیں یہ خاموش زبان کہتی ہیں کہ اس عین خاموشی کے وقت بول میں رہی تھی اور یہ سب ساکن اعضاء کہتے ہیں کہ بعینہ اسی سکون کے عالم میں وہاں متحرک ہم تھے گویا حاضر و ناظر تو بجائے خود اجتماع ضدین کا ہر جگہ مسئلہ درپیش ہے اور اسے محال کوئی نہیں کہتا؟ نیز عالم خواب میں بعض اوقات مثالی جسم مناظرِ عجیبہ دیکھتا ہے تو یہ بستر پر سویا ہوا جسم مسکرا دیتا ہے حالانکہ اس پر نیند طاری رہتی ہے۔ اب اگر سوال کیا جائے کہ تو ہنس کیوں رہا تھا یا رو کیوں رہا تھا؟ تو جواب دیتا ہے کہ میں فلاں مقام پر کسی منظر عجیب کو دیکھ کر ہنسا تھا یا فلاں مقام پر کسی مصیبت میں پھنس کر رویا تھا۔

بہر کیف یہاں ایک ہی روح ہے جو ایک ہی وقت میں دونوں جسموں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک یہاں خاموش سویا ہوا ہے دوسرا وہاں سیر کر رہا ہے۔ وہ عجیب منظر دیکھ کر وہاں ہنستا ہے تو یہ سویا ہوا یہاں ہنستا ہے۔ مصیبت سے گھبرا کر ایک ہی وقت میں وہ وہاں روتا ہے تو یہ یہاں واویلا کرتا ہے۔ اسی طرح باقی تمام افعال سمجھ لیجئے۔ پس ایک ہی وقت میں یہاں بھی حاضر وہاں بھی حاضر۔ زبان سے دونوں مقاموں پر بولتا ہے۔ آنکھوں سے ہر دو مقام پر روتا ہے۔ منہ سے دونوں مقاموں پر ہنستا ہے اور یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ کسی کو مجال انکار نہیں۔ اگر دونوں جگہ پر حاضر و ناظر نہیں تو بتایئے نظارہ تو وہاں تھا یہ یہاں کیوں ہنسا ہے مصیبت تو وہاں تھی یہ یہاں کیوں چلایا ہے؟ ہم کلام تو وہاں تھا یہ یہاں کیوں بولا ہے؟ کیا اب یہاں فتویٰ لگانے کی جرأت ہے کہ جو

شخص ایک انسان کے دو مختلف مقامات یا زیادہ پر ایک ہی وقت میں حاضر و ناظر ہونے کا اعتقاد رکھے وہ مشرک ہے؟

سوال: اگر کوئی کہے کہ وہ جسم مثالی ایک فرضی جسم ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور در حقیقت جسم صرف یہی ایک ہے۔ روح بھی صرف اسی ایک میں موجود ہے اور یہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مقام پر ہے۔

جواب: بے شک وہ ایک مثالی جسم ہے اور یہ جسم حقیقی ہے لیکن بات تو یہ کہ روح کا تعلق ایک ہی وقت میں دو سے ہے یا نہیں؟ اگر وہ فرضی ہے اور روح کا تعلق اس سے نہیں تو بتایئے کہ اس کے اثرات اس پر کیسے طاری ہو گئے؟ اس کے رونے سے اسی وقت اس کی زبان سے فریاد کیوں نکلی؟ اس کے ہنسنے سے یہ کیوں ہنسا؟ اور اگر آپ انکار ہی پر مصر ہوں اور کہیں اس جسم پر اس مثالی جسم کے کوئی اثرات نہیں۔ یہ نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے، بلکہ یہ سب واقعات اسی مثالی جسم سے تعلق رکھتے ہیں، تو عرض کروں گا کہ اگر حقیقت کچھ نہیں ہوتی تو بصورت وجوب غسل واقعہ کا تعلق تو اس مثالی جسم سے ہوتا ہے اور منی کا خروج بھی اسی سے ہوتا ہے فرمایئے اس پر غسل کیوں واجب ہو گیا اور اس کے کپڑے کیوں نجس ہو گئے؟

اگر ایک مسلمان عالم خواب میں حضرت رسالت مآبؐ کی زیارت کا شرف حاصل کر رہا ہو اور اسی اثنا میں کوئی باہر سے آ کر اس جسم کو بیدار کر دے تو وہ چونکہ اس جسم ظاہری کا مدبر ہے خواہ وہاں کتنا ہی پر لطف وقت گزر رہا ہو۔ اسی آن میں وہ سب پر کیف حالات چھوڑ کر فریضہ تدبیر سنبھالنے کے لئے یہاں آپہنچے گا اور فوراً ہی جگانے والے پر خفا ہو گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا اور اسی ظاہری جسم کی زبان سے کہے گا کہ میں نے انہی آنکھوں سے زیارت کی۔ اس زبان سے سلام عرض کیا وغیرہ۔ اور بیدار

ہونے پر اس کو پُر کیف منظر کے ترک کرنے کا افسوس حد سے زیادہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر جگانے والا کمزور ہوگا تو اسے پیٹنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ اب اگر واقعہ کا تعلق صرف اسی فرضی جسم سے ہے تو افسوس یا خوشی کیوں ہے؟

بہر کیف یہ روح کی اس تھوڑی سی آزادی کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں دو مقاموں پر حاضر ہوتا ہے نیز یہ حالات صرف مومن سے مختص نہیں بلکہ کافر و مشرک بھی اس قسم کے حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ پس اگر کافر کی روح ایک وقت میں دو مقاموں پر حاضر ہو سکتی ہے اور اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا شرک نہیں تو کسی اور کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا شرک کیوں ہوگا؟

مومن کے خواب کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ نبوت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری جلد چہارم (۱۲۸ تا ۱۲۹) چاپ مصر میں ہے:

① عَن انس بنِ مَالِك اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ قَالَ الرُّؤْيَا الْحَسَنَةَ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِن سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ

''انس بن مالک سے مروی ہے کہ جناب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نیک مرد کا اچھا خواب نبوت کی چھیالیسویں جز ہوا کرتا ہے۔''

② عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنِ النَّبِي قَالَ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

''عبادہ بن صامت نے جناب رسالت مآبؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: مومن کا خواب نبوت کی چھیالیسویں جز ہوتا ہے۔''

④ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِیْنَ جُزْأً مِنَ النُّبُوَّةِ

''ابوہریرہ سے مروی ہے کہ جناب پیغمبر خداؐ نے فرمایا: مومن کا خواب نبوت کی ۴۶/۱۰ جز ہے۔''

④ عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِ اِنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَقُوْلُ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِیْنَ جُزْأً مِنَ النُّبُوَّةِ

''ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ میں نے جناب رسالت مآب کو فرماتے ہوئے سنا کہ اچھا خواب نبوت کی جزوں میں چھیالیسویں جزو ہے۔''

بہرکیف ہر چہار روایات کا مطلب واحد ہے یعنی ایک صالح مومن کی روح جب قید عناصر سے معمولی آزاد ہو جس کی بدولت وہ بیک وقت دو مقاموں پر حاضر ہو سکتی ہے۔ اس سے روح نبوت باوجودیکہ محبوس قید عناصر ہو، چھیالیس گنا زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ جب عام روح نبوت کی یہ طاقت ہے تو پھر وہ نبوت جس کے زیر فرمان ایک لاکھ ایک کم چوبیس ہزار نبوتوں کی دنیا آباد ہو، اس کی طاقت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ میں نے تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ گزشتہ انبیاء سرکار رسالت مآبؐ کے مقابلہ میں جزوی حیثیت رکھتے تھے اور یہ ان کے مقابلہ میں کلی حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ محدود قوم اور محدود علاقہ پر مامور بہ نبوت تھے اور ان کی نبوت عالمی نبوت ہے تو اس چیز سے یہ چیز خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کا صحیح جانشین گزشتہ نبیوں سے افضل ہوگا، کیونکہ بادشاہ کا قائم مقام اس کی تمام رعایا کا حاکم ہوا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کے صحیح جانشین کے انتخاب میں خطا کر جائیں۔

اور ایسے شخص کو منتخب کر بیٹھیں جو ان صفات کا حامل نہ ہو۔ پس صحیح بخاری کی روایات کی تطبیق سے معلوم ہوا کہ اگر مومن کی روح عالم خواب میں دو مقاموں پر پہنچ سکتی ہے تو نبی عالم بیداری میں چھیالیس جگہ حاضر ہو سکتا ہے اور یہ عام نبی کی حالت ہے اور خاتم الانبیاء کا ایک مختصر وقت میں متعدد مقامات میں حاضر ہونا شب معراج کی حقیقت سے واضح ہے اور پھر جو اُن کا صحیح قائم مقام ہو اس کے لئے متعدد مقامات پر حاضر ہو سکنے کا اشکال ہی فضول ہے۔

پس اگر یہی حاضر و ناظر ہونا خدا کے ساتھ مخصوص ہے تو یہ عقیدہ یقیناً ناخداشناسی ہے اور اگر خدا کی ذات کو اس سے اجل وارفع قرار دے کر کہا جائے کہ خدا اتنی طاقت اپنی خاص مخلوق کو بھی دے سکتا ہے تو یہ اس کی عظمت وقدرت کی دلیل ہے اور وہ خدا جو اپنے خاص بندوں کو اس قدر طاقت دے سکتا ہے جس سے ہمارے ناقص عقول عاجز ہیں تو ہمارے وہم وگمان کی رسائی اس کی اپنی ذات تک کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب: علم مسمریزم کے عامل اپنے معمول کے ذریعہ سے عجیب وغریب باتیں ظاہر کرتے ہیں۔ ایک عامل علم مسمریزم کی طاقت سے ایک نابالغ معمول کو بے ہوش کر کے سلا دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس میں کوئی حس وحرکت نہیں۔ اب پوچھتا ہے تو کون؟ وہ کہتا ہے میں معمول۔ پھر پوچھتا ہے میں کون؟ وہ جواب دیتا ہے تو عامل، پھر عامل ایک شخص کے سر پر ہاتھ رکھ کر معمول سے دریافت کرتا ہے تو معمول جس نے اس سے پہلے نہ اس شخص کو دیکھا نہ سنا عامل کے سوال کے بعد اس شخص کا نام بتلاتا ہے۔ اس کے باپ کا نام لیتا ہے، اس کے شہر کا پتہ بیان کرتا ہے۔ اور اس کا سوال بیان کر کے اس کے نتیجہ کی خبر بھی دے دیتا ہے اور یہ سب چیزیں عام طور پر درست بھی ہوا کرتی ہیں جیسا کہ عام مشہور ہے، پھر عامل دوسرے شخص کے سر پر ہاتھ

رکھتا ہے تو وہی معمول اس شخص کے تفصیلی حالات بیان کرتا ہے اور مجمع میں سے جس جس کے متعلق عامل سوال کرتا جائے وہ بیان کرتا جاتا ہے، حالانکہ یہ لوگ دور دور کے بسنے والے ہوتے ہیں۔ جن سے معمول ظاہری طور پر قطعاً ناآشنا ہوا کرتا ہے۔ اب بتایئے کہ وہ معمول یہ خبریں کہاں سے لایا؟ اور ان پر کیسے مطلع ہوا؟ پس جب ایک عامل اپنے علم مسمریزم کے ذریعہ سے اپنے معمول میں یہ طاقت بھر سکتا ہے تو خالق کائنات اپنے مخصوص بندوں کو اتنی یا اس سے زیادہ طاقت عطا کرنے سے عاجز ہے؟

4 معراج جسمانی مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے۔ جناب رسالت مآبؐ رات کے ایک مختصر حصہ میں تمام ملاء اعلیٰ کی سیر کر کے واپس بھی آ گئے اور اس تھوڑے سے وقت میں آپ نے جو تفصیلی مناظر ملاحظہ فرمائے اس کی لمبی فہرست ہے۔ ملائکہ سے باتیں ہوئیں بیت المعمور پر نماز پڑھی۔ جنت کو دیکھا، دوزخ کو دیکھا، عرش کی سیر کی، حجابات قدرت دیکھے نامعلوم کیا کیا دیکھا؟ اور پھر پلٹ بھی آئے تو جو خدا جسم عنصری کی پابندی کے ساتھ اپنی رسولؐ کو اتنی طاقت دے سکتا ہے اور وہ اس پابندی کے ہٹ جانے کے بعد صرف روح رسالتؐ کو اتنی طاقت نہیں دے سکتا کہ چشم زدن میں پورے عالم کا معائنہ فرمالیں؟

پھر یہ سوال بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ مرجانے کے بعد کسی کو پکارنا عبث ہے کیونکہ وہ نہ سن سکتا ہے اور نہ کچھ کر سکتا ہے۔

جواب: نماز کے تشہد میں تمام مسلمان اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ پڑھتے ہیں، حالانکہ ان کے رحلت فرما جانے کا علم ہے تو کیا نماز کے وقت وہ حاضر و ناظر ہیں۔ اور باقی حالات میں ان کی یہ خصوصیت مفقود ہوتی ہے؟

2 اگر کسی کا بھائی یا فرزند مرجاتا ہے تو قبر پر جا کر قبر سے خطاب کیا جاتا ہے کہ

بھائی جان میں تیرے بعد تنہا ہوں، تیرے بچے یتیم ہیں، یا بیٹا تیرے بعد باپ کا کوئی سہارا نہیں۔ میں تیری قبر پر آیا ہوں، میرے ساتھ کلام کرو، حالانکہ علم ہوتا ہے کہ یہ جواب نہ دیں گے اور ان خطابات کو کوئی شخص شرک وکفر سے تعبیر نہیں کرتا، کیونکہ یہ خطابات صرف اظہار محبت کے لئے ہوتے ہیں پس جب عام انسان کی قبروں سے خطاب کیا جاسکتا ہے تو اولیاء اللہ کی قبروں کے سامنے اظہار عقیدت سے کیا مانع ہے کہ ان کو خطاب کر کے اپنی مشکلات کا ذکر کیا جائے جب کہ مقصود ان کو بارگاہ خدا میں وسیلہ بنانا ہو؟

پس نتیجہ یہ نکلا کہ نہ گھر بیٹھے ان کو پکارنا ممنوع ہے اور نہ ان کی قبروں پر جا کر ان کو خطاب کرنا عبث ہے، کیونکہ مقصود ہر دو صورتوں میں ان کا وسیلہ بنانا ہوا کرتا ہے اور اللہ سے ہی طلب حاجات کی جاتی ہیں۔ پس اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے اس فعل کی کوئی منافات نہیں ہے۔

آیات فاتحہ ابواب جنت کی کنجیاں ہیں

کتاب (بحار الانوار ج ۳ ص ۲۹۴) پر عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے شب معراج جب آسمانوں کی سیر کروائی گئی تو جنت ونار میرے سامنے لائی گئیں۔ میں نے جنت کی نعمات کو دیکھا اور جہنم کے عذاب کو بھی دیکھا۔ جنت کے آٹھ دروازے تھے کہ ہر دروازے پر چار ایسے کلمات مرقوم تھے کہ ان کا ہر ایک جاننے اور عمل کرنے والے کے لئے دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔ مجھے جبرئیلؑ نے کہا کہ پڑھو تو میں نے پڑھا۔

پہلے دروازے پر لکھا تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰهِ

ہر شے کے لئے حیلہ ہوا کرتا ہے۔ اور آرام کی زندگی کے چار حیلے ہیں۔

① قناعت کرنا۔ ② بجا خرچ کرنا۔ ③ کینے کا ترک کرنا۔

④ نیکوں کی صحبت۔

دوسرے دروازہ پر مرقوم تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰهِ۔

ہر شے کے لئے حیلہ ہوتا ہے اور آخرت کی خوشی کے چار حیلے ہیں۔

① یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرنا ② بیواؤں پر رحم کرنا

③ مومنین کی حاجات میں کوشش کرنا ④ فقراء اور مساکین کی خبر گیری کرنا

تیسرے دروازے پر تحریر تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰهِ۔

ہر شے کے لئے حیلہ ہوتا ہے اور دنیا کی تندرستی کے چار حیلے ہیں:

① کم بولنا۔ ② کم سونا۔ ③ کم چلنا۔

④ کم کھانا۔

چوتھے دروازے پر منقوش تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّد رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰهِ

جو شخص پر اور قیامت پر یقین رکھتا ہو پس اس کو لازم ہے کہ مہمان کی عزت کرے جو شخص اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کی حرمت کا خیال رکھے جو شخص اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہو ضروری ہے کہ اپنے والدین کا احترام کرے اور جو شخص اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہو پس نیکی کی بات کہے ورنہ

چپ اختیار کرے۔

پانچویں دروازہ پر مکتوب تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ

جو شخص اپنے اوپر ظلم برداشت نہ کرے، تو وہ دوسرے پر ظلم سے اجتناب کرے جو گالی دیا جانا نہ پسند کرے چاہیے کہ خود بھی کسی کو گالی نہ دے۔ جو ذلیل ہونا نہ چاہے وہ کسی دوسرے کو ذلیل نہ کرے اور جو دنیا و آخرت میں مضبوط تعلق سے وابستگی چاہے پس اس کلمہ کو پڑھے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ

چھٹے دروازہ پر درج تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ

جو قبر میں کشادگی کا تمنائی ہو چاہیے کہ مساجد کی بنا کرے، جو چاہے کہ میں قبر میں بوسیدہ نہ ہوں پس (عبادت خدا کے لئے) مساجد میں سکونت کرے جو چاہے کہ زمین کے نیچے مجھے کیڑے مکوڑے نہ کھائیں پس وہ (یاد خدا کے لئے) مساجد میں بسر کرے اور جو جنت میں اپنا گھر دیکھنا چاہے (پس ذکر خدا کے لئے) مساجد میں رہے۔

ساتویں دروازہ پر ثبت تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ

دل کی نورانیت چار چیزوں میں ہے:

① بیمار پرسی۔ ② تشییع جنازہ ③ کفن کو خرید کر کے رکھنا

④ قرض کا ادا کرنا۔

آٹھویں دروازہ پر رقم تھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰهِ

جو شخص ان دروازہ ہائے جنت سے گزرنے کا متمنی ہو وہ اپنے اندر چار خصلتیں پیدا کرے:

① سخاوت ② خوش خلقی ③ صدقہ

④ اللہ کے بندوں کی ایذا رسانی سے پرہیز (الخبر)

ملا صدرالدین شیرازی اعلیٰ اللہ مقدمہ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: جس کا ماحصل یہ ہے کہ نماز چونکہ بفرمانِ معصومؑ مومن کی معراج ہے پس اس معراج کی تیاری کے لئے پہلے پہل ظاہری نجاسات و کثافات کو بدن ولباس سے دور کرے، تاکہ اس کی روح اس معراج پر فائز ہونے کے قابل ہو سکے، پھر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو کر پورے سکونِ قلب اور توجہ خاطر کے ساتھ زبان سے اللہ اکبر کے کلمات جاری کر کے جلال و عظمتِ خداوندی کے سامنے اپنے آپ کو جمیع ماسوائے اللہ سے علیحدہ پائے۔ پس یہ دعائے توجہ جو مستحب ہے پڑھے:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور یہ مقام حضرتؑ ابراہیمؑ خلیل الرحمٰن کا ہے کہ انہوں نے یہی کلمات ادا فرمائے تھے، جب روحانیت کے منازل اس حد تک طے ہو گئے تو اب جنت کے دروازے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں جن کی ترتیب یہ ہے:

1 بَابُ المعرفته: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنے سے کھلتا ہے کیونکہ اس میں اغوائے شیطانی سے برأت کا اظہار ہے اور تکبر سے یکسوئی ہے۔

2 بَابُ الذِّكر: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے زبان سے جاری کرنے سے

کھلتا ہے۔

3 بَابُ الشکر: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے پڑھنے سے کھل جاتا ہے۔

4 بَابُ الرَّجاء : اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے پڑھنے سے کھلتا ہے۔

5 بَابُ الْخوف: مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تلاوت سے کھلتا ہے۔

6 بَابُ الِاخلاص : اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے پڑھنے سے باز ہوتا ہے

7 بَابُ الدُّعا: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے زبان پر جاری کرنے سے کھلتا ہے۔

8 بَابُ الِاقتداء: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے پڑھنے سے کھلتا ہے۔(تفسیر انوار النجف، ص ۳۵ تا ۴۳)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ الٓمٓ ذٰلِكَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ۔

(بقرہ: آیت ۱)

حُروفِ مقطعات کا بیان

الٓمٓ حروفِ مقطعات قرآنیہ کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے ان کو ایسا راز کہا ہے کہ جس کو سوائے علام الغیوب کے کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں جن کے درپے ہونا طول بلا طائل ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ الٓمٓ اور جمیع مقطعات اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم پر ہر مشتمل ہیں جن کو نبی یا امام ترتیب دے سکتا ہے۔ تفسیر امام میں ہے کہ ان حروف سے ابتداء کا مقصد منکرین کو تحدی کرنا ہے یعنی یہ قرآن انہی حروف سے مرکب ہے جس سے تم اپنا کلام مرکب کرتے ہو۔ اس کے حروف کوئی نئے نہیں۔ پس اگر اس کلام کو تم اللہ کا کلام نہیں مانتے تو انہی حروف سے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قسم

کے لئے ہیں یعنی الف لام ومیم کی قسم اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔

تفسیر صافی سے بحوالہ تفسیر عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے پاس حروف مقطعات قرآنیہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

اور تحقیق یہ ہے کہ جملہ حروف مقطعات قرآنیہ اسرار ورموز علوم الٰہیہ کے خزانے ہیں، جن کی صحیح خبر راسخون فی العلم کے علاوہ اور کسی کو نہیں اور یہ کہنا کہ سوائے اللہ کے اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ حتی کہ نبی وامام بھی اس سے بے خبر ہیں، بالکل غلط ہے۔ ورنہ یہ کتاب ساری کی ساری ہدایت کیسے ہوسکتی ہے جب کہ اس کے بعض کلمات کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئیں اور پھر اس قسم کے الفاظ نازل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے جس کا علم اس کے اپنے رسولؐ کو بھی نہ ہو؟ پس جس طرح عموماً حبیب ومحبوب کے باہمی مکالمات ومکاتیب ہیں۔ بعض اس قسم کے اسرار ورموز ہوا کرتے ہیں جن کو غیر نہیں سمجھ سکتا یا یوں سمجھئے کہ جس طرح ایک افسر اعلیٰ اور حاکم اپنے ماتحت افسر کو رعایا پر نافذ کرنے کے لئے چند احکام تحریر کرے اور چٹھی کے سرنامہ پر چند ایسے اشارات درج کردے جن کا تعلق صرف اسی مکتوب الیہ افسر سے ہو اور ان اشارات میں چٹھی کے تمام مندرجہ احکام کے نافذ کرنے کی خصوصی ہدایات درج ہوں جن پر عوام کو مطلع کرنا مصلحت وقت کے خلاف ہو تو جب عوام کے سامنے وہ چٹھی آئے گی یقیناً وہ سرنامے پر درج شدہ اشارات کو مہمل خطوط سمجھیں گے اور ذیل میں مندرجہ احکام کے صحیح فیصلہ وہ ہی افسر کرسکے گا جس کو وہ چٹھی بھیجی گئی تھی اور اشارات خصوصی پر اسے مطلع کیا گیا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا صحیح قائم مقام ان مندرجات کے صحیح نفاذ کا ذمہ دار ہوگا۔

اسی طرح مقطعات قرانیہ کے علوم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس

کی آل طاہرین علیہم السلام ہی تک محدود ہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں اس کا مضمون گزر چکا ہے اور وہی قرآنِ مجید کے جملہ مضامین کا صحیح حل سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے دروازہ سے یک سوئی ہی مسلمانوں کے اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ جس طرح سلاطین دنیا کا یہی طرز عمل ہے کہ ان کی چٹھیاں دو حصوں پر منقسم ہوا کرتی ہیں: ایک حصہ کا تعلق صرف مکتوب الیہ افسر سے ہوتا ہے جس میں عمومی احکام کے نافذ کرنے کے طریقے اور دیگر خصوصی ہدایات ہوتی ہیں اور دوسرے حصے کا تعلق عام رعایا سے ہوتا ہے لیکن دوسرے حصہ کو کما حقہ، وہی سمجھ سکتا ہے جس کو پہلے حصے کا علم ہو۔ اسی طرح قرآنِ مجید میں مقطعات قرآنیہ کا علم انہی ذوات طاہرہ سے مختص ہے جن کو قرآن کا مبلغ قرار دیا گیا ہے اور باقی قرآن کا تعلق پوری امت سے ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ قرآن پورے کا پورا ہدایت و رحمت ہے لیکن ہادیٔ سے کنارا کشی اس کے صحیح مطالب سے دوری کی موجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار قرآن اور اہل بیتؑ ہر دو سے تمسک کی تاکید فرمائی۔ اور اس کے بغیر امت کی گمراہی کا خطرہ ظاہر فرمایا۔ (تفسیر انوار النجف، جلد2، ص49)

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

"اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدمؑ کو پس سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں سے اور ہم نے کہا اے آدمؑ! رہو تو اور تیری بیوی جنت میں اور کھاؤ اس سے کھلم کھلا

جہاں چاہو تم اور نہ قریب جاؤ اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے نقصان پانے والوں میں سے۔" (بقرہ ۳۵،۳٤)

تحقیق شجرہ

تفسیر برہان میں منقول ہے کہ عبدالسلام بن صالح ہروی کہتا ہے کہ میں نے امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یابن رسول اللہ! فرمائیے: وہ درخت کون تھا جس سے حضرت آدم وحوا علیہما السلام نے تناول کیا کیونکہ لوگوں میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ گندم کا درخت تھا۔ بعض انگور کہتے ہیں اور بعض اس کو شجرۂ حسد بیان کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سب درست ہے۔ میں نے عرض کی کہ پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا: اے ابن صلت! جنت کا درخت کئی قسموں کا پھل دے سکتا ہے۔ گندم کا درخت تھا لیکن اس میں انگور بھی لگ سکتے تھے۔ وہ مثل دنیا کے اشجار کے نہ تھا۔ اور جب آدمؑ کو اللہ نے ملائکہ کے سجدہ کا شرف مرحمت فرمایا اور داخل جنت کیا تو آدم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب مجھ سے افضل اور کون ہو سکتا ہے۔ پس اللہ کی جانب سے ندا پہنچی کہ سر بلند کر کے ساق عرش کی طرف نگاہ کرو۔ پس آدم علیہ السلام نے ساق عرش پر دیکھا تو لکھا ہوا پایا۔

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِی بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَزَوْجَتُهٗ فَاطِمَةُ سَیِّدَةُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَ شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ (تفسیر انوار النجف جلد۲ ص ۹۵)

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

"پس حاصل کیے آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات (ان کی بدولت) پس توبہ قبول کی اللہ نے اس کی اور وہ بہت توبہ قبول کرنے

والا مہربان ہے۔" (البقرہ: ۳۷)

قبولِ توبہ حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام نے جن کلمات سے توبہ کی روایات میں ان کے الفاظ مختلف ہیں۔ تفسیر عیاشی سے بروایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے کہ دعا کے کلمات یہ تھے۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

بعض روایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ کلمات یہ تھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّیْ عَمِلْتُ سُوْٓءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اللّٰهُمَّ اِنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ اِنِّیْ عَمِلْتُ سُوْٓءًا وَظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

ان کے علاوہ دیگر روایات بھی ہیں، لیکن مقصد سب میں حمد وثنا جناب باری تعالٰی اور اس کے بعد اپنے قصور کا اعتراف اور طلب معافی ہے چنانچہ خود قرآن مجید ان کی دعا کے کلمات یہ بیان فرماتا ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ

اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے روایات کے الفاظ مختلف یا کم وبیش کیوں ہیں؟ کیونکہ قرآن مجید میں اکثر وبیشتر مطالب ایسے ہیں جو اجمالاً بیان ہوئے ہیں۔ اور روایات میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ لہٰذا اس صورت

میں قرآن مجید اور الفاظ روایات میں منافات نہیں، بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ نیز معصومین علیہم السلام سے نقل شدہ روایات کے الفاظ کا اختلاف بھی کوئی باہمی منافات نہیں رکھتا کیونکہ ممکن ہے کہ راویان حدیث، میں سے کسی نے کلام کو پورا ضبط کرلیا تو پورے الفاظ آگے چل کر نقل کر دیے اور کسی کو پوری روایت یاد نہ رہی تو اس نے اس کا معنی نقل کر دیا۔ اسی وجہ سے ایک ہی روایت متعدد راویوں سے مختلف الفاظ میں نقل ہو جاتی ہے۔ یاد رہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب توبہ کی تو اس توبہ کا طریقہ بھی خداوند کریم نے خود تعلیم فرمایا۔ جس طرح کہ قرآن مجید میں موجود ہے: فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ "یعنی آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کلمات سیکھے۔" اور متواتر روایات آئمہ طاہرین علیہم السلام میں ہے کہ خمسہ نجباء یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام، جناب فاطمہ علیہا السلام حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام کو واسطہ دے کر دعا کی، چنانچہ شیخ کلینی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے جیسا کہ تفسیر برہان میں مذکور ہے۔ نیز ابن بابویہ سے مسند ا معمر بن راشد سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ ایک دفعہ ایک یہودی حضرت رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سامنے کھڑے ہو کر آنحضرت پر نظر جما کر دیکھنے لگا۔

آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا: اے یہودی! کیا چاہتا ہے؟

اس نے جواب میں عرض کی: حضورؐ! مجھے فرمایئے کہ آپ افضل ہیں یا حضرت موسیٰ بن عمرانؑ جن سے خدا نے کلام فرمائی۔ اور اس پر تورات اور عصا کو نازل کیا اور اس کے لئے دریا کو شق کیا، اور بادل کا سایہ کیا؟

حضورؐ نے فرمایا: انسان کے لئے اچھا نہیں کہ اپنی تعریف کرے، لیکن میں اتنا

کہتا ہوں کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو اس کی توبہ کے الفاظ یہ تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ لِمَا غَفَرْتَ

پس خدا نے اس کو معاف کر دیا اور جب حضرت نوحؑ کشتی پر سوار ہوئے اور غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تو یہ کلمات کہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ لِمَا نَجَّیْتَنِیْ مِنَ الْغَرَقِ

"یعنی میرے اللہ میں تجھ سے بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ سوال کرتا ہوں کہ مجھے غرق ہونے سے نجات دے۔"

پس اللہ نے اس کو نجات دی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں پھینکا گیا تو انہوں نے وہی الفاظ دہرائے یعنی میرے اللہ میں تجھ سے محمدؐ و آلِ محمدؐ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس سے نجات دے پس اللہ نے آگ کو ٹھنڈا اور موجب سلامتی قرار دیا اور جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور دل میں ڈر محسوس کیا تو یہی کلمات کہے:

"اے اللہ! میں تجھ سے بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ سوال کرتا ہوں کہ مجھے بچا۔"

پس ارشاد قدرت ہوا:

لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی

پھر آپ نے فرمایا: اے یہودی اگر موسیٰؑ مجھے پا لیتے اور میرے نبوت پر ایمان نہ لاتے تو اس کو اپنا ایمان اور اپنی نبوت کچھ فائدہ نہ دیتی۔ اے یہودی! میری ذریت سے مہدیؑ ہوگا کہ جب وہ ظاہر ہوگا تو اس کی مدد کے لئے عیسیٰؑ بن مریمؑ اُتریں گے اور اس کو آگے کھڑا کر کے خود اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

ابن شہر آشوب سے بروایت خصائص نطنزی ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے خمسہ نجباء کے وسیلہ سے دعا مانگی اور الفاظ یہ کہے:

يَارَبِّ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَعَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ لِمَا غَفَرْتَ لِيْ

پس خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی اور یہی وہ کلمات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے حاصل کیے جس کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ

"تفسیر برہان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ پیدائش سے قبض روح تک حضرت آدم علیہ السلام کی کل عمر (۹۳۰) برس تھی اور دفن مکہ میں ہوئے تھے۔ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کے جسد خاکی میں روح داخل کی گئی تو وہ جمعہ کا دن تھا اور زوال کے بعد روح ان کے جسم میں داخل ہوئی۔ اس کے بعد ان کی زوجہ پیدا ہوئی اور اسی دن داخلِ جنت ہوئے۔ کل چھ گھنٹے جنت میں رہنے کے بعد ترک اولیٰ کی وجہ سے غروب شمس کے بعد جنت سے باہر آگئے وہاں ایک رات بھی نہیں رہے۔

پس یہ تھا حضرت آدمؑ کے جنت میں رہنے کا مطلب اور ترکِ اولیٰ کا واقعہ اور توبہ اور قبول توبہ کا قصہ، جس کو میں نے تفصیل سے عرض کر دیا۔ اس میں نہ حضرت آدم علیہ السلام کا گناہ ثابت ہوتا ہے نہ خلاف عصمت و نبوت کوئی شے لازم آتی ہے، نہ منافی عقل ہے اور نہ مخالفِ نقل۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۲ ص ۹۶)

تفسیر برہان میں اسی آیت کے ذیل میں ابن بابویہ سے بسند متصل ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ پر جب یہ آیت اتری تو فرمایا کہ جب حضرت آدمؑ دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے فرزند حضرت شیثؑ کے ساتھ وفا کرنے کا اپنی

امت یعنی باقی اولاد سے عہد لیا لیکن اس عہد کی وفا نہ کی گئی اور جب حضرت نوحؑ دنیا سے گئے تو انہوں نے اپنے فرزند سام کے لئے اپنی امت سے وفا کا عہد لیا، لیکن ان کی امت نے وفا نہ کی۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے دنیا سے جاتے ہوئے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کے لئے اپنی قوم سے وفا کا عہد لیا لیکن امت نے پورا نہ کیا۔ اور حضرت موسیٰ نے جب دُنیا سے رحلت فرمائی تو اپنی قوم سے اپنے وصی حضرت یوشعؑ کے ساتھ وفاداری کا عہد لیا لیکن انھوں نے پورا نہ کیا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام آسمان پر تشریف لے گئے تو انہوں نے اس سے پہلے اپنی قوم سے اپنے وصی حضرت شمعونؑ کے ساتھ وفا کرنے کا عہد لیا، لیکن امت نے وفا نہ کی۔ اب میں بھی عنقریب تم سے جدا ہونے والا ہوں اور تمہارے درمیان سے رخصت ہونے والا ہوں اور میں نے بھی اپنی امت سے علی بن ابی طالبؑ کے لئے عہد لیا ہے لیکن یہ بھی گزشتہ امتوں کے نقش قدم پر چل کر میرے وصی کی مخالفت و نافرمانی کریں گے۔ آگاہ رہو! علیؑ کے بارے میں میں اپنے عہد کو تازہ کرتا ہوں پس جو شخص اس عہد کو توڑے گا اس کا وبال اس کے سر پر ہوگا اور جو وفا کرے گا خدا اس کو اجر عظیم عطا کرے گا۔ اَیُّھَا النَّاس! علیؑ میرے بعد تمہارا امام ہے، اور تمہارے اوپر میرا خلیفہ ہے۔ اور یہی میرا وصی ہے، اور وزیر بھی ہے، میرا بھائی بھی ہے اور ناصر بھی ہے۔ میری شہزادی کا شوہر بھی ہے اور میری اولاد کا باپ بھی ہے، میری شفاعت، حوض اور لواء کا مالک بھی ہے۔ جس نے اس کا انکار کیا اس نے میری نبوت کا انکار کیا اور جس نے میرا انکار کیا اس نے اللہ کا انکار کیا۔ اور جس نے اس کی امامت کا اقرار کیا اس نے میری نبوت کا اقرار کیا۔ اور جس نے میری نبوت کا اقرار کیا اس نے اللہ کی توحید کا اقرار کیا۔

اے لوگو! جس نے علیؑ کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی، اور جس نے

میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، جس نے علیؑ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اَیُّهَا النَّاسُ! جس نے علی علیہ السلام کے قول وفعل کے اوپر کسی اور امام کو ترجیح دی گویا اس نے میرے اوپر کسی اور نبی کو ترجیح دی گویا اس نے اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب ہونے میں ترجیح دی۔

اَیُّهَا النَّاسُ! علیؑ سید الوصیین ہے نوریوں کا سردار ہے اور مومنوں کا مولا ہے۔ اس کا ولی میرا ولی اور میرا ولی اللہ کا ولی ہے۔ اس کا دشمن میرا دشمن اور میرا دشمن اللہ کا دشمن ہے۔ پس علی علیہ السلام کے بارے میں اللہ کے عہد کی وفا کرو، وہ قیامت کے دن تمہارے ساتھ جنت کے عہد کی وفا کرے گا۔ (تفسیر انوار الحق، جلد:۲، ص:۱۰۰)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ
نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ
يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ
الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ
بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ (البقرہ)

بنی اسرائیل پر نعماتِ خداوندی کا ذکر

يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ: اس مقام پر تنزیل کے اعتبار سے نبی اسرئیل سے مراد اولادِ یعقوب ہے۔ پہلے رکوع میں ان پر انعامات کو اجمالی طور پر ذکر کیا گیا تھا، یہاں سے ان نعمتوں کی تفصیل کو شروع کیا گیا ہے اور اسی بنا پر اس کو دہرایا گیا ہے۔

شفاعت

تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہاں جس دن سے ڈرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اس سے مراد موت کا دن ہے، کیونکہ موت سے نہ کوئی دوسرے کی مدد کرسکتا ہے اور نہ [illegible]ز کا مقام ہوتا ہے اور نہ فدیہ سے اس کو روکا جا سکتا ہے۔ اور اس سے یوم قیامت مراد [illegible]، کیونکہ اس دن ہم اپنے شیعوں کی مدد کریں گے۔ اعراف پر حضرت محمد مصطفیؐ، علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام، حسین علیہ السلام اور ان کی طاہر اولاد موجود ہوگی۔ پس عرصۂ محشر میں جب مومنین سختی دیکھیں گے تو ہر زمانہ کے نیک اور اخیار شیعوں کو ان کی نجات کے لئے بھیجیں گے، مثلاً اپنے زمانہ والوں کے لئے سلمانؓ، مقدادؓ، ابوذرؓ وغیرہ (بحکم امام) باز و شاہین کی طرح جھپٹ کر گنہگار شیعوں کو اٹھا کر جنت میں داخل کریں گے۔ پس مومن داخل جنت ہوں گے۔ اور اہل بیتؑ سے عداوت رکھنے والے داخلِ جہنم ہوں گے۔ (ملخصاً) (تفسیر انوار النجف جلد ۲، ص ۱۰۴)

ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

"پھر ہم نے زندہ کیا تم کو تمہاری موت کے بعد، تاکہ تم شکر کرو۔"

(البقرہ آیت نمبر ۵۶)

ذکرِ رجعت

اس آیت سے علمائے امامیہ نے رجعت کا جواز ثابت کیا ہے۔ مذہب شیعہ میں رجعت کا مسئلہ مسلّمہ حیثیت رکھتا ہے یعنی ظہور قائم آلِ محمدؐ کے بعد مخلص مومن اور خالص دشمنِ خدا اور رسول اٹھائے جائیں گے دشمنانِ خدا کو سزائیں ملیں گی اور مومنین کو خوشی و سرور نصیب ہوگا۔ تفسیر برہان میں ہے کہ ابنِ کوا نے یہی مسئلہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کئی قومیں ایسی ہیں جن کو خدا نے اپنی اجلِ مقرر سے پہلے بوجہ ان کے گناہوں کے موت دے دی۔ اور پھر دوبارہ ان کو زندگی بھی دی تاکہ دنیا سے اپنا رزق پورا حاصل کرلیں، پھر بعد میں ان کو دوبارہ موت دی۔ ابنِ کوا نے جب یہ بات سنی تو اس کو گراں معلوم ہوئی اور سمجھ نہ سکا۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو تیرے اوپر کیا تجھے معلوم نہیں کہ خدا فرماتا ہے حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کرکے وعدہ گاہ پر لے گئے، تاکہ کلام خدا سن کر قوم کے سامنے موسیٰؑ کے کلیم اللہ ہونے کے دعویٰ کی تصدیق کریں۔ اگر وہ مان جاتے اور تصدیق کرلیتے تو ان کے لئے بہتر تھا لیکن انہوں نے موسیٰؑ کو کہا کہ جب تک اپنی آنکھوں سے خدا کو نہ دیکھیں گے نہ مانیں گے پس وہ صاعقہ کی زد میں آگئے، یعنی مرگئے۔ پھر خدا نے ان کو زندہ کیا۔ اے ابنِ کوا! کیا یہ لوگ دوبارہ زندہ ہوکر اپنے گھروں کو نہیں گئے تھے؟ اس نے کہا نہیں، جناب ان کو پھر خدا نے اسی جگہ موت دے دی تھی۔

آپ نے فرمایا: تیرے اوپر ویل ہو، خدا فرماتا ہے: ہم نے ان کے اوپر سایہ بادل کا کیا اور من سلوی نازل کیا اور یہ سب ان کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد قصہ ہے اور رجعت پر اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں اپنے اپنے مقام پر ان کا بیان ہوگا۔ (تفسیر انوار النجف، جلد۲، ص۱۱۲)

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ، آیت)

"جب ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس بستی میں پس کھاؤ اس سے جہاں چاہو داخل ہو سجدہ کرتے ہوۓ اور کہو حطّہ (معافی) بخشش دیں۔"

تفسیر عمدۃ البیان میں بعض کتب اہل سنت سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:

"علی علیہ السلام باب حطہ ہے، جو اس میں داخل ہوگا مومن ہوگا اور جو اس سے خارج ہوگا کافر ہوگا۔"

مراد اس سے علی علیہ السلام کی پیروی کرنا ہے یعنی علی علیہ السلام کا پیروکار مومن اور اس کی پیروی نہ کرنے والا کافر ہے۔ نیز مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

نَحْنُ بَابُ حِطَّتِكُمْ

"یعنی ہم تمہاری بخشش کا دروازہ ہیں۔"

اسی طرح تفسیر برہان میں عیاشی سے بھی منقول ہے۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس دروازہ سے بنی

اسرائیل کو جھک کر داخل ہونے کا حکم تھا، اس کے اوپر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کی مثالیں موجود تھیں اور ان کے سجدہ کرنے سے مراد ان کی تعظیم اور ان کی ولایت کے عہد کو تازہ کرنا تھا۔ اور جب انہوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا نے ان پر طاعون کا عذاب بھیجا، چنانچہ تھوڑے ہی وقت میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی موت کے سیلاب میں بہہ گئے۔ خداوند کریم ان بنی اسرائیل کے واقعات سے جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ کے بنی اسرائیل بلکہ جملہ مسلمانوں کو اطاعت کی دعوت دے رہا ہے، تاکہ یہ لوگ ان لوگوں کے واقعات سے نصیحت حاصل کر کے عذابِ خدا سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۲ ص ۱۱۵)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

"پھر تم وہی کرتے ہو ایک دوسرے کو اور نکال دیتے ہو ایک فریق اپنے کو اپنے گھروں سے درحالانکہ تم ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہو۔ ان کے خلاف ناجائز طور پر اور ظالمانہ انداز سے درگزر انھیں تمہارے پاس قیدی ہو کر تو ان کا قرینہ دیتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکالنا۔ کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب سے کرتے ہو بعض کے نہیں جزا اس

کی جو کرتے ہو کام تم میں سے ۔ اگر رسوائی زندگی دنیا مین اور روز قیامت وہ پھیر دیے جائیں گے۔ طرف سخت ترین عذاب ہے اور خدا غافل نہیں اس سے جو تم کرتے ہو۔" (البقرہ: آیت ۸۵)

تفسیر برہان میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد جب یہودیوں کے حالات سے خبر دی تو پھر فرمایا کہ میں اس امت میں سے تم کو ان لوگوں کا پتہ دوں جن کے افعال ان یہودیوں کے مشابہ ہوں گے؟

صحابہ نے عرض کی: ہاں یارسول اللہؐ! آپ نے فرمایا کہ میری امت سے ایسے لوگ ہوں گے جو میری امت کہلائیں گے اور میری ولایت کے فاضلوں کو اور میری نسل کے پاکیزہ افراد کو قتل کریں گے۔ اور میری سنت وشریعت کو تبدیل کردیں گے، میرے شہزادوں حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کو شہید کریں گے جس طرح ان یہودیوں کے اِسلاف نے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحیٰؑ علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔ ان پر بھی خدا کی لعنت ہوگی۔ جس طرح ان پر خدا کی لعنت ہے ان کی بقیہ اولادوں پر قیامت سے پہلے خداوند کریم حسین علیہ السلام مظلوم کی اولاد سے ہادی مہدیؑ کو بھیجے گا، جو اپنے دوستوں کی تلواروں سے انہیں موت کے گھاٹ اتار کر ان کو واصل جہنم کرے گا۔ آگاہ ہو جاؤ حسین علیہ السلام اور اس کے محبوں اور مددگاروں کے قاتلین پر اللہ کی لعنت ہے اور جو بلا تقیہ ان پر لعنت نہ کرے اس پر بھی خدا کی لعنت ہے اور اللہ کی رحمت ہوگی حسین علیہ السلام کے رونے والوں پر اور ان پر جو ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجیں اور ان پر غیظ وغصہ میں رہیں آگاہ ہو جاؤ! جو قاتلین حسین علیہ السلام پر راضی ہوگا اس کا شمار قاتلین میں سے ہوگا۔ نیز حسین علیہ السلام کے قاتل اور قاتلین کے

مددگار اور دوست اور ان کے مقتدی یہ سب اللہ کے دین سے بیزار ہیں۔ خداوند کریم ملائکہ مقربین کو حکم فرمائے گا کہ حسین علیہ السلام کی شہادت پر رونے والوں کے آنسو کو اٹھا کر کے خزانِ جنت کے حوالہ کر دیں پھر وہ ان کو آبِ حیات سے ملا دیں گے۔ جس سے اس کی شیرینی اور پاکیزگی ہزار گنا زیادہ ہو جائے گی (یہی رونے والوں کو انعام میں نصیب ہو گا) اور حسین علیہ السلام کے قتل پر خوش ہونے والوں کے آنسو کو ملائکہ اٹھا کر ہاویہ میں اس کے حمیم صدید غساق وغسلین سے ملائیں گی جس سے اس کی گرمی کی شدت ہو گی اور عذاب کی زیادتی ہزار گنا بڑھ جائے گی اور وہی اعداء آلِ محمدؐ کی بازگشت ہو گی۔ (تفسیر انوار النجف: جلد ۲، ص ۱۳۸)

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسٰى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (البقرہ)

"اور تحقیق آیا تمہارے پاس موسیٰؑ ساتھ معجزات کے، پھر پوجا تم نے گوسالہ اس کے پیچھے درحالیکہ تم ظلم کرنے والے تھے۔"

حضرت علیؑ کا قَسِیمُ الْجَنَّةِ وَالنَّار ہونا

تنزیل کے لحاظ سے یہ آیتیں گو بنی اسرائیل کو خطاب کر رہی ہیں لیکن ان کی تاویل قیامت تک کے لئے ہے۔ کیونکہ قرآن قیامت تک کے لئے ہے۔ تو پس معلوم ہوا کہ جو شخص کتب سماویہ میں سے ایک کا انکار کرے گویا اس نے سب کتابوں کا انکار کیا اسی طرح جو ایک نبی کا انکار کرے گویا وہ سب نبیوں کا منکر ہے اور جو ایک امام اور خلیفہ برحق کا منکر ہو گویا وہ تمام آئمہ وخلفائے برحق اور سب انبیاء وجملہ کتب سماویہ کا منکر ہے، چنانچہ انہی آیات کی تفسیر میں جناب امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کا ملخص ترجمہ یہ ہے کہ خدا نے خبر دی ہے کہ جو قرآن کو نہیں مانتا۔ اس کا تورات پر بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ خدا نے ان سے ہر دو پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا، پس ایک کے ساتھ ایمان بغیر دوسرے کے ناقابل قبول ہے۔ اسی طرح میری نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ خدا نے علی علیہ السلام کی ولایت پر ایمان لانا بھی فرض کیا ہے پس جو شخص میری نبوت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرے اور علیؑ کی ولایت کا کفر کرے تو گویا اس کا میری نبوت پر بھی ایمان نہیں ہے۔ بروزِ محشر جب تمام مخلوق جمع ہو گی تو منادی اللہ کی جانب سے ندا کرے گا تاکہ مخلوق میں سے مومن و کافر جدا جدا ہو جائیں پس ندا آئے گی۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور دوسری آواز آئے گی۔ اے خلقِ خدا! تم بھی اس کلمے کو دہراؤ تو دھریت کے قائل گونگے ہو جائیں گی۔ ان کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور علیحدہ ہو جائیں گے اور باقی تمام مخلوق یہ کلمہ اپنی زبانوں پر جاری کرے گی۔ پھر ندا آئے گی:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

تو مشرکین اور بت پرستوں کے سوا تمام لوگ یہ کلمہ زبان پر جاری کریں گے اور مشرکین اور بت پرستوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور وہ گونگے ہوں گے۔ پس یہ بھی علیحدہ ہو جائیں گے پھر ندا آئے گی۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

تو سوائے مسلمانوں کے باقی تمام لوگ اس کلمہ کے دہرانے سے گونگے اور زبان بستہ ہو جائیں گے اور جدا ہو جائیں گے، پس عرصہ محشر سے آواز آئے گی کہ اب ان اقرار کرنے والوں کو جنت میں لے جاؤ۔ تو آواز آئے گی:

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ

''یعنی ان کو ٹھہراؤ، کیونکہ ان سے ابھی پوچھنا ہے۔''

فرشتے عرض کریں گے: اے اللہ! یہ رسولؐ خدا کی نبوت کا اقرار کر چکے ہیں اب ان سے مزید سوال کون سا باقی ہے؟ تو آواز آئے گی:

وُقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْؤُلُوْنَ عَنْ وِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

یعنی ان کو کھڑا کرو، کیونکہ ان سے علی علیہ السلام اور آلِ محمدؐ کی ولا کا سوال باقی ہے۔ اگر اقرارِ ولا نہ ہوگا تو میری ربوبیت اور جناب رسولؐ کی نبوت کا اقرار ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا، کیونکہ میں نے ان پر یہ شہادت بھی فرض کی ہے پس جو اقرار کرے گا وہی ناجی ہوگا، اور جو نہ کرے گا وہ ناری ہوگا۔ بس بعض لوگ کہہ دیں گے کہ ہم علیؑ کی ولا کے قائل تھے اور آلِ محمدؐ کے محبّ تھے، حالانکہ وہ جھوٹ کہتے ہوں گے اور خیال کریں گے کہ ہم اس جھوٹ سے جان چھڑا لیں گے۔ پس کہا جائے گا کہ یہ فیصلہ علیؑ کی گواہی پر موقوف ہے۔ پس رسولؐ خدا نے فرمایا! یا علیؑ! تو آئے گا اور کہے گا کہ خود جنت میرے دوستوں کی گواہ ہے۔ اور جہنم میرے دشمنوں پر شاہد ہے۔ پس جس کا اقرارِ ولایت صحیح ہوگا نسیم جنت اس کو اٹھا کر محلاتِ بہشت میں داخل کر دے گی۔ جہاں اس کو کوئی تکلیف ورنج نہ پہنچے گا۔ اور جو اس اقرار میں جھوٹے ہوں گے سموم جہنم ان کو وہاں سے اٹھا کر نارِ جہنم میں گرا دے گی۔ پھر جناب رسول خداؐ نے فرمایا: یا علیؑ اسی لئے تو قَسِیْمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ ہے۔ تو جہنم سے خطاب کر کے کہے گا۔ هٰذَا لِیْ وَهٰذَا لَكِ۔ ''یہ میرا ہے اور وہ تیرا ہے۔''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنَ الْمُتَمَسِّكِیْنَ بِوَلَاءِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِیْنَ

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا: یعنی انہوں نے کانوں سے سنا اور عمل کے اعتبار سے اس کی نافرمانی پر کمر بستہ رہے یا یہ کہ منہ سے کہہ دیا کہ ہم نے سنا ہے اور دلوں میں ٹھان لی کہ اس کی نافرمانی کریں گے۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ: یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ جنت میں صرف ہم ہی جائیں گے اور جنت کا گھر ہمارے ہی لئے ہے تو خداوند کریم نے ان کے قول کی تردید فرمائی کہ اگر اس دعویٰ میں تم سچے ہو تو پھر بلا تامل موت کی خواہش کرو، تا کہ دنیاوی مصائب سے نجات حاصل کر کے اخروی انعامات ولذات حاصل کرو۔

حضرت امیر المومنین جنگِ صفین میں ایک باریک قمیص میں مصروف جہاد تھے تو ان کے شہزادے امام حسن علیہ السلام نے عرض کی: مولا! آپ ان باریک کپڑوں میں بغیر زرہ وغیرہ کے جہاد کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا بیٹا!

اِنَّ اَبَاكَ لَا يُبَالِىْ وَقَعَ عَلَى الْمَوْتِ اَوْ وَقَعَ الْمَوْتُ عَلَيْهِ

"یعنی تیرے باپ کو پرواہ نہیں کہ موت پر جا داخل ہو یا موت اس پر آ جائے۔"

ایک حدیث میں ہے جناب رسالت مآبؐ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص تکلیف سے گھبرا کر موت کی خواہش نہ کرے بلکہ دعا مانگنی چاہیے کہ میرے اللہ! اگر زندگی میں میری بہتری ہے تو مجھے زندہ رکھ اور اگر موت میرے لئے بھلی ہے تو مجھے موت دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ مصائب کے وقت بے صبری اور بے شکری سے کام نہ لے بلکہ ہر حال میں اللہ کی خوشنودی و رضامندی کو پیش پیش رکھے اور اس کی قضا پر راضی رہے۔ آیتِ مجیدہ میں یہودیوں کو خطاب ہے کہ اگر جنتی ہونے کے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی خواہش کرو لیکن اس کے بعد وہ خود فرماتا ہے کہ

یہودیوں کو دل دل میں چونکہ اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہے اور وہ آخرت میں اپنا نصیب جہنم سمجھتے ہیں لہٰذا یہ اور مشرکین چاہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی عمر ہزار ہزار سال ہو، تا کہ دنیا کی عیش جی بھر کر حاصل کریں، لیکن زندگی دنیاوی کتنی ہی دراز کیوں نہ ہو موت آنے کے بعد ان کا داخلہ یقیناً جہنم میں ہوگا اور یہ لمبی زندگی ان کو عذاب جہنم سے ہرگز نہ چھڑائے گی۔ تفسیر برہان میں اہل بیت سے مروی ہے کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کا معنی یہ ہے کہ اے گروہ یہود! اگر تم اپنے آپ کو جنتی اور ناجی سمجھتے ہو۔ اور مقرب بارگاہ خداوندی صرف تم ہی ہو تو خدا کی بارگاہ میں جھوٹوں کے ہلاک ہونے کی دعا مانگو اور کہو کہ خدا جھوٹے پر موت نازل کرے لیکن وہ ہرگز جھوٹے کے لئے موت کی تمنا نہ کریں گے، کیونکہ وہ اپنے کرتوتوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ جھوٹے اور ظالم ہم ہیں اور تفسیر مذکور میں امام حسن علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب یہودیوں پر اتمام حجت ہوئی تو ایک گروہ یہود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو۔ ان کے ایک رئیس کا حسین وجمیل نوجوان فرزند کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہو کر لا علاج ہو چکا تھا۔ آ کر عرض گزار ہوئے: اگر آپ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو اپنے بھائی علیؑ کو حکم دیجئے کہ وہ ہمارے اس مریض کے لئے تندرستی کی دعا مانگے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ نوجوان کی حالت بہت خراب تھی۔ آپ نے علی علیہ السلام سے فرمایا: اس کے لئے دعا مانگو۔ حضرت علی علیہ السلام نے دعا کی تو وہ نوجوان فوراً تندرست اور اپنی اصلی حالت میں پلٹ آیا۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ اس نوجوان کا باپ کہنے لگا کہ میرے بیٹے کے اسلام سے مجھے اس کی وہی بیماری محبوب تر تھی اور کہنے لگا: اے

محمدؐ! یہ تیری یا تیرے بھائی کی کوئی فضیلت نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے اس کی مصیبت کٹ چکی تھی لہٰذا وہ تندرست ہو گیا ہے۔ اگر تمہارا کوئی کمال ہے تو میرے لئے حضرت علی علیہ السلام بددعا کرے کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہو جاؤں۔ پس میں جان جاؤں گا کہ واقعی تمہاری دعا مقبول ہے۔ جناب رسول مآبؐ نے اس کو ہر چند سمجھایا کہ تندرستی اللہ کی نعمت ہے۔ اس کی بے قدری نہ کرو بلکہ اس کا شکر کرو۔ اس نے پھر اپنے اسی قول کو دہرایا تو حضرت نے فرمایا کہ اگر تو میرے بھائی علیؑ کی بددعا سے بیماری میں مبتلا ہو گیا تو کہے گا کہ اتفاق سے میری مصیبت لکھی تھی، لہٰذا یہ بددعا کا اثر نہیں ہے جیسا کہ تو نے اپنے فرزند کی تندرستی پر یہی کہا۔ یہودی نے کہا کہ ہرگز یہ نہ کہوں گا بلکہ آپ کی صداقت مان جاؤں گا۔ حضرت رسول خداؐ نے علی علیہ السلام کو فرمایا: یا علیؑ یہ کافر اپنی سرکشی اور قرد سے باز نہیں آتا لہٰذا اس کو اپنی بددعا کا مزہ چکھا پس حضرت علی علیہ السلام نے بددعا کی اور یہودی اسی بیماری میں مبتلا ہو گیا جس میں اس کا نوجوان فرزند پہلے مبتلا تھا۔ اس کے بعد وہ حضورؐ سے معافی مانگنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تیرے حق میں دعا کی جائے اور خدا تجھے معاف کر دے تو پہلے سے بھی زیادہ سرکش ہو جائے گا اور خدا تیرے دل کے حالات جانتا ہے۔ اگر تو اپنے فاسد خیالات سے صحیح معنوں میں تائب ہو جائے گا تو خدا تجھے ضرور معاف کر دے گا وہ جواد کریم ہے۔

(تفسیر انوار النجف: جلد ۲، ص ۱۴۳)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ط قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ
اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَتَجِدَنَّهُمْ
اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ
لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ
عَلٰى قَلْبِكَ

''اور جب ہم نے لیا تمہارا وعدہ اور بلند کیا ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور کو پکڑو اس چیز کو جو دی ہم نے تم کو طاقت سے اور سنو انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی اور داخل ہوگئی ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت بوجہ کفر کے۔ کہہ دو کہ بُری ہے وہ چیز جس کا امر کرتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ہو تو مومن کہہ دیجئے اگر ہے تمہارے لئے ہی قیامت کا گھر اللہ کے نزدیک صرف بغیر اور لوگوں کے پس خواہش کرو موت کی اگر تم سچے ہو اور ہرگز'' نہ خواہش کریں گے اس کی وجہ ان کے اعمال فاسدہ کے جو پہلے کر چکے ہیں اور اللہ جاننے والا ہے ظالموں کو اور البتہ پائے گا تو اُن کو زیادہ حریص لوگوں سے زندگی پر اور بعض مشرکین بھی (حتیٰ کہ) چاہتا ہے ان کا ہر ایک کہ عمر دیا جائے ہزار سال، حالانکہ نہیں چھڑانے والا عذاب سے، عمر کا دیا جانا اور خدا آگاہ ہے ان کے اعمال سے کہہ دیجئے جو ہو دشمن جبرئیل کا تو ہوا کرے کیوں کہ اس نے تو اُتارا ہے اس کو تیرے دل پر۔''

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ (بقرہ آیت ۱۳۰)

اس مقام پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے جملہ فضائل کا ذکر کرنا مطلوب نہیں ورنہ کتاب موضوع سے خارج ہو جائے گی۔ صرف مناسبت مقام کے لئے یہ حدیثیں کتب صحاح اہل سنت سے نقل کی ہیں جن کو فضل بن روز بہان جیسے متعصب نے بھی اپنی کتاب ابطال الباطل میں تسلیم کیا ہے۔ ہاں اسی مناسبت کی ایک اور حدیث بھی پیش کرتا ہوں جس کو مسند احمد بن حنبل سے علامہ نے نقل کیا ہے۔

اِنَّ النَّبِیَّ قَالَ مَنْ اٰذٰی عَلِیًّا فَقَدْ اٰذَانِیْ اَیُّهَا النَّاسُ مَنْ اٰذٰی عَلِیًّا بُعِثَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَهُوْدِیًّا اَوْ نَصْرَانِیًّا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے علی علیہ السلام کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ اے لوگو جو علی علیہ السلام کو اذیت دے گا وہ بروز محشر یہودی یا نصرانی ہو کر اٹھے گا۔ یہ حدیث دلائل الصدق میں متعدد کتب معتبرہ سے منقول ہے۔"

سابقہ روایات میں حضرت علی علیہ السلام کو حضرت ہارونؑ و حضرت یوشعؑ و حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی ہے اور آخری روایت میں حضرت علی علیہ السلام کے رنجیدہ کرنے والوں کو یہودی و نصرانی کہا گیا ہے اور اس سے قبل ایک روایت میں حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین کو امتِ محمدیہؐ کے یہودی کہا گیا ہے۔ اور یہ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے حضرت مہدی ظاہر ہو کر ان سے انتقام لیں گے۔ اور البرہان میں اَمْ تُرِیْدُوْنَ (الخ ۱۱)۔ رکوع نمبر ۱۳ کی تفسیر میں جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کے جلال، شیثؑ کی حکمت، ادریسؑ کی ...، نوح علیہ السلام

کے شکر و عبادت، ابراہیمؑ کی وفاء و خلت، موسیٰؑ کی دشمنانِ خدا سے عداوت اور عیسیٰ علیہ السلام کی مومنین سے حسنِ معاشرت سے تشبیہ دی ہے۔ حدیث اختصار کے پیشِ نظر ترک کر دی ہے۔

پس ان روایات و آثار سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ حضرت رسالت مآبؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے لے کر حضرت مہدیؑ تک کے بارہ امام جنابِ رسول خداؐ کے صحیح جانشین اور قائم مقام ہیں، جن کی مخالفت و عداوت کرنے والے اس امت کے یہودی ہیں۔

اور جس طرح بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ حضرت ہارونؑ سے کنارہ کشی کر کے سامری کی اطاعت میں گوسالہ پرست و مشرک ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام سے روگردانی اور غیر کی اطاعت اس امت کے لئے سامری کی اطاعت اور گوسالہ پرستی ہو گی۔

اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے وصی حضرت یوشع بن نونؑ خلیفہ برحق تھے اور ان کی اطاعت والا گروہ ہی ناجی اور باقی اکہتر جہنمی اور قابل نفرین تھے اسی طرح حضرت رسولِ خداؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام مثل یوشعؑ کے واجب الاتباع ہیں۔ اور انہی کی پیروی باعثِ نجات ہو گی اور اس کو چھوڑنے والے مستحق عذاب ہوں گے۔

جس طرح حضرت موسیٰؑ کے قائم مقام نبیوں کے قاتل جہنمی اور مستحق لعنت تھے، اسی طرح حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم مقام خلفاء معصومین علیہم السلام کے قاتل جہنمی اور مستحق لعنت ہیں۔ جس طرح گزشتہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنین شریفین علیہما السلام کے قاتلوں کو یہودی اور لعنتی کہا ہے۔

تفسیر برہان میں قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَلَيْسَتِ النَّصَارٰى کے تحت حضرت علی السلام سے منقول ہے:

فَهٰؤُلَاءِ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ نُصِبَ لَهُمْ بَابُ حِطَّةٍ وَاَنْتُمْ يَا مَعْشَرَ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ نُصِبَ لَكُمْ بَابُ حِطَّةٍ اَهْلِ بَيْتِ مُحَمَّدٍ وَاُمِرْتُمْ بِاتِّبَاعِ هُدَاهُمْ وَلُزُوْمِ طَرِيْقَتِهِمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ بِذٰلِكَ خَطَايَاكُمْ وَذُنُوْبَكُمْ وَلِيَزْدَادَ الْمُحْسِنُوْنَ مِنْكُمْ وَبَابُ حِطَّتِكُمْ اَفْضَلُ مِنْ بَابِ حِطَّتِهِمْ۔ (البرہان)

"ان بنی اسرائیل کے لئے بابِ حطہ نصب کیا گیا تھا اور اے گروہ امت محمدؐ تمہارے لئے اہل بیتِ محمدؐ بطور باب حطہ کے منسوب ہیں اور تمہیں انہی کی رہبری کے تحت اطاعت کرنے کا حکم ہے۔ اور ان کے طریقہ پر چلنے کا حکم ہے تاکہ ان کی بدولت خدا تمہارے قصور اور گناہ بخش دے اور تمہاری نیکیوں کی جزائے خیر میں اضافہ فرمائے اور نیز تمہارا باب حطہ ان کے باب حطہ سے افضل ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا اس قدر طویل ذکر قرآن مجید میں امت اسلامیہ کے لئے درس ہے، اگرچہ تنزیلی اور ظاہری طور پر مراد وہ ہیں لیکن تاویلی اور باطنی صورت میں مراد امتِ محمدیہؐ ہے اور بنی اسرائیل کے ذکر میں جہاں انبیاء اور ان کے اوصیاء کی اطاعت کا حکم اور اطاعت کرنے والوں کی مدح قرآن نے کی ہے، ان سب سے باطنی اور تاویلی طور پر محمدؐ وآل محمدؐ کی اطاعت کا حکم اور ان کی اطاعت کرنے والوں کی مدح ہے اور جہاں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور سرکشیوں کا ذکر اور ان کو غضب خدا کا مستحق کہا گیا ہے ان سے باطنی طور پر محمدؐ کے دشمنان مراد ہیں۔ اور وہی تا قیامت

غضب کے مستحق وسزاوار ہیں۔ اور قرآن قیامت تک زندہ ہے۔ لہٰذا یہی تاویل قیامت تک جاری رہے گی۔ اور خدا جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے۔"

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرہ)

"اے اولادِ یعقوبؑ! یاد کرو، میری اس نعمت کو جو میں نے انعام کیا تمہارے اوپر اور تحقیق میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کفایت کرے گا کوئی نفس کسی نفس سے کچھ بھی اور نہ قبول کیا جائے گا فدیہ اور نہ نفع مند ہوگی سفارش اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو اس کے رب نے ساتھ چند کلمات کے پس اس نے ان کو پورا کیا تو فرمایا کہ تحقیق میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی اور میری اولاد سے بھی فرمایا کہ میرا عہد (عہدہ نبوی وامامت) ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا۔"

ذکرِ امتحان ابراہیمؑ اور عہدۂ امامت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ: اگرچہ خداوند کریم نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تسلی دے دی کہ یہ لوگ جن کی نافرمانیوں اور احسان فراموشیوں کی اتنی طویل

فہرست گزر چکی ہے ہرگز آپ کی نبوت پر راضی نہ ہوں گے، جب تک آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ایسا کرنا آپ سے بعید ہے۔ لہٰذا اُن کے ایمان لانے کی توقع چھوڑیئے۔ گویا بنی اسرائیل پر یہ واضح کیا گیا کہ تمہارے ایمان کا نہ خدا محتاج ہے اور نہ جناب محمدؐ محتاج ہیں لیکن از راہ لطف و اتمام حجت پھر بنی اسرائیل کو نعمات کی یاد دلا کر ان کو راہِ حق پر گامزن ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

بِكَلِمٰتٍ: تفسیر مجمع البیان اور البرہان میں بروایت ابنِ بابویہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کلمات سے وہی کلمات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے حاصل کئے تھے اور ان کی توبہ قبول ہوئی تھی یعنی۔

يَارَبِّ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّعَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ اِلَّا تُبْتَ عَلَيَّ۔

راوی نے پوچھا کہ پھر فَاَتَمَّهُنَّ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے جو نو امام ہیں ان کو بھی ملا کر حضرت قائم علیہ السلام تک کل بارہ امام پورے کئے۔ راوی نے دریافت کیا:

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً فِيْ عَقِبِهٖ (پارہ: ۱۵ ع ۹)

میں کلمہ باقیہ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: امامت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں تا قیامت باقی رہے گی۔ پھر سائل کے جواب میں آپ نے فرمایا: جس طرح موسیٰؑ و ہارونؑ دونوں بھائی تھے لیکن نبوت ہارونؑ کی پشت میں رہی اور موسیٰؑ کی پشت میں نہ آئی لہٰذا خدا کے فعل پر کیوں کہنا درست نہیں۔

اور تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ بھی مروی ہے

کہ ابتلائے کلمات سے مراد حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کی جزا میں اور ان کی اطاعت کے ثواب میں خداوند کریم نے ارشاد فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اور پھر خداوند کریم نے ان پر کیفیت کو نازل فرمایا، اور وہ کل دس چیزیں ہیں۔ پانچ کا تعلق سر سے ہے، اور باقی پانچ بدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو پانچ سر میں ہیں وہ یہ ہیں:

① مونچھیں کترانا

② ڈاڑھی رکھنا

③ سر کے بالوں کی مانگ نکالنا

④ مسواک کرنا

⑤ خلال کرنا اور جو پانچ باقی بدن میں ہیں۔

وہ یہ ہیں:

① تمام بدن کے بال دور کرنا

② ختنہ کرنا

③ ناخن کٹوانا

④ غسلِ جنابت کرنا

⑤ پانی سے طہارت کرنا

پس حنیفیت طاہرہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ لائے یہ نہ منسوخ ہوئی ہے اور نہ قیامت تک منسوخ ہوگی اور اسی کے متعلق خدا فرماتا ہے: وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا : تفسیر البرہان میں بروایت کتب معتبر امامیہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: آپ نے فرمایا: خداوند کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی بنانے سے پہلے اپنا عبد بنایا اور پھر ان کو نبی بنایا۔ قبل رسول

بنانے کے، اور پھر رسول بنایا قبل خلیل بنانے کے اور پھر خلیل بنایا قبل درجہ امامت سپرد کرنے کے، جب پہلے تمام مراتب پر وہ فائز ہو چکے تب ارشاد فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۔ اور اس کے بعد امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جس کا مطلب یہ ہے کہ عہدۂ امامت کی عظمت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نیا اپنے سابق عہدوں کے لئے اپنی اولاد کے لئے دعا نہ مانگی لیکن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو فوراً اپنی اولاد کے لئے اسی عہدہ کو طلب کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ : خداوند کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو مستجاب فرمایا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تمام اولاد کے لئے امامت نہیں طلب کی تھی چنانچہ اپنی دعا میں یہ نہیں کہا تھا کہ اے پروردگار میری ساری اولاد کو عہدۂ امامت عطا فرمادے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ : کہا تھا اور من تبعیض کا ہے جس کا معنی ہوتا ہے یعنی اپنی اولاد کے بعض افراد کے لئے خواہش ظاہر کی تھی پس خدا نے قبول فرمائی اور اس فقرہ سے تنبیہ فرمادی کہ عہدۂ امامت ظالم کو نہیں پہنچ سکتا اور اہل سنت کے علامہ بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں اعتراف کیا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کو امامت کا عہدہ نہیں مل سکتا۔ پس یہ آیت نبوت و امامت کی عصمت کی واضح دلیل ہے۔ اور یہاں ظلم سے مراد ہر قسم کی خدا کی نافرمانی ہے۔ پس گناہ صغیرہ یا کبیرہ قبل بعثت یا بعد بعثت نبی و رسولؐ سے سرزد ہونا عقلاً باطل ہے۔ اور یہ آیت اس فیصلہ کی نقلی طور پر برہان قاطع ہے۔ ظالم کی لفظ عام ہے خواہ عہدہ ملنے کے وقت ظالم ہو یا اس سے پہلے کسی وقت ظالم رہ چکا ہو اور تمام ظلموں سے شرک بڑا ظلم ہے۔ خدا فرماتا ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

پس جو لوگ اپنی زندگی کے کسی دور میں مشرک وبت پرست رہ چکے ہوں یا کسی اور گناہ میں مبتلا رہ چکے ہوں۔ آیہ مجیدہ کی رو سے وہ ظالم ہیں اور عہدۂ امامت کے قطعاً لائق نہیں بلکہ اس عہدہ پر صرف وہی فائز ہو سکتا ہے جو ابتدائے عمر سے آخر تک تمام گناہوں سے بچا ہو اور معصوم ہو۔ اور جناب رسالت مآبؐ کے بعد وہ صرف اہلِ بیت محمدؐ ہی ہیں۔ چنانچہ صاحب عمدۃ البیان نے مناقب خوارزمی سے روایت نقل کی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ میری اولاد میں بھی امام بنا اور خداوند کریم نے ان کے جواب میں فرمایا کہ عہد میرا ظالموں کو نہیں پہنچتا تو اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی:

وَاجْعَلْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَعْبُدَ الْاَصْنَامَ

یعنی یکسو رکھ مجھے اے خدا اور میری اولاد کو اس سے کہ پرستش کریں ہم بتوں کی چنانچہ خدا نے میرے اور علی علیہ السلام کے حق میں ان کی دعا قبول کی اور مجھ کو نبی کیا اور علی علیہ السلام کو وصی کیا۔

اور برہان میں مناقب ابن مغازلی سے مروی ہے کہ عبداللہ بن مسعود کہتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا: میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہوں۔

میں نے عرض کی: یا رسول اللہؐ آپ کیسے اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہو گئے؟

آپ نے فرمایا: جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی کی کہ میں تجھے امام بناتا ہوں تو ابراہیم علیہ السلام بہت خوش ہوئے۔

پس عرض کی: میرے اللہ! میری اولاد سے بھی میری طرح امام بنانا تو جواب ملا

کہ میں ایک صورت میں تیری اولاد کو امامت کا عہدہ نہ دوں گا۔

پس انہوں نے عرض کی: وہ کون سی صورت ہے؟

فرمایا: وہ یہ کہ تیری اولاد میں سے ظالم کو یہ عہدہ نہ ملے گا۔

ابراہیمؑ نے پوچھا: میری اولاد میں سے ظالم کون ہوگا؟

جواب ملا: جو بت پرستی کرے گا اس کو کسی وقت بھی یہ عہد تفویض نہ کروں گا۔ اور وہ امام نہ ہو سکے گا۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی:

وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ

"اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا۔"

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

"اے رب انہوں (بتوں) نے بہت سوں کو گمراہ کر دیا۔"

پس اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میرے اور علی علیہ السلام کے حق میں ثابت ہوئی کیونکہ ہم نے کبھی بت پرستی نہیں کی پس خداوند کریم نے مجھے نبی بنایا اور علی علیہ السلام کو وصی یا (ولی) بنایا۔

(تفسیر انوار النجف: جلد ۲، ص ۱۶۸ تا ۱۷۲)

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (البقرہ: ۱۲۶)

اقول: حضرت ابراہیم علیہ السلام ہاجرہؑ کی خبر گیری کے لئے متعدد مرتبہ تشریف لاتے رہے لیکن جب ہاجرہؑ کا انتقال ہوا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے شادی کی اس بار ذرا دیر کے بعد آئے تھے لہٰذا گزشتہ روایات اور اس روایت میں کوئی منافات نہیں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ زمین کعبہ نے فخر کرتے ہوئے کہا کہ مجھ جیسا کون ہو سکتا ہے؟ حالانکہ خدا نے میری پشت پر کعبہ بنایا۔ ہر جانب سے لوگ میری زیارت کو آتے ہیں اور میں اللہ کا حرم اور جائے امن ہوں۔ پس خدا نے وحی فرمائی کہ خاموش رہ اور ٹھہر جا کیونکہ تیری فضیلت زمینِ کربلا کی فضیلت کے مقابلہ میں ایسی ہے جس طرح نوک سوزن کو سمندر میں ڈبونے کے بعد جو نسبت اس کی تری کو سمندر کے پانی سے ہوتی ہے۔ اور (اے زمین کعبہ) اگر زمین کربلا نہ ہوتی تو تجھے یہ فضیلت حاصل نہ ہوتی اور اگر وہ ہستی نہ ہوتی جو زمین کربلا کی مدفون ہے تو نہ میں تجھے پیدا کرتا اور نہ اس گھر کو پیدا کرتا جس پر تجھے فخر ہے، پس آرام کر اور تواضع اختیار کر۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۲، ص ۱۸۰)

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

"اور ہر صاحب ملت کے لئے ایک قبلہ ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا ہے پس نیکیوں کی طرف بڑھو تم جہاں بھی ہوگے سب کو خدا جمع کرے گا بلاشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور جہاں آپ باہر نکلیں (اسی جگہ سے) پھیر دیں۔"

احادیثِ ظہورِ قائم آلِ محمدؐ

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ: اس آیت کے متعدد معانی کئے گئے ہیں۔ ایک جو زیر آیت موجود ہے۔

② وِجۡهَةٌ کا معنی طریقہ یعنی ہر نبی اور صاحب ملت کے لئے ایک ہی طریقہ ہے جس پر وہ عامل رہا ہے اور وہ طریقہ اسلام ہے۔ اگرچہ وقتی مصالح کے لحاظ سے جزوی احکام میں فرق رہا ہے۔

③ هُــوَ کی ضمیر مرجع ذات خدا ہو یعنی ہر قوم کے لئے اپنا اپنا قبلہ ہے۔ لیکن خداوند کریم سب کو کعبہ کی طرف ہی رخ کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ سابق ادیان منسوخ ہو گئے ہیں۔

④ وِجۡهَةٌ کا معنی جہت یعنی ہر شخص اپنے اپنے مقام پر ایک نہ ایک جہت میں ہے۔ کوئی شرق میں ہے کوئی مغرب میں کوئی شمال میں کوئی جنوب میں لیکن خدا سب جہات والوں کو نمازوں میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اَیۡنَ مَاتَکُوۡنُوۡا: اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ تم جس جگہ بھی ہو بروز محشر خدا سب کو یکجا کر دے گا لیکن تفسیر اہلبیت علیہ السلام میں ہے کہ یہ آیت حضرت قائم آل محمدؐ کے ساتھ مختص ہے۔ چنانچہ مجمع البیان میں امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت قائم علیہ السلام کا ظہور ہو گا تو خدا ہر گوشہ دنیا سے ہمارے شیعوں کو ان کی طرف جمع کر دے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ظاہر کے لحاظ سے پہلا معنی مراد ہو، اور باطن کے اعتبار سے دوسرا معنی مراد ہو لہذا کوئی منافات نہیں ہے۔

تفسیر برہان میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت قائم کے اصحاب رات کو اپنے بستر پر سوئیں گے اور صبح کو مکہ میں موجود ہوں گے چنانچہ یہ آیت اسی چیز پر دلالت کرتی ہے:

اَیۡنَ مَاتَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا

"جہاں بھی ہو گے سب کو خدا جمع کرے گا۔"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت قائم علیہ السلام کی ندا سے تین سو تیرہ (313) آدمی فوراً آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور یہ لوگ ان کی فوج کے علمبردار یعنی نشانچی ہوں گے۔ ان میں بعض رات کو گھر سوئیں گے اور صبح کو ان کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوں گے اور بعض دن کو بادل پر سوار ہو کر حاضرِ خدمت ہوں گے۔ حضرت قائم علیہ السلام ان کے ناموں سے مع ولدیت کے واقف ہوں گے اور ان کا حسب و نسب بھی جانتے ہوں گے، پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت پڑھی۔

بروایت جعفر جعفی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ اصحاب قائم جو تین سو تیرہ (313) ہیں۔ آپ کے پاس بادل کے ٹکڑوں کی طرح فوراً اِدھر اُدھر سے جمع ہو جائیں گے۔ اور رکن و مقام کے درمیان (بیت اللہ) میں آپ کی بیعت کریں گے۔ آں جناب علیہ السلام کے پاس جناب رسالت مآب کا عہد نامہ ہوگا جو ورثہ میں آپ کو پہنچا ہوگا، پھر آپ نے بھی یہی آیت پڑھی یعنی:

۔۔ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا

بروایت ابو خالد کابلی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی بیعت کریں گے اور اس کے بعد (۳۱۳) آپ کے اصحاب بیعت کریں گے اور فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ کی تفسیر میں آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد ولایتِ اہل بیت علیہم السلام ہے۔

بروایت ابو بصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت قائم علیہ السلام کے اصحاب جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ سب ایک ماں باپ کے فرزند ہیں جو رات کو ایک دوسرے سے جدا ہو کر صبح کو

ملاقات کر رہے ہیں۔ اور آپ نے فرمایا کہ آیتِ مذکورہ کی تاویل یہی ہے اور فرمایا کہ حضرت قائم علیہ السلام ان کے شکموں اور پشتوں پر دستِ شفقت پھیریں گے جس سے وہ عالم ہو جائیں گے اور آپ کے دور سعادت میں پھر وہی نجیب، قاضی دین، حاکم وقت اور فقیہ ہوں گے۔

بحوالہ احتجاج حضرت شہزادہ عبدالعظیم حسنیؒ سے مروی ہے کہ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم میں سے ہر ایک قائم ہے لیکن وہ قائم جس کی بدولت خدا زمین کو کفر و الحاد سے پاک کرے گا اور عدل و انصاف سے پُر کرے گا اس کی ولادت لوگوں پر مخفی ہوگی۔ وہ خود غائب ہوں گے حتیٰ کہ ان کا نام لینا بھی درست نہ ہوگا۔ ان کا نام مبارک حضرت رسول خداؐ کے نام کی مثل ہوگا اور ان کی کنیت بھی وہی ہوگی جو رسول خداؐ کی تھی۔ ان کے لئے زمین لپٹ جائے گی اور ہر سخت ان کے سامنے نرم ہو جائے گا۔ اہل بدر کی تعداد میں ان کے صحابہ ہوں گے جو اطرافِ زمین سے ان کے پاس جمع ہوں گے اور خدا کا قول اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا انہی پر صادق ہے۔ جب یہ تعداد جمع ہو جائے گی تو وہ ظہور فرمائیں گے۔ اور جب تعداد دس ہزار تک پہنچے گی تو آپ باذنِ خدا مصروف جہاد ہوں گے اور دشمنانِ خدا کو تہ تیغ کریں گے۔

اس مقام پر احادیث کثرت سے وارد ہیں میں نے اختصار کے پیش نظر ترک کر دیے ہیں۔

اَقُولُ: حضرت قائم آلِ محمدؑ کا نام لینے کی ممانعت یا تو اس زمانہ کے اعتبار سے ہے جس زمانہ میں آپ غائب ہوئے تھے اور یہ امتناعی حکم غیبت کے معاملہ کی تاکید کے لئے ہے، کیونکہ اس زمانہ میں آپؑ کا نام لینا ان کے راز کو فاش کرنے کے مترادف تھا۔ اور پھر اس حکم کو مصلحتاً عام کر دیا گیا۔ ممکن ہے نام لینے کی ممانعت میں ان کا کمال

احترام مقصود ہو، کیونکہ جس کا احترام مقصود ہوتا ہے اس کو اس کے نام سے بلانا یا ویسے اس کا نام لینا خلاف ادب قرار دیا ہے، بلکہ محترم ہستیوں کو ہمیشہ القاب سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حجت علیہ السلام کو نام لینے کی بجائے ان کے لقب سے یاد کرنا چاہیے مثلاً ولی العصر علیہ السلام، صاحب الزمانؑ، حضرت حجت علیہ السلام یا قائم آل محمدؐ وغیرہ واللہ اعلم۔

دعائے ظہورِ حضرت حجت علیہ السلام

اَللّٰھُمَّ کُنْ لِوَلِیِّکَ الْحُجَّۃِ ابْنِ الْحَسَنِ صَلَوَاتُکَ عَلَیْہِ وَعَلٰی
آبَائِہٖ فِیْ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ وَفِیْ کُلِّ سَاعَۃٍ وَلِیًّا وَحَافِظًا وَّنَاصِرًا
وَّدَلِیْلًا وَّعَیْنًا حَتّٰی تُسْکِنَہٗ اَرْضَکَ طَوْعًا وَّتُمَتِّعَہٗ فِیْھَا
طَوِیْلًا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ (تفسیر انوار النجف جلد ۲، ص
۱۹۳)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ
الصّٰبِرِیْنَ ○ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ
اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ (البقرہ)

"اے ایمان والو! مدد طلب کرو (اللہ سے) ساتھ صبر اور نماز کے تحقیق اللہ ساتھ صابرین کے ہے اور نہ کہو ان کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔"

شہداء کی زندگی

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: تفسیر برہان میں بطریق مخالفین بروایتِ موفق بن احمد ابن عباس سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جس جس جگہ آیت کی ابتداء یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ہے تو اس کا رئیس و امیر حضرت علی

علیہ السلام ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس کا شریف وامیر حضرت علیؑ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فضیل کو فرمایا کہ جس جگہ تمہاری ہمارے موالیان سے ملاقات ہو، ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام بھی پہنچا دینا کہ میں اللہ کی طرف سے تمہاری کسی چیز کا ضامن و ذمہ دار نہیں ہوں، مگر پرہیزگاری اللہ تقویٰ کے ساتھ۔ پس اپنے ہاتھوں اور زبانوں کو قابو میں رکھو اور صبر و نماز کو لازم پکڑو، خدا صابرین کا ساتھی ہے۔

اور نیز ایک روایت میں یہاں صبر سے مراد روزہ ہے۔

بَلْ اَحْیَاءٌ: علامہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ شہداء حقیقۃً زندہ ہیں۔ اور اس کی تائید میں تہذیب الاحکام سے ایک روایت بھی انہوں نے نقل فرمائی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں یونس راوی کو فرمایا: اے یونس! خدا جب مومن کی روح کو قبض فرماتا ہے تو اس کو دنیاوی جسم کی طرح ایک جسم عنایت فرماتا ہے۔ پس مومنین وہاں کھاتے ہیں اور پیتے بھی ہیں اور کوئی مومن ان پر وارد ہوتا ہے تو اس کو اسی صورت سے پہچانتے ہیں جو اس کی دنیا میں تھی۔ ایک حدیث میں آپ نے ابوبصیر سے فرمایا کہ جنت میں مومنین کی صورتیں دنیاوی صورتوں کی طرح ہوں گی کہ اگر ان کو تو دیکھے تو پہچان لے کہ یہ فلاں آدمی ہے۔

ان روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہدا تو بجائے خود عام مومنین بھی مرنے کے بعد مردہ نہیں ہوا کرتے۔ پس آیتِ مجیدہ میں صرف راہ خدا میں شہید ہونے والوں کو زندہ کہنا ان کی عظمتِ شان کے لئے ہے اور اس سے ان کی افضلیت کا ظاہر کرنا مقصود ہے، ورنہ حدیث میں ہے:

مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا

''یعنی جو شخص آلِ محمدؐ کی محبت میں مرتا ہے وہ شہید مرتا ہے۔''

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مالوں کی کمی سے اور نفسوں کی کمی سے اور پھلوں (کی کمی سے) اور خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو، جن پر جب مصیبت آئے کوئی سی مصیبت تو کہیں تحقیق ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک اس طرف پلٹنے والے ہیں ان لوگوں پر صلوات ہے اپنے رب کی طرف سے اور رحمت اور وہ لوگ صحیح راہ پانے والے ہیں۔''

سوال: ہم ظاہر میں دیکھتے ہیں کہ جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہوتے ہیں یا بستر کی موت مرتے ہیں ان میں کوئی حس و حرکت نہیں ہوتی لہٰذا ان کا زندہ ہونا اور نعماتِ خداوندی سے بہرہ ور ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب: ان کی زندگی مثالی اجسام کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور روح ان مثالی اجسام کے ساتھ نعماتِ خداوندی سے ہم کنار ہوتی ہے جس طرح گزشتہ روایات میں صراحت مذکور ہے۔

2 یہ ضروری نہیں کہ اگر جسم ظاہری طور پر خاموش ہو تو واقع میں بھی وہ مردہ ہو، جس طرح سویا ہوا آدمی ظاہری صورت میں بالکل خاموش ہوتا ہے۔ اس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہوتی، حالانکہ درحقیقت وہ زندہ ہوا کرتا ہے اور خواب میں اطرافِ مملکت

کی سیر میں مشغول ہوا کرتا ہے اور لذات وسرور میں منہمک ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر والے بے خبر ہوا کرتے ہیں اور خود جاگنے کے بعد اپنی بیداری سے ناخوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ کاش میری نیند طویل ہوتی اور میں جی بھر کر لذات سے بہرہ ور ہوتا۔ پس اسی طرح مرنے والے مومنین یا راہِ خدا میں قتل ہونے والے شہداء گو ظاہری طور پر ہمارے سامنے ان کے اعضا خاموش ہوا کرتے ہیں۔ جن میں کوئی حس و حرکت نہیں ہوتی لیکن درحقیقت وہ نعماتِ خداوندی کے ساتھ لذت اندوز ہوا کرتے ہیں چنانچہ بعض احادیث میں ہے کہ اس کو کہا جاتا ہے:

نِمْ نَوْمَۃَ الْعَرُوْسِ۔

''اے مومن اب سو جا جس طرح تازہ شادی شدہ سوتے ہیں۔''

پس قبر کے سوال وجواب اور اور مومن کی جزا اور کافر کا عذاب جس طرح مذہب امامیہ کا اعتقاد ہے بالکل درست اور حق ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ: آیت مجیدہ کا ظاہر یہ ہے کہ خوف، بھوک، جانی و مالی نقصان اور ثمرات کا خسارہ (اس سے عام پھل مراد نہیں بلکہ اولاد مراد ہے کیونکہ عام پھلوں کا نقصان مالی نقصان میں آچکا ہے اور اولاد بھی انسان کا میوۂ دل ہوا کرتی ہے۔) ان سب چیزوں سے خداوند کریم مومنین کا امتحان کرتا ہے اور ان حالات پر صبر کرنے والوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔ اور ان پر اپنی صلوات ورحمت نازل فرماتا ہے۔

تفسیر بیضاوی میں جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ جب کسی انسان کا فرزند مر جائے تو خداوند کریم ملائکہ کو فرماتا ہے کہ کیا تم نے میرے بندے کے فرزند کا روح قبض کیا ہے؟ وہ جواب میں ہاں کہتے ہیں تو پھر ارشاد ہوتا ہے کہ کیا تم نے اس کے میوۂ دل کو توڑ لیا ہے؟ ملائکہ کہتے ہیں کہ ہاں! پھر خدا فرماتا ہے کہ اس میرے بندے

نے کیا کہا تھا؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ تیری حمد ادا کی تھی اور کلمہ اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا تھا۔ پس ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کا گھر جنت میں تعمیر کرو۔ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بطریق آباء طاہرین علیہم السلام جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے کہ جس شخص میں چار صفتیں پائی جائیں وہ خدا کے نور اعظم میں ہوا کرتا ہے۔

① اس کا تمسک شہادت توحید ورسالت سے ہو۔

② جب اس پر کوئی مصیبت آئے تو زبان پر اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کو جاری کرے۔

③ جب اس پر کوئی خدا کی نعمت ہو تو کلمہ حمد پڑھے۔

④ جب اس سے گناہ سرزد ہو تو اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ زبان پر جاری کرے۔

آیتِ مجیدہ کی یہ تفسیر ظاہری تھی لیکن باطنی تاویل کے متعلق آئمہ علیہم السلام سے منقول ہے کہ یہ چیزیں ظہور حضرت قائم آلِ محمد علیہ السلام سے ہیں، کیونکہ آں جناب علیہ السلام کا جب ظہور قریب ہوگا تو لوگوں میں خوف وبدامنی زیادہ ہوگی اور قحط سالی بھی ہوگی، جس سے بھوک عام اور مالی نقصان زیادہ ہوگا۔ وبائی امراض زیادہ ہوں گی جس سے جانی نقصان بہت ہوگا اور جو مومن ہوں گے وہ صبر سے کام لیں گے اور یہ بشارت ان لوگوں کے لئے ہے جو ان حالات کا صبر سے مقابلہ کریں گے۔

بعض تفاسیر میں ان کا باطنی مصداق حضرت امام حسین علیہ السلام کو قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ درست بھی ہے بلکہ ان آیات کا مصداق ان سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اور ہوا ہو کیونکہ آیت مجیدہ میں ہے بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ "یعنی ہم قدرے خوف اور قدرے

بھوک اور قدرے جانی مالی نقصان اور قدرے موت اولاد سے آزمائیں گے۔ اور صبر کرنے والوں کے لئے بشارتِ جنت بھی ہے اور ان پر اللہ کی صلوات ورحمت بھی ہے۔'' کیونکہ مِن تبعیض کے لئے ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے'' تھوڑا سا اور قدرے'' تعجب ان چیزوں کے تھوڑے سے اور قدرے نقصان پر صبر کرنے والوں کی یہ جزا ہے تو ان چیزوں کے زیادہ سے زیادہ نقصان پر صبر کرنے والوں کی جزا کا سوائے خدا کے اور کون اندازہ کر سکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام پر جس قدر مصائب آئے اس قدر مصائب کسی پر نہیں گزرے۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن دکھائی دیتے تھے۔ بھوک و پیاس کا یہ عالم تھا کہ دسویں محرم کی شب بچوں کو کہیں آرام نہ تھا پانی کے خالی جام اٹھا کر خیام کا طواف کرتے۔ رات گزاری۔ خشکی سے زبانیں تالو سے چمٹ گئی تھیں۔ مالی نقصان کی تو حد ہو گئی کہ مردوں کے قتل ہو جانے کے بعد دشمنوں نے گھروں کو آگ لگا دی۔ سامان لوٹ لیا۔ حتی کہ عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں۔ بچوں کے گوشوارے تک کانوں سے اتار لئے۔ جانی نقصان اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ششماہے شیرخوار سے لے کر بوڑھوں تک سب قتل ہو گئے اور انتہا یہ کہ ان کو بے غسل وکفن صحرائے کربلا کی تپتی ہوئی ریتی پر چھوڑ کر پردہ داروں کو ان کی لاشوں پر رونے تک نہ دیا گیا، باوجود ان تمام مصائب کے صبر کا یہ عالم تھا کہ آخر دم تک رضائے خدا کے سامنے سر تسلیم خم رہا اور جس قدر مصائب آئے زبان پر اُف تک نہ لائے اور شکر پروردگار آخر تک زبان پر جاری رہا اور مرد تو بجائے خود عورتوں اور بچوں نے بھی ان مصائب کا ایسا دلیرانہ مقابلہ کیا کہ رہتی دنیا تک فرزندان توحید کے لئے ان کا کردار صبر وحوصلہ اور عزم واستقلال مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا۔

سوال: جب مصائب پر صبر کرنا خاصان خدا کا طرہ امتیاز ہے تو ان کے مصائب پر گریہ وزاری کرنا کیونکر جائز ہے پس چاہیے کہ مصائب پر گریہ بھی نہ کیا جائے؟

جواب: مصائب پر گریہ کرنا فطری چیز ہے، البتہ یہ ضروری چیز ہے کہ گریہ میں رضائے خدا کے خلاف کوئی مظاہرہ نہ ہو نہ زبان سے حرف شکایت نکلے اور نہ عمل سے اس قسم کا اظہار ہو۔ صبر کا معنی ہے حدود شرعیہ کے اندر اپنے قول وفعل کو محدود رکھنا اور بے صبری کا مطلب ہے حدود خدا کو توڑ کر باہر چلا جانا۔ خدا کی خوشنودی کے پیش نظر خاصان خدا کے فراق میں رونا، خاصانِ خدا سے محبت کی دلیل ہے اور بے صبری نہیں بلکہ قرب خداوندی کا پیش خیمہ ہے اور اگر یہ رونا بے صبری ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے فراق میں رو کر آنکھیں کھو بیٹھنے کے بعد حلیم نہ کہا جاتا۔ اور حضرت رسول خداؐ نے حضرت حمزہؑ کا ماتم اپنے گھر میں خود نہ بپا کرایا ہوتا۔ شیعہ کا مصائب شہداء پر گریہ خدا کی ناسپاسی اور بے شکری نہیں بلکہ ان کے مصائب پر رونا امت رسولؐ کی بے قدری و بے دردی کا رونا ہے کہ ایسے محسنان اسلام کو انہوں نے احسان کا یہ بدلہ دیا۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ: انہی مصائب پر صبر کرنے والوں پر خدا کی طرف سے درود ورحمت ہے۔ اور وہی ہیں ہدایت پانے والے۔ علامہ حلی قدس سرہ نے ایک مناظرہ میں اہل بیت اطہار پر درود وسلام ثابت کرنے کے لئے انہی آیات سے استدلال فرمایا تھا۔ اس مقام پر ان کا واقعہ گو موضوع بحث سے باہر ہے لیکن اختصار سے ذکر کرتا ہوں امید ہے مومنین کے لئے استفادہ کا موجب ہوگا۔

شیخ عباس قمی اعلی اللہ مقامہ، نے سفینۃ البحار باب الشین میں مستدرک سے

اختصار انقل فرمایا ہے جس کو میں اور مختصر کرتا ہوں تا کہ طول نہ ہو۔

ہلاکو خان کے پوتے کا بیٹا یعنی پڑپوتا سلطان غازان خان جو ۷۰۲ھ میں بغداد کا بادشاہ تھا۔ اس کے دور سلطنت میں ایک دفعہ بروز جمعہ ایک سید نے بغداد کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد انفرادی طور پر نماز ظہر پڑھی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ شیعہ ہے۔ پس انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ سید مرحوم کے رشتہ داروں نے بادشاہ سے شکایت کی اور واقعہ بیان کیا۔ بادشاہ کو بڑا رنج ہوا کہ اولا د رسول میں سے ایک شخص صرف نماز ظہر علیحدہ پڑھنے کے جرم میں کیوں قتل کیا گیا۔ بادشاہ کو اس وقت مذاہب اسلامیہ کی حقیقت کا علم نہ تھا پس اس نے اس دن سے مذہب کی تلاش شروع کر دی۔ امیر طرمطار جو بادشاہ کے خواص میں سے تھا اور بچپنے سے بادشاہ کا خادم تھا اس نے بادشاہ کے سامنے مذہب شیعہ کی حقیقت بیان کی۔ چنانچہ بادشاہ نے دیگر مذاہب کو ترک کر شیعیت کو اپنا لیا اور اس کے بعد اس نے سادات کے احترام میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے مشاہد کی بھی تعمیر کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد مسروف شاہ خدا بندہ تخت نشین ہوا، اور وہ حنفی المذہب اور حنفی علماء کا احترام کرتا تھا جو اپنے مذہب میں متعصب تھے۔ بادشاہ کا وزیر خواجہ رشید الدین شافعی بہت کڑھتا تھا لیکن بادشاہ کے میلان کی وجہ سے بے بس تھا یہاں تک کہ قاضی نظام الدین شافعی جو منقولات و معقولات میں بہت ماہر تھا۔ مراغہ سے چل کر یہاں آیا۔ بادشاہ نے اس کے علم کے پیش نظر اس کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ وہ بادشاہ کے سامنے حنفی علماء سے مناظرے کرتا تھا اور ان کو لاجواب کر دیتا تھا حتی کہ بادشاہ نے مذہب حنفی ترک کر کے مذہب شافعی اختیار کر لیا۔ ۷۰۹ھ میں بخارا سے ایک حنفی عالم ابن صدر جہاں بغداد پہنچا تو مقامی علماء نے نظام الدین قاضی کی اس سے شکایت کی۔ اس

نے اس مشکل کے حل کرنے کا ان سے وعدہ کیا، پس بروز جمعہ بادشاہ کے حضور میں اس نے قاضی نظام الدین سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ اگر ایک شخص کسی عورت سے زنا کرے اور اسی زنا سے لڑکی پیدا ہو کیا وہ لڑکی اس زانی کے نکاح میں آسکتی ہے بمطابق مذہب شافعی جواب دیجئے؟ قاضی نے جواب دیا کہ ہاں بے شک آسکتی ہے جس طرح کہ مذہب حنفیہ میں ماں بہن نکاح میں آسکتی ہیں اس بحث میں بڑی لے دے ہوئی۔ ابن صدر جہان حنفی نے اس مسئلہ کا انکار کر دیا تو قاضی نے امام ابو حنیفہ کے منظومہ میں سے یہ شعر پڑھا ؎

وَلَیْسَ فِیْ لِوَاطِۃٍ مِنْ حَدٍّ
وَلَا بِوَطِیِ الْاُخْتِ بَعْدَ عَقْدِ

پس وہ خاموش ہو گیا۔ بادشاہ اور دیگر امراء اس بحث کے نتیجہ میں بہت نادم ہوئے اور بادشاہ غضبناک ہو کر اٹھ گیا۔ اور مذہب اسلام کے اختیار کرنے پر پشیمان ہوا کہ یہ عجیب مذہب ہے کہ کوئی لڑکی کے نکاح کے جواز کا قائل ہے اور کوئی ماں بہن کے نکاح کو جائز کہتا ہے۔

اَقُولُ: حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر مناظرین اپنے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا اپنی کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں اور اس قسم کے لوگ ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں مذہب کی حمایت کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ مذہب کے بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرے کو گالی دینا معیار صداقت نہیں ہوتا بلکہ دلیل و برہان اور عمل و کردار سے مذہب کے اصول و فروع کی نقاب کی کشائی ہی صداقت کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر طرمطار نے جب یہ ماجرا دیکھا تو بادشاہ کو مذہب شیعہ کی حقیقت معلوم

کرنے کی دعوت دی۔ بادشاہ شیعہ کی لفظ سن کر نہایت غیظ وغضب سے تلملا اٹھا کہ او بد بخت تو مجھے رافضی بنانا چاہتا ہے۔

اَقُولُ: موجودہ درباری علماء نے مذہب شیعہ کو بادشاہ کے سامنے ایک ایسے برے رنگ میں ظاہر کیا ہوا تھا کہ بادشاہ شیعہ کا نام سن کر آگ بگولہ ہو گیا چنانچہ آج کل بھی ناواقف لوگوں کے سامنے شیعہ مذہب کی حقیقت وصورت ایسے ہی بدنما خدوخال سے پیش کی جاتی ہے کہ لوگ فریب خوردہ ہو کر شیعہ کے نام سے ہی نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

آخر کار امیر طرمطار کے اصرار سے بادشاہ نے علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے فرزند فخر المحققین کو دعوت دے دی۔ علامہ کے پاس اپنی تصنیفات میں سے نہج الحق اور منہاج الکرامۃ موجود تھیں جو بادشاہ کو ہدیہ کے طور پر پیش کیں۔ علامہ سے مناظرہ کرنے کے لئے قاضی نظام الدین شافعی کا انتخاب عمل میں آیا۔ دربار شاہی میں علمائے اسلام کے بھرے مجمع میں علامہ موصوف نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے خلافت بلافصل کو براہین قاطعہ اور دلائل ساطعہ سے ثابت فرمایا کہ قاضی مذکور کو رد کرنے کی جرات نہ ہو سکی اور اس کے لئے بغیر تسلیم کے اور کوئی چارہ نہ رہا اور آخر کار یہی عذر پیش کیا کہ ابتدائے اسلام سے آج تک جن لوگوں کو ہم خلیفہ رسول مانتے چلے آ رہے ہیں ان کی خلافت کا انکار اسلام میں تفرقہ ڈالنے کا موجب ہے۔ لہٰذا ہم نہ ان پر طعن کر سکتے ہیں اور نہ ان کی غلطیوں کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ پس قاضی کا دبی زبان سے خلفائے ثلثہ کی خلافت سے انکار مناظرے کا فیصلہ تھا۔ فوراً ہی بادشاہ اور اکثر امراء نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ بادشاہ نے خطبہ جمعہ میں خلفائے ثلثہ کے ناموں کی بجائے آئمہ اثنا عشر کے اسمائے طاہرہ کے ذکر کا اطراف مملکت میں حکم بھیج دیا۔ اس کے بعد علامہ نے

نہایت فصیح و بلیغ تقریر فرمائی جس میں حمد و ثنا کے بعد محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود و اسلام بھیجا۔ سید رکن الدین موصلی جو علامہ کی کامیابی اور مذہب شیعہ کی فتح پر دل سے جل رہا تھا اور علامہ پر نکتہ چینی کا بہانہ تلاش کر رہا تھا اس نے اٹھ کر فوراً اعتراض کیا کہ غیر نبی پر صلوات کہاں سے جائز ہے؟ علامہ قدس سرہ نے قرآن مجید کی یہی آیات تلاوت فرمائیں کہ جن لوگوں پر مصائب آئے اور راہ خدا میں خوشنودی خدا کے پیش نظر ان کو برداشت کر کے صبر کیا۔ ان پر خدا کی طرف سے صلوٰت و رحمت ہے اور وہی ہدایت والے ہیں۔ سید موصلی نے اعتراض کیا کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد پر کیا مصیبت آئی؟ علامہ نے اس کے بعد مصائب اہل بیت کا ذکر کیا اور آخر میں فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور مصیبت کیا ہوگی کہ تو ان کی اولاد سے کہلواتا ہے اور ان کے مخالفین کے نقش قدم پر چل کر ان کو اہل بیت علیہم السلام سے افضل مانتا ہے؟ حاضرین نے علامہ کا جواب پسند کیا اور وہ شرمندہ ہوا۔

اِنَّ الصَّفَا : کوہ صفا کو صفا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس پر حضرت آدم صفی اللہ اُترے تھے اور مروہ کو مروہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس پر حضرت حواؑ اُتری تھیں اور یہ مراۃ سے مشتق ہے جس کا معنی عورت ہے۔ (تفسیر النجف: جلد ۲، ص ۱۹۶ تا ۲۰۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ

''اور بعض وہ لوگ ہیں جو اختیار کرتے ہیں خدا کے علاوہ شریک جن

سے وہ محبت کرتے ہیں جس طرح کہ اللہ سے محبت کرنی چاہیے اور
ایمان والے پکے محبّ ہیں خدا کے اور کیا اچھا ہوتا کہ سمجھ لیتے (ظالم)
مشرک جب کہ دیکھتے عذاب کو کہ تحقیق طاقت سب اللہ کے لئے ہے اور
تحقیق اللہ سخت عذاب دینے والا ہے قیامت میں جب کہ بیزار ہوں گے
وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی پیروی کرنے والوں سے اور عذاب کو دیکھ
لیں گے اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات اور کہیں گے پیروی کرنے
والے کاش! ہمیں ایک بار پلٹنا۔"

وَمِنَ النَّاسِ : اس آیت کا ظاہر تو مشرکین کے لئے ہے جو غیر اللہ سے اللہ جیسی محبت و اطاعت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کا باطن ہر باطل پرست کے لئے ہے، چنانچہ جابر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا: خدا کی قسم کہ اس سے مراد فلاں وفلاں کے دوست ہیں جنھوں نے ان کو امام تسلیم کیا اور اس امام کو چھوڑ دیا جس کو خدا نے عہدۂ امامت عطا فرمایا تھا۔ جس کے بعد آپ نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی اور آخر میں فرمایا: اے جابرؓ! خدا کی قسم اس سے ظالم امام اور ان کے پیروکار مراد ہیں۔ (برہان)

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِيْنَ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ بروز محشر حق سبحانہ، کی جانب سے ندا آئے گی: اَيْنَ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ (کہاں ہے وہ جس کو اللہ نے زمین پر عہدۂ خلافت عطا فرمایا تھا) پس حضرت امیر المومنین علیہ السلام کھڑے ہوں گے، پھر اللہ کی جانب سے ندا آئے گی کہ اے گروہِ مخلوق یہ علی بن ابی طالب زمین پر اللہ کا خلیفہ اور بندوں پر خدا کی حجت موجود ہے، پس جس کسی نے دنیا میں اس سے تمسک پکڑا تھا وہ اب بھی اس کے دامن سے وابستہ ہو

جائے اور اس کی نورانیت سے فیض یاب ہو کر جنت کے بلند درجات کی طرف اس کے پیچھے پیچھے چلا جائے۔ پس وہ لوگ جنھوں نے دنیا میں ان کا دامن پکڑا ہوگا ان کے پیچھے پیچھے جنت کی طرف چلیں گے اس کے بعد دوسری ندا آئے گی کہ دنیا میں جس شخص نے جس امام کی پیروی کی تھی وہ اس کے پیچھے ہو جائے۔ جہاں اس کا امام جائے گا اس کو بھی وہاں جانا پڑے گا۔ پس اس وقت لوگ اپنے اپنے اماموں سے بیزار ہوں گے اور کہیں گے کاش! ہمارے لئے ایک دفعہ دنیا کی طرف پلٹنے کی اجازت ہوتی تو ہرگز ان کے پیچھے نہ چلتے ان آیات میں خدا انہیں تذکرہ فرمارہا ہے۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۲، ص ۲۰۷، پارہ ۲)

اہمیت دینی مدارس

ایک حدیث میں مروی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عالم یا طالب علم کی اعانت کرے خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو۔حتی کہ اگرچہ وہ قلم شکستہ سے ہی ہو تو اس کا ثواب اتنا ہے کہ گویا اس نے ستر مرتبہ بیت اللہ کی تعمیر کی ہے۔

اَقُــولُ: کعبہ اپنے مقام پر ایک بابرکت مقام ہے جو شخص وہاں جا کر اپنے گناہوں سے تائب ہو اور اللہ کے سامنے جھک جائے تو خداوند کریم اس مبارک مکان کی وجہ سے اس کے گناہ معاف فرماتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کرتا ہے۔لیکن اہل علم کی امداد علماء اور طالبان علم کو طلب معاش سے بے نیاز کر کے ان کو خدمت علوم کا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیتی ہے۔اور معاشی افکار سے فارغ ہو کر وہ علم کی طرف زیادہ توجہ صرف کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔پس ان میں سے ہر ایک اپنی نجات کے علاوہ ہزاروں افراد کے لئے آتشِ جہنم سے آزادی کا موجب بنتا ہے۔کیونکہ اگر علماء کا وجود نہ ہو تو کعبہ کی پہچان نہ ہوگی، اور نجات کے لئے صرف کعبہ کا وجود کافی نہیں بلکہ معرفت بھی ضروری ہے۔اور یہ چیز باخبر علمائے کرام کے دستیاب نہیں ہو سکتی۔اسی بنا پر حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ کعبہ کے ظاہری وجود کی تعمیر سے علوم شرعیہ کی تعمیر میں کم از کم خرچ بھی ستر گناہ زیادہ ثواب کا موجب ہے۔

پس معلوم ہوا کہ دینی تعمیری کاموں میں سب سے زیادہ اہم مدارس دینیہ کا قیام

وبقا ہے، صرف تقاریر اور ہاؤ ہو پر پیسہ اُڑانا اتنا مفید نہیں ہے جتنا کہ مدارس دینیہ کا اہتمام مفید وکارآمد ہے، بلکہ ہر قوم کی قومی ومذہبی زندگی کی بقا کا زیادہ تر انحصار ان ادارہ ہائے دینیہ کے استحکام پر ہے جن میں قومی ومذہبی احساس وشعور کی خفتگی وغفلت کے دور کرنے کے انتظامات موجود ہوں اور وہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ قوم میں دینی مدارس کی بہتات وکثرت ہو۔ اور ہونہار بچوں کو وہاں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے سہولتیں میسر ہوں تاکہ وہ بچے وہاں سے فارغ ہوکر اپنے اپنے قبیلہ میں عوام کے سامنے علمی وعملی طور پر اچھا کردار پیش کرسکیں اور ظاہر ہے کہ قومیں علمی طاقت سے دنیا پر چھا سکتی ہیں اور علمی انحطاط ہی اقوام کی تذلیل کا موجب ہوتا ہے۔

قوم شیعہ عالم ہستی میں وہ ممتاز ترین قوم ہے جن کی نشان راہ پر اقوام دنیا نے گامزن ہوکر مقصود تک رسائی کے منازل طے کئے۔ یہ وہ قوم ہے جن کے آفتاب علم کی روشنی میں ہر دور کے صاحبانِ ذوق نے علوم مختلفہ میں سیر کی راہ پائی اور یہی وہ قوم ہے جس کی ایثار شعاری اور حق کوشی اقوام عالم میں زبان زد عوام وخواص رہی۔ اسی قوم کی بے لوث قربانیوں نے طاغوتی واستبدادی نظریات کو صفحہ دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ اسی قوم نے صداقت وثبات قدم کے بل بوتے پر ظلم وجور کی آہنی چٹانوں سے ٹکرا کر ان کو خاکستر کا ڈھیر بنا دیا۔ اسی قوم کے صبر واستقلال اور بلند حوصلگی نے ہمیشہ سے قصرِ باطل کی بنیادیں کھوکھلی کردیں۔ اسی قوم کی پرسکون وباوقار عملی وعلمی زندگی نے انسانیت کی پیشانی سے غلط کردار کے ظلمانی وبدنما داغ دھوڈالے۔

لیکن نہایت مقام افسوس ہے کہ آج قوم شیعہ علوم ومعارف کے میدان میں باقی اقوام سے پیچھے ہٹتی جارہی ہے اور جادۂ حق سے دن بدن ان کے قدم سرکتے جارہے ہیں جس کے نتیجہ میں غیر قومیں ان کے علم وعمل کا جائزہ لے کر ماضی اور حال کی

تاریخ وحالات سامنے رکھ کر ہرگز یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتیں کہ یہ وہی قوم ہے جو کسی زمانہ میں شیعہ کے مقدس نام سے موسوم تھی۔

بدقسمتی سے اس قوم میں بعض ایسے جہلا بھی پیدا ہو گئے ہیں جو ترویج علوم آل محمد کے خلاف لسانی وقلمی اور عملی محاذ قائم کئے ہوئے ہیں اور اسی قسم کے سرپھرے لوگوں کو بعض نااہل بڑے وقیع ووزنی خطابات سے موسوم کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جس سے ان کی فرعونیت جوش میں آکر خدا والوں کے کچلنے کی بے سود تدبیریں سوچتی ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ حق کی آواز باطل کی سینہ زوریوں، غلط بیانیوں اور حیلہ سازیوں سے کبھی دب نہیں سکتی۔ خدا جب چاہتا ہے اس قسم کے اعداء دین پر اخروی عذاب سے پہلے دنیاوی عذاب بھیج دیتا ہے اگر وہ توبہ کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مراکز علمیہ اور اہل علم کے خلاف ہنگامہ آرائی صدائے صحرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اللہ حق کا خود پاسبان ہے۔

اس قسم کا مفسدانہ رویہ ہمیشہ رہا ہے۔ شیطنت حق سے ہمیشہ برسرپیکار رہی ہے لیکن ہمیشہ حق کا بول بالا رہا اور باطل کا منہ کالا، ایمان والوں کو کسی صورت میں بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے، بلکہ میدانِ عمل میں سینہ تن کر مردانہ وار ڈٹ جانا جوانمردی کا شیوہ ہے۔ اگر یہ قوم میدان سیاست میں گامزن ہو کر قائداعظم پیدا کر سکتی ہے تو میدان علم وعمل میں بڑھ کر علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ محقق شیخ طوسیؒ، شیخ مفیدؒ وغیرہ جیسی ہستیاں کیوں نہیں پیدا کر سکتی؟ بے شک ہمارے ملک کی مٹی بڑی مردم خیز ہے۔ اس کی کوکھ سے بڑے بڑے فلاسفر ومفکر لوگوں نے جنم لیا ہے۔

پس اگر عراق وایران کی زمین مجتہد پیدا کر سکتی ہے تو پاکستان کی زمین کے لئے کون سی چیز مانع ہے؟

صاحبان دولت وثروت اور ارباب سیم وزر تھوڑی سی توجہ کر کے اسی خواب پریشان کو شرمندہ تعبیر کر کے اسے نا قابل انکار حقیقت بنا سکتے ہیں۔ اپنی گرہ سے پیسہ خرچ کرنے کے عادی صرف اپنی کثرت کے بل بوتے پر ملک بھر کے گوشہ گوشہ میں علمی مراکز قائم کر سکتے ہیں تو اپنی جیب سے ہزاروں روپیہ حسینی مشن پر قربان کرنے والے اپنی صداقت کی بنا پر علوم آل محمدؐ کی ترویج کا ملک بھر کے ہر زاویہ میں انتظام کیوں نہیں کر سکتے؟ بے شک وہ ایسا کر سکتے ہیں اور انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔

اس وقت میں آیت زیر بحث (آیتِ وصیت) کی طرف اپنی آخرت وقیامت کے سنوارنے والوں کو متوجہ کرتا ہوں۔ یہی مال ودولت یہی سیم وزر اگر انسان چھوڑ کر مرجائے تو مرنے والے کے وارث خواہ وہ پیسہ نیکی پر خرچ کریں یا برائی پر ہر صورت میں مرنے والے کے لئے بروز محشر باعثِ حسرت ہوگی، کیونکہ اگر نیکی پر خرچ کریں گے تو قیامت کے دن ان کی جزا کو دیکھ کر افسوس کرے گا کہ کاش میں نے اگر اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں خرچ کیے ہوتے تو اس جزا سے محروم کیوں ہوتا؟ اور اگر وہ برائی پر خرچ کریں گے تو اس کے لئے بھی وبال میں زیادتی ہوگی کہ اس کا موجب یہی پیسہ ہوا ہے جو اس نے چھوڑا تھا۔ پس کفِ افسوس ملے گا لیکن اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی مضمون کی روایت منقول ہے۔

(تفسیر النجف: جلد ۲، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (البقرہ آیت ۱۸۹)

"اور یہ نیکی بس نہیں کہ تم گھروں میں آؤ پیچھے سے لیکن نیکی اس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور آؤ گھروں میں دروازوں سے اور اللہ سے ڈرو

تا کہ فلاح پاؤ۔"

لَیْسَ الْبِرُّ اس کے معنی میں کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں:

① عرب لوگ احرام کے زمانے میں اپنے گھروں کے اندر دروازوں کی بجائے پیچھے کی طرف سے دیواروں میں نقب لگا کر آمدورفت کرتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا یہی دستور تھا۔ پس یہ آیت اتری کہ نیکی کا معیار یہ نہیں ہے جیسے تم نے سمجھا ہوا ہے بلکہ نیکی تقویٰ کا نام ہے کہ تمام امور کی بجا آوری صحیح طریقہ سے ہو۔

② بیوت سے مراد امور ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ہر کام کو الٹے طریقے سے کرنا خوبی کی بات نہیں بلکہ خوبی واچھائی اس میں ہے۔

③ مراد یہ ہے کہ نا اہل سے اچھائی کی امید رکھنا اچھا نہیں، بلکہ معروف کی امید۔

آل محمدؐ ابواب اللہ ہیں

وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا :مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آل محمدؐ اللہ کے ابواب جنت کی طرف بلانے والے اور قیامت تک رہبری کرنے والے ہیں۔

اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:

اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا وَلَا تُؤْتَی الْمَدِیْنَةُ اِلَّا مِنْ بَابِهَا

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے اور شہر میں دروازہ سے داخل ہوا جاتا ہے۔"

اور بروایتِ ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اوصیاء

اللہ کے وہ دروازے ہیں جن سے آنے کا حکم ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو اللہ کی معرفت نہ حاصل کی جاسکتی اور انہی کے ذریعہ سے خدا نے مخلوق پر حجت تمام فرمائی ہے۔

اسود بن سعید سے مروی ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس حاضر تھا کہ میرے پوچھے بغیر آپ نے ارشادات عالیہ کو یوں زبان سے جاری فرمایا:

نَحْنُ حُجَّةُ اللّٰهِ وَبَابُ اللّٰهِ وَنَحْنُ لِسَانُ اللّٰهِ وَنَحْنُ وَجْهُ اللّٰه وَنَحْنُ عَيْنُ اللّٰهِ وَنَحْنُ وُلَاةُ اَمْرِ اللّٰهِ فِيْ عِبَادِهٖ

''ہم حجت اللہ، باب اللہ، لسان اللہ، وجہ اللہ، اور عین اللہ ہیں اور ہم اللہ کے بندوں میں اولی الامر ہیں۔''

احتجاج طبری سے منقول ہے کہ اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن کوا آیا، اور اس نے آنجناب سے اسی آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا: وہ گھر ہم ہیں جن کے دروازوں سے آنے کا حکم ہے۔ ہم اللہ کا دروازہ ہیں اور وہ گھر ہیں جن میں آنے کا حکم ہے۔ پس جس نے ہماری بیعت کی اور ہماری ولایت کا اقرار کیا۔ پس وہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہوا، اور جس نے ہماری مخالفت کی اور غیر کو ہم پر ترجیح دی تو وہ گویا گھروں میں پشتوں سے داخل ہوا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو آل محمدؑ کے پاس آیا گویا وہ صاف چشمے پر وارد ہوا۔ جو اللہ کے علم کے ساتھ جاری ہے اور خداوند کریم نے آل محمدؑ کو اپنے دروازے قرار دیا اور انہی سے اس کی بارگاہ میں پہنچا جاسکتا ہے اور اس قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں، لیکن اختصار کے پیش نظر انہیں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تنبیہ: آیت مجیدہ کے پہلے معانی اور اس معنی میں منافات نہیں سمجھنی چاہیے،

کیونکہ وہ معانی تفسیر ظاہری کے لحاظ سے تھے اور یہ معنی تفسیر باطنی کے طور پر ہے۔

(تفسیر انوار النجف: جلد ۳ پارہ ۲ ص ۸)

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرہ آیت ۱۹۴)

''پس اگر باز آ جائیں تو تحقیق اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین (عام) ہو جائے، پس اگر باز آ جائیں تو نہیں جائز ہے کوئی زیادتی مگر ظالموں پر حرمت والا مہینہ بدلے حرمت والے مہینے کے ہے اور حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔ پس جو زیادتی کرے تم پر، تو تم بھی زیادتی کر سکتے ہو اس پر جس قدر اس نے زیادتی کی ہو تم پر اور اللہ سے ڈرو اور یقین جانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

فَاِنِ انْتَهَوْا یعنی اگر وہ تائب ہو جائیں تو خدا ان کی سابقہ لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ اور ان کی توبہ مقبول ہو گی۔

فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا: اس آیت میں ظالمین کی باطنی تاویل حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین اور ان کی اولاد سے کی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر برہان میں اس مضمون کی متعدد روایات منقول ہیں۔

پس السلام بن صالح ہروی کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی

خدمت میں عرض کیا: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت قائم آل محمدؐ تشریف لائیں گے تو حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین کی اولاد سے قصاص لیں گے اور ان کو قتل کریں گے۔ کیا یہ درست ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا کہ خدا فرماتا ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کا پھر کیا مطلب ہے؟

آپ نے فرمایا: خدا نے سچ فرمایا ہے، لیکن امام حسین علیہ السلام کے قاتلوں کی اولاد اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہے اور ان کے فعل پر فخر کرتے ہیں اور جو شخص کسی کے فعل پر راضی ہو تو وہ بھی اسی جیسا مجرم ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص مشرق میں کسی کو قتل کرے اور مغرب میں رہنے والا شخص اس پر راضی ہو تو وہ بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ پس حضرت قائم آل محمدؐ ان کو اس لئے قتل کریں گے کہ وہ اپنے باپ دادا کے فعل پر راضی ہوں گے۔ (تفسیر النجف: جلد ۳، پارہ ۲، ص ۱۰)

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

"اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ بڑھاؤ اپنے ہاتھ طرف ہلاکت کے اور نیکی کرو تحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

ہلاکت سے بچنے کا حکم

وَلَا تُلْقُوْا اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں:

① بخل کر کے ہلاکت میں اپنے ہاتھ نہ ڈالو

② حد سے زیادہ خرچ کر کے اپنے ہاتھ ہلاکت (بھوک) میں نہ ڈالو۔

۳ گناہوں کے ارتکاب سے اپنے ہاتھ ہلاکت میں نہ ڈالو۔

۴ بلاوجہ لڑائی چھیڑ کر ہلاکت میں نہ پڑو۔ بہر کیف تمام معانی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

سوال: اس آیت کی رو سے جس طرح جناب رسالت مآبؐ نے حدیبیہ میں اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے صفین میں اور حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر لی تھی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے صلح کیوں نہ کر لی؟

جواب: اسباب ظاہری اور حالات حاضرہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کو یقین تھا کہ عبید اللہ بن زیاد میرے قتل سے باز نہ آئے گا جس طرح کہ اس نے حضرت امیر مسلم کو قتل کرا دیا تھا۔ پس ان حالات میں صلح کرنا ذلت کی موت خریدنے کے مترادف تھا اور صلح نہ کرنا عزت کی موت کے پسند کرنے کا نام تھا۔ پس آپ نے ذلت کی موت سے عزت کی موت کو ترجیح دی۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۲، ص ۱۰)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (البقرہ)

"اور بعض لوگ ہیں جو بیچتے ہیں اپنے نفس کو واسطے طلب رضا مندی خدا کے اور اللہ بڑا مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ اس کے شانِ نزول کے متعلق اہل علم کا اتفاق ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حق میں اُتری جب کہ شب ہجرت بستر رسولؐ پر سوئے تھے اور واقعہ یوں ہے کہ کفار قریش نے مشورہ کیا تھا کہ جناب رسالت مآبؐ کو اپنے مقام پر قتل کر دیا جائے اور چونکہ ظاہر ہو کر ایک آدمی یا ایک قبلہ کا قتل کرنا

مشکل ہے کیونکہ بنی ہاشم مشتعل ہو جائیں گے اور خواہ مخواہ قصاص لیں گے لہذا بہتری اسی میں ہے کہ تمام خاندانوں میں سے ایک ایک کو آدمی منتخب کرلیا جائے اور وہ سب مل کر آنحضورؐ کو قتل کر دیں اس صورت اگر بنی ہاشم مشتعل ہوں گے تو ان کو خون بہا پر راضی کرلیا جائے گا۔ کیونکہ تمام خاندانوں سے قصاص لینا ان کے لئے مشکل ہوگا۔ پس حضرت جبرائیل نازل ہوئے اور قریشیوں کے خبث باطن کی آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی اور حکم سنایا کہ اپنے بستر پر حضرت علی علیہ السلام کو سلا دیں اور خود بنفس نفیس مدینہ کی طرف تشریف لے جاویں۔ پس آپ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت علی علیہ السلام بستر پر سو گئے۔ جوانانِ قریش اپنے مشورہ کے ماتحت جب پہنچے تو انہیں یہ یقین تھا کہ حضورؐ خود بستر پر سوئے ہوئے ہیں، پس جب انہوں نے جگایا تو حضرت علیؑ کو سویا ہوا پایا۔ پوچھنے لگے: محمد کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے کیا معلوم؟ پس وہ خائب وخاسر وہاں سے چلے گئے۔

تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ خداوند کریم نے جبرائیلؑ و میکائیلؑ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ مقرر کی ہے۔ پس دونوں میں سے کون اپنی عمر کے کچھ حصہ کی قربانی پیش کرتا ہے تاکہ اس کے حصہ سے کاٹ کر اس کے بھائی کے حصہ میں شمار ہو جائے یہ سنتے ہی دونوں فرشتے خاموش ہو گئے۔ پس خدا کی جانب سے وحی ہوئی کہ تم میرے ولی علیؑ بن ابی طالب کی مثل کب ہو سکتے ہو؟ میں نے اس کے اور اپنے نبی محمدؐ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہے۔ پس وہ اپنے بھائی پر اپنی جان قربان کر کے سو رہا ہے۔ پس تم دونوں زمین پر اترو اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کرو۔ پس دونوں فرشتے اُترے جبرئیلؑ جانب سر بیٹھا اور میکائیلؑ جانب قدم بیٹھ گیا

اور جبرئیلؑ نے کہنا شروع کیا:

بَخٍ بَخٍ مَنْ مِثْلُكَ يَاابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ وَاللّٰهُ يُبَاهِيْ بِكَ الْمَلَائِكَةِ

"مبارک! اے ابو طالبؑ کے فرزند! تیرا ہم سر کون ہو سکتا ہے کہ خدا ملائکہ پر بھی تیرے ایثار کا فخر کر رہا ہے۔"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ رات کے وقت آپ کو نیند نہ آئی ہوگی، کیونکہ موت کا خطرہ تھا آپ نے فرمایا: خدا کی قسم، آج کی شب کی طرح مجھے عمر بھر نیند نصیب نہیں ہوئی۔

بعض لوگوں نے اس آیت مجیدہ کے شانِ نزول کو دوسرے صحابہ سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جن کو قدرے علوم اسلامیہ میں دخل ہے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس آیت میں علی علیہ السلام کا اور شریک کوئی نہیں ہے۔ خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے مجلسِ شوریٰ میں عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص کے سامنے جب اپنی یہ منقبت بیان فرمائی تو سب نے سر جھکا لئے اور اس کے انکار کی جرأت کسی سے نہ ہو سکی۔

معاویہ کے زمانہ میں جب حدیث سازی کا کام شروع ہوا تو سمرہ بن جندب کو حکومت نے چار لاکھ درہم صرف اس انعام میں دیئے کہ اس نے وَمِنَ النَّاسِ یعجبہ علی علیہ السلام کے حق میں اور مَنْ يَّشْرِيْ ابنِ ملجم کے حق میں اترنے کی روایت گھڑ کر پیش کی تھی۔ (سوانح عمری حضرت عمر حصہ اول نقلاً از شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَ

تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلاَّ
اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ط
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ (البقرہ)

''اے ایمان والو! (صرف زبانی دعویٰ کرنے والوں) داخل ہو جاؤ اسلام میں (دل وجان سے) سب کے سب اور نہ اتباع کرو نقش قدم شیطان کی۔ تحقیق وہ تمہارا ظاہر دشمن ہے۔ پس اگر تم پھسل جاؤ بعد اس کے کہ آ چکیں تمہارے پاس روشن دلیلیں تو پس جان لو کہ تحقیق اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کی کہ لائے خدا ان پر بادل کے ٹکڑے اور فرشتے (عذاب کے) اور حتمی ہو جائے معاملہ (عذاب کا) اور اللہ کی طرف ہی پھیرے جائیں گے تمام امور۔ (البقرہ)

رجعت کا بیان

اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ: تفسیر برہان میں آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی طرف سے متعدد روایات منقول ہیں جو غالباً حد تواتر تک پہنچتی ہیں کہ سلم سے مراد اس آیت میں حضرت علیؑ اور اُن کی اولاد طاہرین علیہ السلام کی ولاء کا اقرار ہے اور خطوات شیطان سے مراد دشمنان اہلبیت کی ولاء ہے۔ (تفسیر باطنی اعتبار سے ہے)

هَلْ يَنظُرُونَ: تفسیر آئمہ اہل بیتؑ میں ہے کہ یہ آیت رجعت کے متعلق ہے چنانچہ ایک روایت میں حضرت جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ یوم وقت معلوم میں ابلیس اپنے تمام مریدوں کو جمع کرے گا اور اس کے مقابلہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے شیعوں میں تشریف لائیں گے۔ ان دونوں لشکروں کی ملاقات فرأت کے کنارے کوفہ کے قریب مقام روحاء پر ہوگی۔ اور سخت ترین لڑائی واقع ہوگی، پس اس وقت خدا کا امر بادلوں کے ٹکڑوں میں نمودار ہوگا۔ ملائکہ عذاب اتاریں گے اور جناب رسالت مآبؐ تشریف لائیں گے کہ ان کے ہاتھ مبارک میں ایک نورانی حربہ ہوگا۔ جب ابلیس یہ چیزیں ملاحظہ کرے گا تو فرار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پیروکار اس سے بھاگنے کی وجہ پوچھیں گے تو جواب میں کہے گا کہ مجھے وہ چیز نظر آرہی ہے جس کو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ پس جناب رسالت مآبؐ اس کو پیچھے سے دونوں کندھوں کے درمیان نیزہ ماریں گے اور وہ واصلِ جہنم ہوگا۔ اس کے بعد ایک

طویل مدت تک حضرت علی علیہ السلام حکومت کریں گے جو چوالیس ہزار سال ہوگی۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۲، ص ۳۰ تا ۳۱)

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ

(البقرہ)

''پابند کرو نمازوں پر خصوصاً درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لئے دعا مانگتے ہوئے۔''

نمازِ وسطیٰ کی تاویل

ہم نے کتاب کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں کئی عنوانات کے تحت اشارۃً وصراحتاً اس مطلب کو ظاہر کیا ہے کہ تمام اعمال کی اصل معرفت ہے اور معرفت کے بغیر اعمال شرف قبولیت کو نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ مفضل بن عمر کی روایت کے آخری فقرات یہ ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: معرفتِ امام اصل ہے اور جملہ عبادات اس کی فرع ہیں یا یوں سمجھئے کہ معرفتِ امام باطن اور تمام عبادات اس کا ظاہر ہیں۔ پس فرع اور ظاہر کے بغیر اصل اور باطن سے تمسک پکڑنا سراسر غلط بلکہ شرک ہے اور دشمن نبی اور امام علیہ السلام تمام برائیوں کی اصل ہے اور تمام برائیاں اس کی فرع ہیں پس جو شخص اصل سے نفرت کرتا ہو اور برائیوں سے نفرت نہ کرے جو اس کی فروعات اور اس کی پیداوار ہیں تو وہ جھوٹا ہے کیونکہ دشمن امام سے نفرت کرنا اصل اور باطن ہے اور تمام برائیوں سے نفرت کرنا اس کی فرع اور ظاہر ہے اور اصل کی پہچان فرع سے ہی ہوا کرتی ہے۔ ہاں یہ بات کہ معرفت حاصل کرلو اور جو جی چاہے کرو درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی معرفت حاصل کر لینے بعد جتنی نیکی کرو مقبول ہے خواہ کم ہو یا زیادہ اور بجز معرفت کی کوئی نیکی نیکی ہی نہیں۔

پس جب معلوم ہوا کہ معرفت ہر عبادت اور عمل کی روح ہے اور بغیر اس کے کوئی عبادت عبادت ہی نہیں خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور شے ہو تو اس بناء پر قرآن مجید میں جس قدر

اعمال کا ذکر ہے ان کا باطن اہلبیت اطہار علیہم السلام کی محبت قرار دینا بالکل درست ہے۔

چنانچہ مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں بصائر الدرجات سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: قرآن کی دو تہائی ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں ہے پس جہاں بھی خیر کا ذکر ہے وہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے لئے ہے اور باقی تہائی میں دوسرے لوگ ہمارے ساتھ شریک ہیں اور جہاں بھی شر کا ذکر ہے وہ ہمارے دشمنوں کے لئے ہے۔

اور اسی کتاب میں کافی سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کیا قرآن بولتا بھی ہے؟ آپ نے سائل سے فرمایا کہ ہاں! نماز بھی بولتی ہے اس کی شکل وصورت بھی ہے اور وہ امر بھی کرتی ہے اور نہی بھی کرتی ہے۔ سعد خفاف راوی حدیث کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی میرا رنگ فق ہوگیا۔ پس میں نے عرض کی کہ آپ نے ایسی بات فرمائی ہے جس کا اظہار میں لوگوں میں نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا: لوگ تو ہمارے شیعہ ہی ہیں پس جو شخص نماز کی معرفت نہیں رکھتا۔ وہ ہمارے حق کا منکر ہے، پھر فرمایا: اے سعد! خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ

''تحقیق نماز نہی کرتی ہے فحشاء اور منکر سے اور اللہ کا ذکر اکبر ہے۔''

پس نہی کرنا کلام ہی ہے اور فحشاء ومنکر سے مراد کئی لوگ ہیں اور ہم ذکر اللہ ہیں اور ہم اکبر ہیں۔ نیز اسی کتاب میں علل سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک مرتبہ صحن کعبہ سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کی نماز کو اچھا پایا۔ فرمانے لگے: اے شخص! کیا تو اپنی نماز کی تاویل کو جانتا ہے؟ اس نے عرض کی: اے سید کائنات کے برادر! کیا عبادت گزاری کے علاوہ نماز کی کوئی

دوسری تاویل بھی ہے؟ آپ نے فرمایا: اے شخص! جان، تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے جناب رسالت مآبؑ کو مبعوث نہیں فرمایا! ساتھ کسی ایسے امر کے جس کی شبیہہ اور تاویل اور تنزیل نہ ہو اور یہ سب کچھ اطاعت کے ماتحت ہے پس جو شخص اپنی نماز کی تاویل کو نہیں سمجھتا تو اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے (صاحب مقدمہ اس کی توجیہہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تاویل سے مراد باطن اور تنزیل سے مراد ظاہر ہے۔)

مقصد یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؑ جس قدر اوامر ظاہر یہ لائے ہیں ان کی شبیہ اور مثال ضرور ہے جو باطن کے لحاظ سے واجب العمل ہے اور ان ہر دو پر ایمان لانا ضروری ہے پس جو شخص نماز کے باطن کو نہ پہچانتا ہو جس سے مراد امام اور ان کی اطاعت ہے تو اس کی نماز ظاہر یہ ناقص ہے۔

باقی تمام عبادات بدنیہ میں سے نماز افضل عبادت ہے اور اس اہم عبادت کو محمدؑ و آل محمدؑ کے علاوہ کسی نے بھی کامل طریق پر ادا نہیں کیا۔ کیونکہ نماز ان کی جان تھی اور یہ نماز کی جان تھے۔ شب و روز میں ایک ہزار رکعت نافلہ کا ادا کرنا انہی کا کام تھا۔ نماز میں مشغول ہو کر اس قدر محو ہو جاتا کہ لوگ سمجھیں دنیا سے گزر گئے گویا نماز اور یہ کالب و جان تھے و ران کے خدوخال ان کے رنگ ڈھنگ، ان کے گفتار و کردار اور ان کی رگ و پے میں نماز کے آثار ظاہر و ہویدا تھے۔ ان کے جسم کا بال بال، خون کا قطرہ قطرہ، بدن کی رگ رگ نماز و جملہ عبادات الٰہیہ کا مجسمہ تھا۔ ابتداء و دنیا میں تشریف لائے تو گود مادر میں مقام نہ کیا جب تک پہلے سر بسجود نہ ہوئے اور جب دنیا کو آخری الوداع کہا تو نماز کے لباس میں۔ پس اس کمال قرب کی وجہ سے گویا یہ نماز کا وجود تھے اور نماز ان کا وجود تھی۔

نیز نماز بلکہ جملہ عبادات کی مقبولیت کے لئے ان کی ولاء و محبت شرط ہے اور اس کے بغیر اعمال کی مقبولیت مشکل بلکہ محال ہے کیونکہ ان کی ولاء، درحقیقت نماز کا درس

دیتی ہے اور نماز کا طریقہ سکھاتی ہے۔ اس مطلب کو میں نے جلد اول میں ایک مستقل عنوان کے ماتحت قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے بس انہی وجوہات کی بنا پر باطنِ قرآن میں نماز سے مراد یہی ہیں۔

مقدمہ تفسیر میں باب الصاد میں بعض کتب امامیہ سے منقول ہے کہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام نے راوی حدیث داؤد بن کثیر سے فرمایا: اے داؤد! اللہ کی کتاب میں نماز ہم ہیں، زکوٰۃ ہم ہیں، روزہ ہم ہیں، حج ہم ہیں۔ بلد الاحرام ہم ہیں۔ کعبۃ اللہ ہم ہیں، قبلۃ اللہ ہم ہیں اور وجہ اللہ ہم ہیں۔ نیز حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے:

اِسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ

منقول ہے کہ صبر سے مراد جناب رسالت مآبؐ ہیں اور صلوٰۃ (نماز) سے مراد میری ولایت کا قائم کرنا ہے، اسی بناء پر تو خدا نے نماز کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ بھاری ہے اور اس کی طاقت صرف خشوع کرنے والوں کو ہوگی اور خاشعین ہمارے شیعہ ہی ہیں اور صبر کو بھاری نہیں کہا گیا (کیونکہ رسالت کا قائل تو ہر مسلمان ہے)۔

بروایت عیاشی حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ: لَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ کی تاویل یہ ہے کہ علی علیہ السلام کی ولاء کا ابھی اعلانیہ بیان نہ کرو۔ یہاں تک کہ میرا حکم آئے اور لَا تُخَافِتْ بِهَا کی تاویل یہ ہے کہ اس کو بالکل چھپاؤ نہیں بلکہ علی علیہ السلام کی خبر دے دو۔

نیز امام علیہ السلام سے آیت زیر بحث کی تاویل یوں منقول ہے کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ میں صلوات سے مراد حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور حضرت فاطمہ علیہا السلام اور حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام ہیں اور نماز وسطیٰ سے مراد صرف حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہیں اور قَانِتِيْنَ

سے مراد ہے کہ آئمہ کی اطاعت کرنے والے مقصد باطنی طور پر یہ ہوا کہ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی ولاء اور محبت کو اپنے پاس محفوظ رکھو۔ خصوصاً ولائے علی علیہ السلام اور اللہ کے سامنے ان کی اطاعت کرتے ہوئے اور ان کے نقش قدم پر گامزن ہوتے ہوئے پیش ہوا کرو۔

اَقُوْلُ: حضرت علی علیہ السلام کے متعلق زیادہ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں میں اختلاف انہی بزرگوں کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا اس لئے خدا نے اس کو خصوصیت سے بیان فرمایا۔ ورنہ ان سب کی محبت وولاء ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ جہنمیوں کا جواب کہ ہم نمازی نہیں تھے، کی تاویل میں ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ کہیں گے چونکہ ہم آئمہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اس لئے جہنم میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ پس ان تمام احادیث کے نقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام ظاہریہ کا باطن ہیں۔ اور نماز وسطیٰ جس کی تاکید کی گئی ہے ظاہر میں گو نماز ظہر ہے لیکن باطن کے لحاظ سے ولائے امیر المومنین مراد ہے اور اسی پر چونکہ تمام نمازوں کی مقبولیت کا دارو مدار ہے لہٰذا اس کو خصوصی تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ لیکن ابتداء میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان سے نقل کیا ہے کہ صرف ولائے اہل بیتؑ کا دعویٰ کر کے عبادات ظاہریہ سے منہ پھیرنا ناجائز ہے۔ ولاء اہل بیت علیہم السلام اصل ہے اور عبادات اس کی فرع ہیں اور اصل بغیر فرع کے نہیں ہوتی اور ظاہر و باطن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور اس مطلب کی مزید تفصیل کتاب کی جلد اول میں ''قرآن'' کے ظاہر اور باطن کے عنوان میں اور تاویل قرآن اور عبادات ظاہریہ کے عنوان میں موجود ہے ملاحظہ فرمایئے۔ (تفسیر انوار النجف: جلد ۳، پارہ ۲، ص ۸۷)

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا

كَثِيرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

''کون ہے جو قرضِ اللہ کو قرضِ حسنہ پس خدا اس کو بڑھا کر دے کئی گنا زیدہ اور اللہ ہی تنگی اور فراخی عطا کرتا ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔''

مَنْ ذَاالَّذِیْ الخ: جو بھی اللہ کو قرض دے یعنی راہ خدا میں صدقہ وخیرات کرے گا تو اس کو اس کی جزا بہت زیادہ بڑھا کر دی جائے گی۔ آپ نے فرمایا! بہت زیادہ کا مطلب ہے کہ اس کو اسی کی جزا اتنی ملے گی کہ حساب وشمار سے باہر ہوگی۔

عنوان الکلام میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ صدقہ کی پانچ قسمیں ہیں:

1. ایک کے بدلہ میں دس گنا ثواب اور وہ صدقہ یہ ہے جو ایک فقیر مومن کو دیا جائے جس کے اعضاء صحیح اور سالم ہوں۔
2. ایک کے بدلہ میں ستر گنا کا ثواب، یہ وہ صدقہ ہے جو ایسے مومن کو دیا جائے جو خود کما کر اپنے اخراجات کو نبھانے سے عاجز ہو۔
3. ایک کے بدلہ میں سات گنا کا ثواب، یہ وہ صدق ہے جو مومن فقیر رشتہ دار کو دیا جائے۔
4. ایک کے بدلہ میں ستر ہزار گنا کا ثواب، یہ وہ صدقہ جو والدین پر کیا جائے (یا والدین کے لئے کیا جائے)
5. ایک کے بدلہ میں ایک لاکھ گنا کا ثواب، اور یہ وہ صدقہ ہے جو مستحق مومن علم دین طلب کرنے والے کو دیا جائے۔

سلسلہ عزاداری سید الشہداء علیہ السلام میں خرچ کرنے کے متعلق وارد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ذات پروردگار کی جانب سے ارشاد ہوا کہ اگر کوئی بندہ نبی مصطفیٰ حضرت خاتم الانبیاء کے نواسہ کی محبت میں اپنے مال سے کسی کو کھانا کھلائے گا، یا اس سلسلہ میں کوئی درہم یا دینار خرچ کرے گا تو اس کو دنیا میں اس کا ستر (۷۰) گنا عطا کروں گا اور آخرت میں اس کا مقام جنت ہو گا۔ اس کے تمام گناہ بخش دوں گا۔ مجھے اپنے عزت وجلال کی قسم اگر کسی مرد یا عورت کی آنکھ سے عاشورا یا کسی اور دن میں اس کی مصیبت پر ایک قطرہ آنسو جاری ہو گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک سو شہید کا ثواب درج کروں گا:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

(البقرہ آیت ۲۴۷)

"اور فرمایا ان کو اپنے نبی نے کہ تحقیق اللہ نے تم پر طالوت کو نبی مقرر فرمایا ہے کہنے لگے وہ کیسے ہمارے اوپر حکومت کر سکتا ہے حالانکہ ہم اس کی بہ نسبت حکومت کے زیادہ حقدار ہیں اور اس کے پاس وسعت مال بھی نہیں کیا فرمایا (نبی نے) کہ تحقیق اللہ نے تم پر اس کا انتخاب۔"

نصیحت وعبرت

قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات اور حکایات صرف ظاہری دلچسپی کے لئے

نہیں دہرائے گئے چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے موعظہ بھی ہے اور دستور العمل بھی لہٰذا اس کے تمام قصص وحکایات تا قیامت امت مرحومہ اسلامیہ کے لئے دعوت عمل ہیں۔ ایک نبی کا واقعہ اور ان کی امت کے ساتھ گفت وشنید اعتراضات وجوابات اور ان سب کا ردعمل یہ باتیں صرف کانوں کی ہوس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں، بلکہ درس حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

آیات زیر بحث میں جہاں مقابلہ دشمن میں ثبات قدمی کی دعوت دی گئی ہے اور بزدلی کی مذمت کی گئی ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ اس اہم مطلب کے چہرہ سے بھی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ عہدہ حکومت الٰہیہ کے لئے عہدہ دار کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس کا اعلان کرنے کا نبی کو حق حاصل ہے، اور امت کو نہ اس پر اعتراض کرنے کی اجازت ہے اور نہ اس معاملہ میں ان کا اجماع کوئی وقعت رکھتا ہے۔ اب مسلمان ذرا سوچیں کہ ہمارے نبی نے بھی ہمارے اوپر کوئی حاکم مقرر کیا ہے یا وہ ہم کو اندھیرے میں چھوڑ کر چلے گئے اس کا جواب کتب فریقین سے متواتر ملتا ہے کہ نبی نے ہمیں بار بار بتایا، گھر میں بتایا، سفر میں بتایا، مسجد میں بیان کیا، جنگوں کے مواقع پر بیان کیا، فرداً فرداً سنایا اور کھلے جلسوں میں بیانگ دہل اعلان فرمایا۔ پہلے پہل دعوت ذوالعشیرہ میں اپنی تصدیق کرنے والے کے لئے اپنے بعد کے لئے خلافت کی پیش کش فرمائی۔

سب سے آخر میدانِ غدیر میں ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں کھلے الفاظ میں خلافت کا اعلان فرمایا اور صرف یہ نہیں بلکہ دستار بندی بھی کرائی اور صحابہ سے بیعت بھی کرائی اور صحابہ کرام نے بَخٍ بَخٍ لَكَ کے گرانقدر الفاظ سے علیؑ کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

ان کے علاوہ حدیث مواخات، حدیث طیر، حدیث منزلت وغیرہ میں صاف طور پر علی کی خلافت کو بیان فرمایا اور حدیث الثقلین کو کئی بار دہرا، دہرا کر تمام مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش فرمائی کہ میرے بعد سوائے میری آل کے تمہارے لئے کوئی قرآنی مسائل کو حل کرنے کے لئے اہل نہیں ہے۔ یہی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں حوض کوثر پر میرے پاس لے آئیں گے۔

لیکن افسوس کہ امت اسلامیہ نے گزشتہ واقعات کو صرف کانوں تک ہی محدود رکھا اور قرآن نے گزشتہ اقوام وامم کے جس جس کردار کو غلطی اور بے راہ روی سے تعبیر کیا تھا مسلمانوں نے صرف زبان سے قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کرلی لیکن عمل وہی کیا جو گزشتہ امتیں کرگزریں۔ حضرت رسالت مآبؐ کے مقرر کردہ خلفاء کو پیچھے ہٹانے اور دوسروں کو آگے بڑھانے میں وہی بہانے تجویز کئے جو گزشتہ امتوں نے کئے تھے جن کو قرآن نے رد کردیا تھا اور باوجودیکہ معیار قرآنی کے مطابق حضرت علی علیہ السلام انتخاب حکومت الہیہ کے لئے تمام سے موزوں تر تھے اور خدا کی طرف سے منتخب بھی تھے۔ پوری امت میں نہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم تھا اور نہ ان سے زیادہ کوئی شجاع تھا۔ دیگر اوصاف کمالیہ میں بھی وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے لیکن امت کا رویہ وہی رہا جس کو تاریخ گزشتہ کے طور پر قرآن نے عبرت حاصل کرنے کے لئے دہرایا تھا۔ اس مقصد کی مزید وضاحت ہماری کتاب ''اسلامی سیاست'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ (تفسیر انوار النجف: جلد۳ پارہ۳، ص ۱۱۸)

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ آیت ۲۵۶)

''نہیں زبردستی دین میں تحقیق ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے پس جو کفر کے شیطان کا اور ایمان لائے اور پر تو گویا اس نے پکڑا دستاویز محکم کو جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور خدا سننے جاننے والا ہے۔''

دین میں جبر نہیں

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: یہاں عدم اکراہ کی علت ہے ہدایت و گمراہی کے رستوں کی وضاحت اور یہ علت تا قیامت قابل نسخ نہیں۔ لہٰذا اس کا معلول حکم یعنی جبر و تشدد کے استعمال کی منع بھی ہرگز نسخ پذیر نہیں ہو سکتا۔ پس جن لوگوں نے اس حکم کو جہاد والی آیات سے منسوخ قرار دیا ہے یہ ان کا اشتباہ ہے اور اسلام کی جملہ لڑائیاں دین اسلام کی نشرو اشاعت کی خاطر نہیں تھیں، بلکہ جو لوگ انسانیت کے اس فطری حق پر پردہ ڈالنے اور شمع توحید کو بجھانے کے در پے تھے۔ اسلام کی لڑائیاں بحکم جہاد اس نفیس ترین متاع فطرت یعنی کلمہ توحید کی حفاظت کے لئے صرف دفاعی حیثیت سے تھیں نہ ان میں توسیع دائرہ اسلام کی ہوس کارفرما تھی اور نہ ملک گیری کا جذبہ موجب تحریک تھا، کیونکہ ملک گیری کا جذبہ تبلیغ اسلام سے بالکل منافات رکھتا ہے اور جبر و تشدد اور فاتحانہ انداز دائرہ اسلام کی توسیع میں فائدہ بخش نہیں، کیونکہ اصل دین ہے معرفت اور وہ اکراہ سے حاصل کی نہیں جا سکتی الطَّاغُوْتِ سے مراد شیطان یا سرکش خواہ جن ہو یا انسان، یا کاہن یا جادوگر، یا بت پرست۔ (باقوال مفسرین)

بروایت ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ قائم آل محمد علیہ السلام سے پہلے جو جھنڈا بلند ہو پس سمجھ لو کہ اس کا اٹھانے والا طاغوت ہے۔ تفسیر قمی سے نقل کیا گیا ہے کہ طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آل محمدؐ کے حقوق کو غصب کیا۔

عروہ وثقیٰ سے مراد کون؟

اَلۡعُرۡوَۃُ الۡوُثۡقٰی: تفسیر برہان میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ جو شخص اَلۡعُرۡوَۃُ الۡوُثۡقٰی سے تمسک پکڑنا چاہے جو کبھی نہ ٹوٹے گا تو اس کو چاہیے کہ میرے بھائی اور وصی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت سے تمسک پکڑے، کیونکہ اس کا محب وموالی ہلاک نہ ہوگا اور اس کا منکر ودشمن نجات نہ پائے گا۔

2 حذیفہ بن اسد سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اے حذیفہ! میرے بعد تم پر اللہ کی حجت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ اس کا کفر اللہ کا کفر، اس کا شرک اللہ کا شرک، اس میں شک اللہ میں شک، اس سے کنارہ اللہ سے کنارہ، اس کا انکار، اللہ کا انکار اور اس پر ایمان اللہ پر ایمان ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ کا بھائی، ان کا وصی، ان کی امت کا امام ہے اور وہ اللہ کی مضبوط رسی اور اَلعروۃُ الوثقیٰ ہے جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اس (علی) علیہ السلام کے متعلق دو قسم کے انسان ہلاک ہوں گے۔ ایک غالی جوان کو اپنی حد سے بڑھا کر خدا یا خدا کی صفات میں شریک کریں گے۔ دوسرے مقصر (جو اس کو اپنے حقوق سے پیچھے ہٹا کر دوسروں کو اس کی جگہ دیں گے)۔ اے حذیفہ! علیؑ سے جدا نہ ہونا، ورنہ تو مجھ سے جدا ہو جائے گا، اور علیؑ کی مخالفت نہ کرنا، ورنہ تو میرا مخالف ہوگا، کیونکہ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں، جس نے اس کو نارض کیا اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اس کو راضی کیا اس نے مجھے راضی کیا۔

3 اسناد سابق سے جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: حسینؑ کی اولاد سے ہونے والے امام جس نے ان کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے ان کی

نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی، یہی عروہ وثقی ہیں اور یہی اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

"اللہ ولی ہے ایمان والوں کا کہ ان کو نکالتا ہے (کفر) کی تاریکیوں میں سے طرف نور (ہدایت) کے اور وہ لوگ جو کافر ہیں ان کے اولیاء شیطان ہیں۔ کہ ان کو نکالتے ہیں نور (ہدایت) سے طرف (کفر کی) تاریکیوں کے۔ ایسے لوگ جہنم میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

4. نیز جناب رسول جناب رسول خداؐ سے منقول ہے کہ جو شخص عروہ وثقی (دستاویز محکم) سے تمسک پکڑنا چاہے پس وہ علیؑ اور اس کی اہل بیتؑ کی محبت کو اختیار کرے۔

5. جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے ایک لمبے خط میں ارشاد فرمایا کہ رسول خداؐ اپنی امت میں ایک کتاب خدا اور دوسرے اپنا وصی علی بن ابی طالبؑ چھوڑ گئے، جو امیر المومنین، امام المتقین، حبل اللہ المتین، العروۃ الوثقی اور عہد موکد ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مصداق ہے۔

6. بطریق مخالفین، عبدالرحمٰن بن ابی لیلٰی سے منقول ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو فرمایا:

اَنۡتَ الۡعُرۡوَۃُ الۡوُثۡقٰی

''تو خدا کی محکم دستاویز ہے''

7 امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: میرے بعد تاریک فتنہ ہوگا۔ نجات وہی پائے گا جو عروہ وثقیٰ سے تمسک پکڑے گا۔ جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ فرمایا کہ سید الوصیین کی ولایت۔ پھر پوچھا گیا کہ سید الوصیین کون ہے؟ فرمایا: امیر المومنینؑ۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ کون ہوگا تو فرمایا کہ جو مسلمانوں کا حاکم اور میرے بعد امام ہوگا، پھر سوال ہوا کہ آپ کے بعد امام اور مسلمانوں کا حاکم کون ہوگا تو آپ نے فرمایا: وہ میرا بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا تفسیر برہان میں کافی اور دیگر کتب امامیہ سے بروایت عبداللہ بن ابی یعفور منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ میں لوگوں سے ملتا جلتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو آپ سے تولا نہیں رکھتے اور فلاں فلاں سے دوستی رکھتے ہیں، ان میں امانت، سچائی اور وفا پائی جاتی ہے اور ایک قوم جو آپ سے تولا رکھتی ہے، ان میں وہ امانت، وفا اور سچائی نہیں پائی جاتی۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی امام علیہ السلام سیدھے ہو کر بیٹھے اور غصے میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: جو شخص ظالم امام کی ولایت کا قائل ہو، جو خدا کی طرف سے نہیں اس کا کوئی دین نہیں اور جو شخص امام عادل منصوص من اللہ کی ولایت کا قائل ہو اس پر کوئی عتاب نہیں۔ میں نے عرض کی: کہ ان کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں؟ فرمایا: ہاں! ان کا کوئی دین نہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تو نے خدا کا یہ فرمان نہیں سنا فرماتا ہے:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان کو گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر توبہ اور بخشش کی نورانیت کی طرف منتقل کر دیتا ہے کیونکہ وہ امام عادل سے تولا رکھتے ہیں جو کہ منصوص من اللہ تھا اور خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ نور اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکی میں چلے گئے۔ پس خدا نے کفار کے ساتھ ان کے لئے جہنم واجب کر دیا۔ پس وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ابن ابی یعفور کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا سے عام کافر مراد نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: کافروں کے پاس پہلے نور ہی کون سا تھا جس سے وہ نکالے گئے؟ بلکہ اس سے وہی معنی مراد ہے جو میں نے بیان کیا۔

بروایت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آیت مجیدہ میں نور سے مراد ولایت علی ابن ابی طالب ہے اور ظلمات سے مراد دشمنانِ علیؑ کی ولایت ہے اور طاغوت سے مراد علی بن ابی طالب کی ولایت کے منکرین اور ان کے دوست ہیں۔

ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ خواہ اپنے نزدیک انتہائی متقی، زاہد اور عبادت گزار ہی کیوں نہ ہوں۔

اقول: اس مطلب کا استدلال رنگ میں ہم نے کتاب ہذا کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں مفصل بیان کیا ہے عدل، احباط، شفاعت اور ولایتِ آلِ محمدؐ اور ضرورت امام کے عناوین ملاحظہ فرمائیں۔ نیز اسی جلد میں اسی پارہ کے رکوع نمبر ۱۰

کی تفسیر کے ذیل میں اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامِ کے تحت میں بھی کسی قدر بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ

یہ دو آیتیں ویسے آیۃ الکرسی سے الگ ہیں لیکن بعض نمازیں جن میں آیۃ الکرسی پڑھی جاتی ہے مثلاً نماز وحشت یا نماز غدیر وغیرہ تو وہاں آیۃ الکرسی سے مراد یہ تینوں آیتیں ہوا کرتی ہیں۔ یعنی ان نمازوں میں ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ تک پڑھنا چاہیے کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۳۹)

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۝

"مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں مثل اس دانے کے ہے جو اگائے سات خوشے کہ ہر خوشہ میں ایک سو دانہ ہو اور خدا زیادہ کرتا ہے جس کے لئے چاہے او رخدا صاحب وسعت وعلم ہے۔" (البقرہ آیت ۲۶۱)

خدا کی راہ میں خرچ کرنا

مَثَلُ الَّذِيۡنَ :امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مومن جو بھی نیکی کرے۔ خداوند کریم اس کو ہر نیکی کا بدلہ سات سو گنا جزا کرامت فرمائے گا اور آپ نے اسی آیت مجیدہ سے استشہاد فرمایا۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام گھر سے تشریف لائے۔ حسنین شریفین کو بے تاب دیکھا۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کی کہ شہزادے بھوک سے ہیں اور تیسرے روز کا ان کو فاقہ ہے۔ پس آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور عبداللہ بن عوف سے ایک دینار قرض طلب فرمایا۔ اس نے ایک تھیلی جس میں سو دینار تھے بطور صدقہ کے پیش کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول خداؐ سے سنا ہے کہ دینے والا لینے والے سے بہتر ہے پس میں کسی کا احسان مند نہیں ہونا چاہتا، مجھے قرض دے دیجئے کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ صدقہ کا ثواب ایک کا دس گنا ہے اور قرضہ کا ثواب اٹھارہ گنا ہے۔ پس ایک دینار قرض لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ راستہ میں مقدادؓ بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا مقدادؓ! ایسی گرمی میں کیسے گھر سے نکلنا ہوا۔ مقدادؓ نے عرض کی: چار روز سے فاقہ ہے لہٰذا مجبوراً گھر سے نکلا ہوں کہ شاید کچھ میسر آ جائے تو آپ نے وہ

دینار مقداد کو دے دیا اور فرمایا کہ تو ہم سے زیادہ مستحق ہے کیونکہ ہمارے گھر تین روز سے فاقہ ہے اور تجھے چوتھا روز ہے پس مسجد میں تشریف لائے تو یہ آیت اتری:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ......

دوسرے دن ایک شخص آیا اُس نے حضرت علی علیہ السلام کو ایک تھیلی پیش کی اور غائب ہو گیا۔ حضرت علیؑ اس کو لے کر خدمت سرکار رسالتؐ میں وارد ہوئے اور ماجرا سنایا۔ آپ نے تھیلی کو کھولا تو اس میں سات دینار تھے۔ فرمایا: اے علیؑ کیا تو نے اس ناقہ سوار کو پہچانا تھا؟ وہ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اور بحکم خدا آئے اور یہ تھیلی اس ایک دینار کا عوض ہے جو آپ نے کل مقدادؓ کے حوالہ کیا تھا اور آخرت میں خدا اس کا بدلہ اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا۔ پس حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بے شک فرمانِ خدا درست ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی جزا مثل اس ایک دانے کے ہے جس سے سات سو دانے پیدا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ایک دینار قرض خواہ کو واپس دیا اور باقی اہل بیت علیہ السلام اور فقراء پر تقسیم فرمایا۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۵۴)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا............ (آیت ۲۵۷ سورۃ البقرہ)

"جو سود کھاتے ہیں.........

مسئلہ: بنک میں جو پیسہ جمع کر دیا جاتا ہے اور بنک والے اپنے دستور کے مطابق جمع کرانے والے کو کچھ معین منافع ادا کرتے ہیں، اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اولاً تو اس پر قرض کا عنوان بھی صادق نہیں آتا، بلکہ پیسہ کی حفاظت کے لئے ایسا کیا جاتا ہے، ثانیاً جو کچھ بنک والے زیادہ ادا کرتے ہیں وہ اپنی مرضی سے دیتے ہیں ورنہ پیسہ جمع کرنے والے کی طرف سے یہ شرط نہیں ہوا کرتی اور ثالثاً بنک میں جمع شدہ

رقوم کو تجارت وغیرہ پر لگایا جاتا ہے جس کے منافع کی معین مقدار مالکوں کو ادا کی جاتی ہے، لہٰذا اس پر ربا کا صادق آنا مشکل ہے۔ واللہ اعلم۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۷۰)

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (آیت ۲۸۱ کا ایک حصہ سورۃ البقرہ)

''پس اگر دو مرد نہ مل سکیں تو پس ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ تمہیں ان پر بھروسہ ہو (عادل ہوں)۔''

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ

''دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔''

جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت حضرت رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! میں جملہ عورتوں کی طرف سے حاضر خدمت ہوئی ہوں کہ خداوند عالم عورتوں، مردوں کا پروردگار اور خالق و رازق ہے اور حضرت آدمؑ اور حواؑ بھی یکساں طور پر تمام مردوں، عورتوں کے والدین، اور آپ بھی تمام مردوں، عورتوں کی طرف یکساں طور پر رسولؐ ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ شہادت اور میراث میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا؟ آپ نے فرمایا: اے عورت! خدائے عادل و حکیم ظلم و جور نہیں کرتا، کیونکہ تمہیں کم دینے سے اس کو نفع نہیں اور زیادہ دینے سے اس کو خسارہ نہیں ہے لیکن وہ معاملات کی تدبیر اپنے علم سے فرماتا ہے۔ اے عورت! وجہ یہ ہے کہ تمہارا دین اور عقل ناقص ہے، اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دین کا نقصان تو اس سے ظاہر ہے کہ تمہیں ہر ماہ میں نماز پڑھنے سے معذوری لاحق ہوا کرتی ہے (اور عقل کے نقصان کی یہ علامت ہے)

کہ تم لعن وطعن زیادہ کرتی ہو اور کفرانِ نعمت تمہارا شیوہ ہے، مثلاً ایک عورت اگر دس (۱۰) برس ایک مرد کے پاس رہے اور وہ اس کی ہر قسم کی ناز برداری کرتا رہے، لیکن پھر ایک دن اگر مرد پر تنگی آ جائے یا مرد عورت کو اس کے خلاف مزاج کوئی بات کہہ دے تو وہ (اس کی دہ سالہ خدمات واحسانات کو نظر انداز کرتے ہوئے) فوراً کہتی ہے کہ میں جب سے تیرے گھر آئی ہوں تجھ سے کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ ہاں اگر کوئی عورت اس سے بلند کردار اور اس قسم کی بدعادتوں سے کنارہ کش ہو تو اس کے لئے یہ (میراث وشہادت میں) کمی اس کا امتحان ہے، تاکہ صبر کرے اور اس سے اس کے درجات بلند ہوں۔ پس تجھے خوشخبری ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ردی مردوں اور ردی عورتوں میں سے عورت ردی ترین ہوتی ہے اور صالح مردوں اور صالح عورتوں میں سے مرد صالح ترین ہوا کرتا ہے اور خداوند کریم نے (معاملہ شہادت میں) کسی عورت کو مرد کے برابر نہیں قرار دیا۔ مگر جناب فاطمۃ الزہراؑ کو کہ وہ اس معاملہ میں حضرت علی علیہ السلام کے برابر تھیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۸۰)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ

(آیت ۲۸۵ سورۃ البقرہ)

"ایمان لایا رسولؐ ساتھ اس کے جو نازل کیا گیا اس پر اپنے رب کی طرف سے اور مومنین بھی سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتے اور کتابوں اور رسولوں پر اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں کرتے بلحاظ ایمان۔"

نیز تفسیر برہان میں مروی ہے کہ شبِ معراج جب مجھے خطاب پروردگار ہوا۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ (الخ) اور میں نے کہا......وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ (الخ) پھر ارشاد ہوا: اے محمدؐ میں نے زمین پر نگاہ (قدرت) کی اور تیرا نام اپنے نام سے مشتق کیا۔ جہاں میرا ذکر ہو گا وہاں تیرا ذکر ہو گا، پس میں محمود ہوں اور تو محمد ہے، پھر میں نے دوبارہ زمین پر نظرِ انتخاب کی تو علی علیہ السلام کو چنا اور اس کا نام بھی اپنے نام سے مشتق کیا۔ میں اعلیٰ ہوں اور وہ علیؑ ہے، اے محمدؐ! میں نے آپ کو اور علیؑ فاطمہؑ حسن حسین علیہم السلام اور باقی آئمہ جو حسین علیہ السلام کی نسل سے ہونے والے ہیں ان سب کو اپنے نور سے خلق کیا اور تمہاری ولایت کو میں نے تمام اہل ارض و سما پر پیش کیا: وہ میرے نزدیک مومن ہے اور جس نے اس کا انکار کیا وہ میرے نزدیک کافر ہے۔

اے محمد میرے بندوں میں سے کوئی بندہ میری عبادت کرتے کرتے نڈھال اور بوسیدہ ہو جائے لیکن تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرتا ہو تو اس کو نہ بخشوں گا جب تک تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرے گا۔ اے محمدؐ! کیا ان کو دیکھنا چاہتا ہے؟ (یعنی باقی تیرہ معصومین) تو میں نے عرض کی! ہاں۔ پس مجھے خطاب ہوا۔ عرش کی دائیں جانب نگاہ کیجئے۔ پس میں نے دیکھا تو علی السلام ، فاطمہ علیہ السلام، حسن علیہ السلام ، حسین علیہ السلام، علی بن الحسین علیہ السلام، محمد بن علی علیہ السلام، جعفر بن محمدؑ، موسیٰ بن جعفر علیہ السلام، علی بن موسی علیہ السلام، محمد بن علیؑ، علی بن محمدؑ، حسن بن علیؑ اور حضرت مہدیؑ ایک فضائے نور میں کھڑے ہو کر مصروف عبادت تھے اور حضرت مہدیؑ ایک درخشاں ستارہ کی طرح ان سب کے وسط میں جلوہ افروز تھے۔

پس ارشاد باری ہوا: اے محمدؐ! یہ سب میری طرف سے حجت ہوں گے اور وہ تیری (مظلوم) عترت کا بدلہ لینے والا ہو گا۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ وہ میرے دوستوں کے لئے حجت واجبہ اور میرے دشمنوں سے انتقام لینے والا ہو گا۔ تفسیر

مذکور ہے کہ اس روایت کو بعض مخالفین نے بھی نقل کیا ہے۔ (باختصار)

اسی تفسیر میں مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شب معراج تمہارے نبی سے پہلی کلام کون سی ہوئی؟ آپ نے فرمایا کہ یہ آیت:

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ۔

یہودی نے کہا کہ میرا یہ مطلب نہیں آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد یہ آیت جو کہ قول رسول تھا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

یہودی نے کہا: میری مراد یہ بھی نہیں۔

آپ نے فرمایا: پوشیدہ باتوں کو رہنے دو۔

یہودی نے کہا: اگر آپ نہیں بتا سکتے تو آپ وہ نہیں؟

آپ نے فرمایا: اگر تجھے خواہ مخواہ پوچھنا ہے تو سن، جب جناب رسالت مآب واپس تشریف لا رہے تھے تو ابھی حجابوں کی منازل میں تھے اور مقام جبریلؑ تک نہ پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک ملک نے صدا دی: یا احمدؐ!

آپ نے کہا: لبیک۔

فرشتہ نے عرض کی: اللہ سلام کے بعد فرماتا ہے کہ سید ولی کو سلام کہنا۔

آپ نے پوچھا: سید ولی کون ہے؟

ملک نے کہا: وہ علی بن ابی طالبؑ ہی تو ہے۔

یہ سن کر یہودی بولا: بے شک۔ خدا کی قسم، میں نے اپنے والد کی کتاب میں ایسا ہی پڑھا ہے اور وہ یہودی حضرت داؤدؑ کی اولاد سے تھا۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۸۵)

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (العمران:۳)

''اس کی تاویل اللہ اور وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں جانتے ہیں، حالانکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ (محکم ہو نا یا متشابہ) ہمارے رب کی طرف سے ہے روز نہیں نصیب حاصل کرتے مگر صاحبانِ عمل۔''

اَلرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ

روایاتِ اہلبیت علیہم السلام میں تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد راسخین فی العلم سوائے اہل بیت عصمت کے اور کوئی نہیں ہے، چنانچہ بعض کو تبرکا ذکر کیا جاتا ہے:

① ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''ہم راسخین فی العلم ہیں اور ہم ہی اس کی تاویل جانتے ہیں۔''

② امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے: راسخین فی العلم میں سے افضل فرد حضرت رسالت مآبؐ ہیں، اور جو کچھ بھی خداوند کریم نے نازل فرمایا، اس کی تاویل و تنزیل کا ان کو علم تھا اور کوئی چیز خدا نے ایسی نازل نہیں فرمائی جس کا آنجنابؐ کو علم نہ ہو اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد ان کے اوصیاء علیہ السلام سب کا علم رکھتے ہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن میں خاص بھی ہے عام بھی، محکم بھی اور متشابہ بھی اور ناسخ بھی اور منسوخ بھی، لیکن راسخین فی العلم ان تمام کو جانتے ہیں۔''

③ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: قرآن زاجر بھی ہے اور آمر بھی جنت کا امر کرتا ہے اور دوزخ سے زجر کرتا ہے، اس میں محکم بھی ہیں اور متشابہ بھی۔ پس محکمات کا تعلق ایمان و عمل ہر دو سے ہے اور متشابہات کا

تعلق ایمان سے ہے، ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔'' اس کے بعد آپ نے آیتِ مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ اور آخر میں فرمایا: کہ آپ محمدؐ ہی راسخین فی العلم ہیں۔

ہم نے تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں بھی اس پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے اور اس مطلب کو متعدد عناوین کے تحت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ احادیث کے علاوہ صحابہ کرام کی تصریحات بھی نقل کی ہیں۔ جس سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ وقار علمی میں علی علیہ السلام کے ہم پلہ صحابہ میں سے کوئی نہ تھا، حتیٰ ابن عباس کا قول ہے کہ میرے اور جناب رسالت مآبؐ کے تمام صحابہ کے علم کو حضرت علی علیہ السلام سے وہ نسبت ہے جو ایک قطرہ آب کو سات سمندروں سے حاصل ہے۔

اس بناء پر آیت مجیدہ میں الراسخون فی العلم کا عطف لفظ اللہ پر ہے اور مقصد یہ ہے کہ تاویلِ آیات قرآنیہ کے علم کا حصر ہے اللہ اور راسخون فی العلم میں، اور ان کے سوا اس کو کوئی جانتا ہی نہیں اور اس کے بعد یَقُوْلُوْنَ۔

محلاً منصوب اور حال ہے رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْم سے پس لفظ اللہ پر وقف درست نہیں، اور معنی آیت وہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے۔

اور اس آیت کی دوسری ترکیب اس طرح ہے کہ لفظ اللہ پر وقف اور جملہ کو تام مانا جائے اور اس کے بعد واؤ کو بجائے عطف کے استینافیہ قرار دیا جائے اور الرّٰسِخُوْنَ کو مبتدا قرار دے کر یَقُوْلُوْنَ اس کی خبر ہو، اور آیہ مجیدہ کا اس ترکیب سے مطلب یہ ہوگا کہ متشابہ کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا مگر صرف اللہ، اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ اس چیز کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہی ہیں یعنی تاویل کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے اور لوگوں کی اس بارے میں دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو من مانی تاویلیں کر کے

متشابہات کا اللہ کی جانب سے ہونا تسلیم کرتے ہوئے ٹھہر جاتے ہیں اور اپنی جانب سے اس میں رائے زنی نہیں کرتا لیکن اگر صحیح تدبر کرتے ہوئے حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ترکیب اور معنی بالکل صاف وسیدھا اور موزوں ومناسب ہے اور دوسری ترکیب اور معنی میں مخالفت واقع بھی ہے اور مخالفت عمل بھی۔ نیز مخالفت عقل بھی ہے اور مخالفت نقل بھی۔

مخالفت واقع تو اس لئے ہے کہ خداوند کریم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیات قرآنیہ میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف محکمات میں ہی تدبر کریں کیونکہ محکمات کا تو مطلب ہی صاف ہوتا ہے۔ اور ان میں مزید غور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس سے مراد آیات محکمہ کے علاوہ دوسری آیات ہی ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان کا علم صرف اللہ ہی کی ذات میں منحصر ہے تو عام لوگوں کو ان میں تدبر وتفکر کی دعوت دینا عبث ہے اور لطیف یہ ہے کہ خداوند کریم نے ان لوگوں کی جابجا مذمت فرمائی ہے۔ جو آیات میں تدبر نہیں کرتے پس معلوم ہوا کہ ان آیات کا علم خدا نے اپنی ذات میں منحصر نہیں فرمایا بلکہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کو بھی ان کا علم دیا ہے، اور لوگوں کو ان میں تدبر کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

سوال: اگر تدبر اور تفکر فی القرآن کی دعوت عام ہے، تو پھر اس مقام پر ان کی مذمت کیوں ہے؟ کہ فرماتے ہے جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔

جواب: مذمت اس لئے نہیں کہ وہ تدبر کیوں کرتے ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ فتنہ جوئی اور فساد کی خاطر وہ متشابہات کو اپنے مطلب فاسد اور مقصد کاسد پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا ان کا متشابہات کے درپے ہونا حق طلبی کے لئے نہیں ہوتا۔

بلکہ فتنہ پروری کے لئے ہی ہوتا ہے۔

سوال: اگر راسخون فی العلم متشابہات کی تاویل صحیح طور پر جان سکتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ کیونکہ متشابہات کی تاویل کا علم اللہ اور راسخون فی العلم میں بند ہے تو پھر وہی اعتراض تو واقع ہوگا کہ خدا نے باقی مخلوق کو قرآن میں تدبر کرنے اور تفکر کرنے کی دعوت کیوں دی جب کہ ان کا علم سوائے اللہ اور راسخین کے کوئی حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ اور راسخین سے مراد آل محمدؐ ہیں جس طرح کہ احادیث آئمہ میں تواتر سے یہ مطلب منقول ہے تو گویا تدبر کا حکم بھی صرف انہی کے لئے ہی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگ اگر تدبر کریں تو وہ تفسیر بالرائی کے مرتکب ہوں گے۔

جواب: قرآن مجید چونکہ خالق کا کلام ہے اور اس میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو کسی کلام میں ہوسکتی ہے لہٰذا اس کے جملہ پہلوؤں پر پوری طرح اطلاع صرف اسی کی ذات کو ہی ہوسکتی ہے جس نے اس کو نازل فرمایا اور اس کے تمام رموز ونکات پر عبور کامل بھی اسی کی ذات کے لئے ہے جس نے اس کو خلق فرمایا ہے۔

اور ظاہری اعتبار سے اگرچہ ایک کلام میں احتمالات متعددہ پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کرتا کہ ہر پیدا ہونے والا احتمال جو قواعد عربیہ یا محاورات اہل لسان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ وہ خواہ مخواہ مراد متکلم بھی ہو۔ چنانچہ معمولی قابلیت کا انسان اس حقیقت کا معترف ہے بلکہ یہ چیز فطرت سلیمہ کے مسلمات میں سے ہے۔ بس خداوند کریم نے اپنے مقدس کلام کو جس پاک وجود پر نازل فرمایا۔ اس کو قرآن کا علم بھی ساتھ ساتھ عطا فرمایا۔ کیونکہ اگر قرآن لانے والے کو قرآنی علوم پر عبور تام حاصل نہ ہو تو اس کا قرآن لانا سوائے مضحکہ کے اور کچھ نہیں اور اسی طرح جن کو تا قیام

قیامت قرآنی تبلیغات پر مامور فرمایا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے بھرے مجمع میں اپنے بعد کے لئے ان کی خلافت کا اعلان فرمایا اور دیگر فرامین میں متعدد مقامات پر ان کا قرآن کے ساتھ ہونا اور قرآن کا ان کے ساتھ ہونا ذکر فرمایا۔ جس طرح کہ حدیث ثقلین جو تواتر سے فریقین کی کتب میں منقول ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی قرآنی علوم کما حقہ، عطا فرمائے۔ پس جس طرح کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم قرآن تھے اسی طرح وہ بھی عالم قرآن ہیں اور اگر قرآن کا علم صرف اللہ نے اپنی ذات تک محدود رکھا ہوتا۔ اور مبلغین کو اس سے بہرہ ور نہ فرمایا ہوتا تو صرف کتاب کا کسی کو عطا کر کے بھیجنا فضول ہوتا اور اس کی حیثیت ایسی ہوتی۔ جس طرح ایک چٹھی ارساں ایک خط کسی مکتوب الیہ کی طرف پہنچائے۔ جس کو نہ وہ خود پڑھ سمجھ سکتے اور نہ مکتوب الیہ کو اس سے کچھ حاصل ہو۔ اور اس صورت حال پر مطلع ہونے والا سنجیدہ طبقہ چٹھی رساں، یا مکتوب الیہ کو قابل ملامت ہرگز نہ سمجھے گا۔ بلکہ خط بھیجنے والے کی عقل و دانش کا ماتم کرے گا اور خداوند علیم و حکیم اس قسم کے نقائص سے بلند و بالا اور اجل و اعلیٰ ہے پس اس نے اپنی کتاب کا علم مبلغین کتاب کو کما حقہ، عطا فرمایا۔ اور انہی کو راسخین فی العلم کے مقدس لقب سے سرفراز فرمایا اور لوگوں کو اس کے علم حاصل کرنے اور اس میں تدبر کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ راسخین فی العلم کے دروازہ پر جبہ سائی کر کے ان سے فیوض معرفت حاصل کریں اور مطالب حقہ قرآنیہ تک دسترس حاصل کر کے اپنے قلوب کو انوار علوم قرآنیہ کی روشن قندیلوں سے منور کریں۔

اسی بناء پر ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو اپنی عقل فاسد اور ذہن کاسد سے قرآنی مطالب کا استنتاج کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور قرآن والوں سے مطالب صحیحہ تک

رسائی کا درس حاصل نہیں کرتے اور اسی چیز کو احادیث نبویہ میں تفسیر بالرائے سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کی پرزور مذمت کی گئی ہے جو قرآن کی تفسیر اپنی آرائے فاسدہ سے کرتے ہیں اور جہاں تدبر وتفکر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان کی محنتوں اور ذہنی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو احادیث نبویہ اور فرامین عترت طاہرہ کی روشنی میں قرآنی مطالب میں غور وخوض کرتے ہیں۔

پس قرآنی جملہ علوم اور محکمات ومتشابہات کی تمام تر معلومات کا راسخین فی العلم میں بند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر نہ ہو اور ان کے علوم دینیہ کا مرکز ایک ہو جو ان کو ہمیشہ کے لئے تشتت وافتراق کی وبائی روحانی امراض سے بچائے رکھے کیونکہ مرکز علم کی وحدت سے بڑھ کر کسی قوم کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے اور کوئی علاج کارگر ہے ہی نہیں جس طرح کہ اقوام عالم کی تاریخ کا سچا مطالعہ اس کا شاہد ہے۔

پس خداوند کریم نے ایک طرف تدبر اور تفکر کی دعوت عام دے دی۔ اور دوسری طرف مرکز علم کو مستحکم اور مضبوط کر کے اختلافی مسائل حل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی تاکہ نہ ان میں قران فہمی کی شوق کم ہو اور نہ اپنی آراء وقیاسات میں پڑ کر راہ حق سے دور نکلنے پائیں یا یوں سمجھئے کہ علوم قرآنیہ کی طرف شوق وشغف کا اضافہ بھی ہوتا ہے اور راسخین کی ہدایات کے ماتحت حدود متعینہ سے باہر رجانے کی نوبت بھی نہ آئے۔

پس قرآن کے علوم کا راسخین فی العلم منحصر ہونا عوام الناس کے تدبر فی القرآن کی دعوت سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔ ہاں! اگر متشابہات کا علم صرف ذات خدا میں منحصر قرار دیا جائے تو پھر تدبر وتفکر کی دعوت قطعاً بے محل ہے کیونکہ نہ تو انسان خود اپنی ذہنی

صلاحیتوں سے مطالب واقعہ تک دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صحیح تاویل صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے اور نہ اس میں کسی سے رہبری حاصل کر سکتا ہے پس تدبر وتفکر کا نتیجہ اس صورت میں صرف تفسیر بالرائے ہے جس سے پرزور منع کیا گیا ہے لہٰذا صحیح مطلب اسی صورت میں نکلے گا کہ اَلرّٰاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا عطف اللہ پر ہو اور ساتھ ساتھ یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا نے ان کو قرآن کے محکمات و متشابہات کا کامل علم عطا فرمایا ہے اس سے تدبر و تفکر کا حکم بھی صحیح ہے کیونکہ مقام خطا پر راسخین کی طرف رجوع کر کے مطالب صحیح تک رسائی ممکن ہے اور اس میں تفسیر بالرائے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

مخالفت عمل صدر اول سے لے کر آج تک علمائے مفسرین نے قرآن مجید کی تمام آیات کی تفاسیر اور حل مطالب میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور کسی مشکل سے مشکل ترین آیت کی تفسیر کو اس لئے ترک نہیں کیا کہ یہ متشابہ اور اس کا علم صرف ذات احدیث تک ہی محدود ہے اس میں فرق نہیں کہ علمائے مفسرین شیعہ ہوں یا سنی تمام کا یہی رویہ رہا ہے پس یہ عمل صاف بتلاتا ہے کہ والراسخون کا عطف اللہ پر ہے اور بعد میں آنے والا جملہ مستانفہ نہیں بلکہ راسخین سے حال ہے۔

مخالفت عقل قرآنی میں آیات متشابہات نازل فرما کر اس کا علم کسی کو نہ دینا قرآن مجید کے تاقیامت ہادی ہونے کو باطل کرتا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ خدا مبلغین کو تبلیغ امور قرآنیہ پر مامور فرمائے اور ان کو قرآن کے اکثر مطالب کا واقعی علم نہ عطا کرے۔ جس طرح کہ گزشتہ بیان میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے پس معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن تاقیامت ہادی ہے اس کے ساتھ ساتھ مبلغین قرآن کا سلسلہ بھی تاقیامت جاری ہے جو تمام قرآنی رموز و نکات کا واقعی علم رکھتے ہیں ان کو محکم و متشابہ عام و خاص۔ ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، تاویل و تنزیل اور ظاہر و باطن وغیرہ کا کما حقہ،

علم حاصل ہے اور وہ صرف محمد و آل محمدؐ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل تفسیر کی جلد اول میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور مخالفت نقل اس لئے ہے کہ کتب فریقین میں یہ چیز مسلم حیثیت رکھتی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے عالم قرآن ہونے پر تقریباً تمام صحابہ متفق تھے اور جناب رسالت مآبؐ کا فرمان اس مطلب پر نص قاطع ہے اور تاریخ صاف صاف بتلاتی ہے کہ صحابہ کرام قرآن کے مشکل مسائل کا حل حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے ہی طلب کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ تواتر سے منقول ہیں: لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرَ۔ (اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔" چنانچہ مقدمہ تفسیر کے (ص ۸۷، ۸۸) پر بہ حوالہ جات کتب اس مطلب کو بیان کیا جا چکا ہے۔

احادیث آئمہ اس بارہ میں تواتر سے منقول ہیں کہ تمام قرآن کا علم اہل بیتؑ عصمت کے پاس ہے چنانچہ جلد اول (ص ۱۳۸، ۱۳۹) میں بعض احادیث کو میں نے نقل کیا ہے اور تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر دور میں جب قرآنی مسائل مشکلہ میں علمائے مذاہب لاجواب ہو جاتے تھے تو آئمہ اہل بیتؑ کی طرف رجوع کرنے کے بغیر ان کو کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔ پس ان حقائق پر نظر دوڑانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کا عطف لفظ اللہ پر ہے اور آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ تاویل آیات متشابہ کو سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے اور کوئی نہیں جانتا۔

تاویل قرآن

تاویل کا لغوی معنی ہے پلٹانا۔ لیکن یہاں مراد ہے معنی کی بازگشت اور بازگشت سے مراد اس طرح نہیں جس طرح کہا جاتا ہے کہ غلام کی بازگشت آقا اور عدد کی بازگشت واحد ہے بلکہ یہاں بازگشت مراد رجوع خاص ہے اور تاویل قرآن سے مراد

وہ حقیقی وخارجی واقعہ یا مصلحت جس پر کلام کا اعتماد ہو۔ اور وہ اس کلام کا سچا مصداق ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں تاویل کے متعدد استعمالات پر عبور کرنے سے اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہوسکتا ہے۔

① کیل ووزن کی درستی واستقامت کے امر کے بعد فرماتا ہے ذَالِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاوِيلاً یعنی کیل ووزن کی صحت واستقامت کی تاویل بہت خوب ہے اور اس سے مراد تمدنی واجتماعی خوشحالی ہے۔

② کافروں کے بارے میں فرماتا ہے۔ کیا وہ یہ کہتے ہے کہ یہ باتیں افترا ہیں پھر فرماتا ہے کہ انہوں نے ایسی شئے کی تکذیب کی ہے۔ جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہے اور نہ اس کی تاویل ان کے پاس پہنچی ہے۔ یعنی قیامت کی خبروں کو انہوں نے جھٹلایا تھا۔ اور رسول پاکؐ کی طرف نسبت افتراء کی دی تھی۔ پس خداوندکریم نے قیامت کے دن میں واقع ہونے والے امور کو جو قرآنی خبروں کے مصداق ہیں، تاویل کا نام دیا ہے۔

③ حضرت خضر علیہ السلام کے کشتی کو توڑنے اور لڑکے کو قتل کرنے اور دیوار بنانے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کرنے کے بعد ان کا کہنا ہے کہ میں آپ کو ان چیزوں کی تاویل بتلاتا ہوں تو ان مصالح واقعیہ کو ان امور کی تاویل کہا گیا، جو حضرت خضر علیہ السلام سے صدور پذیر ہوئے تھے۔

④ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں تعبیر خواب کو متعدد مقامات پر تاویل سے یاد کیا گیا۔

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاویل سے مراد وہ حقائق خارجیہ اور مصالح

واقعہ ہیں جن پر آیات قرآنیہ کے معارف وعلوم شرائع واحکام اور جملہ قصص وحکایات کا مدار واعتماد ہے اور اس کا ماحصل اور خلاصہ۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کے معانی اور جملہ مضامین میں جہاں تک عام انسانی عقول کی رسائی ہے یہ قرآن کا جسم ظاہری ہے اور اس کے پس پردہ ایسے حقائق ودقائق اور مصالح وحکم موجود ہیں جو روح قرآن ہیں اور اسی کو ام الکتاب۔ کتاب حکیم اور کتاب مکنون کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

اور قرآن مجید کے تمام معارف واحکام کی بازگشت اور جائے اعتماد وہی ہیں وہ نہ الفاظ ہیں اور نہ معانی ومضامین ظاہریہ کی قسم سے ہیں اسی لئے ان تک نہ افہام عامہ کی رسائی ہے اور نہ عقول بشریہ ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی بناء پر فرماتا ہے:

اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ

اس کو مس نہ کر سکنے کا مطلب ہے کہ اس کے حقائق واقعیہ اور معارف باطنیہ جو الفاظ مبینہ اور مضامین متعینہ کا مآل ومرجع ہیں۔ ان تک سوائے نفوس قدسیہ اور ذوات مطہرہ کے کسی کی رسائی نہیں اور آیۂ تطہیر اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ الخ سے ان ذوات مقدسہ کی تعین بھی فرمادی جو پاک اور مطہر ہیں۔ کہ وہ اہل بیتؑ عصمت اور خانوادہ نبوت ہیں پس یہاں ہمیں دو عصر معلوم ہو گئے۔

① آیات الٰہیہ کی تاویل یعنی مضامین قرآنیہ کے حقیقی مصداقات کو کوئی نہیں جان سکتا مگر اللہ اور رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔

② کتاب مکنون کو کوئی نہیں مس کر سکتا مگر وہ جو مطہر ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تاویل قرآن کا علم اور مس ایک چیز ہے اور راسخین فی العلم اور مطہرین ایک ہی خانوادہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ راسخین فی العلم اور مطہرین تاویل کا علم

رکھتے ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ تاویل کا تعلق صرف آیات متشابہ سے نہیں بلکہ آیات محکمات سے بھی ہے اور اسی کو تو قرآن مجیدہ کا باطن کہا جاتا ہے۔ جس کا تعلق تمام آیات قرآنیہ کے ساتھ ہے اور اس کی ظاہری مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح انسان نکاح کرتا ہے تو اس کا ظاہری مفہوم ہے تکمیل خواہشات جنسیہ لیکن اس کا اتباع سنت رسولؐ ہے اور اس کے باطن میں انسان کی تنظیم اور بے راہ روی سے اجتناب کرتے ہوئے جذبہ انسانیت کی تکمیل ہے نیز پھر اسی کے باطن میں انسان کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کے فطری تقاضوں کے پورا کرنے کا راز بھی پنہاں ہے پھر اس کے اندر بقاء نوع انسانی کا راز بھی مضمر ہے اور اس کا آخری مقصد ہے نعمات جنت کی تحصیل جو کمال روح کی آخری منزل ہے۔

پس نکاح کا ظاہری اور سرسری معنی ہے خواہشات جنسیہ کا دفاع لیکن اس کا ایک باطن ہے اور باطن در باطن یہاں تک کہ تدریجاً کئی بواطن ہیں اور اسی طرح آخری باطن تک۔ سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ پس معمولی دماغ کا آدمی صرف ظاہری معنی سمجھتا ہے اور بلند پایہ اذہان وافکار کے مدارج کے لحاظ سے اس کے مراتب باطنیہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کا ایک ہے ظاہری ترجمہ اور ان مطالب ومضامین اور احکام وفرامین کا سمجھنا جن تک عقول انسانیہ اور افکار بشریہ اپنی اپنی خداداد استعدادات سے رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور ایک ہے اس کا باطن جو ان معانی اور مطالب ظاہریہ کے لئے بحیثیت روح کے ہے جس کو عام انسانی عقول وافکار مس تک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کی دسترس سے بلند وبالا ہے اور اس کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کے اذہان وقلوب ہر قسم کے ارجاس باطنیہ سے پاک ومطہر ہوں جیسے ارشاد ہے:

لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ

پس قرآن مجید کا ظاہری ترجمہ اور اپنے ذہنی استعدادات کے ماتحت اس کے مطالب کا استنتاج اور اس کے احکام و فرامین تک دسترس حاصل کرنے کے لئے غور و خوض اور متعدد معانی میں سے باعتبار قرائن کے بعض کی بعض پر ترجیح وغیرہ یہ سب کچھ تفسیر قرآن ہے۔ جس پر ہر شخص موفق ہو سکتا ہے اور متشابہ آیات متشابہ کا حل انہی کی روشنی میں ہوتا ہے لیکن وہ امور خارجیہ اور مصالح واقعیہ جو قرآن کے معانی و مفاہیم اور مطالب و مضامین ظاہریہ کا مرجع و مآل اور مصداق حقیقی ہیں وہ باطن قرآن اور روح ہیں اور انہیں تاویل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کا علم سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے پس اس بیان سے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کی وضاحت ہوگئی اور تفسیر و تاویل کے درمیان مفسرین نے کئی فرق بتائے ہیں:

1. تفسیر اس لفظ کا معنی بیان کرنا جس میں متعدد احتمالات نہوں اور تاویل سے مراد ہے متعدد احتمالات میں سے ایک کو ترجیح دینا۔
2. تفسیر معنی کی دلیل کو بیان کرنا اور تاویل معنی کی حقیقت کا ظاہر کرنا۔
3. تفسیر معنی ظاہری کو بیان کرنا اور تاویل معنی مشکل کو واضح کرنا۔
4. تفسیر کا تعلق روایت اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔
5. لیکن قرآن کی وہ آیات جن میں تاویل کا استعمال ہوا ہے ان کی روشنی میں ان اقوال کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں رہتی۔

پس تحقیق وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اور آئمہ طاہرین علیہم السلام سے بعض آیات کی جو تاویلیں منقول ہیں وہ ہمارے بیان کی تصدیق و تائید کے لئے کافی ہیں اور

اسی تفسیر کے مقدمہ (ص ۹۷) پر بھی تفسیر وتاویل پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۱۹۵ تا ۲۰۱)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا

بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (آل عمران: آیت ۱۸)

''شہادت دی اللہ نے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور صاحبان علم نے درحالیکہ وہ عدل پر قائم ہیں۔''

فضیلت اہل علم

وَاُولُوا الْعِلْمِ :اس آیت مجیدہ میں ذات ذوالجلال نے علم وعلماء کی فضیلت کو اجاگر فرمایا ہے؟ کیونکہ علماء کا ذکر ملائکہ کے ذکر کے ساتھ اور ان کی شہادت کو ملائکہ کی شہادت کے ساتھ متصل فرمایا ہے اور صرف انہی کا ذکر کر کے باقی مخلوق کا تذکرہ ترک فرما دیا ہے اور وہ علم جس کی بدولت علماء کا ذکر خالق کائنات نے ملائکہ کے ساتھ کیا اور ان کی شہادت کا اہمیت سے تذکرہ فرمایا۔ علم توحید ہے یا جو علم علوم توحید سے وابستہ ہیں یعنی علوم شرعیہ، دینیہ اس جگہ مراد ہیں کیونکہ شہادت اسی مطلب پر ہے یہی وجہ ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام اور خود جناب رسالت مآبؐ نے تحصیل علوم دینیہ پر بڑا زور دیا اور علماء کے فضائل بہت زیادہ بیان فرمائے چنانچہ مجمع البیان میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ عالم کا ایک گھنٹہ تک اپنے تکیہ پر آرام سے اپنے علم میں غور وفکر کرنا ایک عبادت گزار کی ستر برس کی عبادت سے افضل وبرتر ہے اور انس بن مالک سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا لوگو! علم سیکھو کیونکہ اس کا سیکھنا نیکی ہے اس کے درس وتدریس میں ثواب تسبیح خدا ہے اس کا تکرار ومباحثہ جہاد ہے اس کا ان پڑھ کو پڑھانا صدقہ ہے اور اس کی اپنے اہل کو یاددہانی کرانا قربت

ہے کیونکہ یہ حلال وحرام کا نشان ہے اور جنت ونار کے راستوں کا مینار ہے۔ یہ وحشت کا مونس مسافرت کا ساتھی۔ تنہائی میں ہم کلام وہمدم۔ خوشی وغمی میں رہبر۔ دشمن کے سامنے ہتھیار اور غرباء کے نزدیک موجب قرب ہے اسی کے ذریعہ سے خدا قوموں کو سربلندی عطا فرما کر ان کو امور خیر میں پیشتر دبنا تا ہے تا کہ ان کی اقتداء کی جائے اور ان کے نقش قدم پر چلایا جائے اور ان کے مشوروں کو آخری فیصلہ قرار دیا جائے فرشتوں کو ان کی دوستی محبوب ومرغوب ہے وہ اپنے پروں کو ان سے مس کرتے ہیں اور اپنی نمازوں میں ان کے لئے بخشش طلب کرتے ہیں بلکہ ہر خشک وترحتی کہ دریاؤں کی مچھلیاں اور دوسرے جانور۔ زمین کے درندے اور چوپائے آسمان اور اس کے ستارے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ آگاہ رہو! علم دلوں کی زندگی۔ آنکھوں کا نور اور جسموں کی طاقت ہے۔ یہ انسان کو شرفاء کی منازل اور سلاطین کی مجالس تک پہنچاتا ہے اس میں غور وخوض روزوں کے برابر اور اس اور اس کی درس وتدریس عبادت کے برابر ہے اور اسی کے ذریعے سے حرام وحلال کی پہچان اور صلہ رحمی ہوتی ہے علم عمل کا پیش رو اور عمل اس کا مقتدی ہے یہ نیک بختوں کو عطا ہوتا ہے اور بد بخت اس سے محروم رہتے ہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہم اولوالعلم ہیں اور ہم ہی حلال وحرام کو جانتے ہیں۔ (البرہان)

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (العمران: آیت ۱۹)

"تحقیق دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور نہیں اختلاف کیا۔ ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر بعد آجانے علم کے باہمی حسد کی وجہ سے

اور جو کفر کرے آیات خدا سے۔ تو تحقیق اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ: تفسیر برہان اور مجمع البیان میں تفسیر قمی سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسلام کی ایسی نسبت بیان کرتا ہوں جو نہ مجھ سے پہلے کسی نے بیان کی اور نہ میرے بعد کوئی بیان کرے گا اور وہ یہ کہ اسلام تسلیم کا نام ہے اور تسلیم یقین کا نام ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق کا مطلب اقرار ہے اور اقرار کا معنی ادا کرنا ہے مومن اپنا دین خدا سے لیتا ہے اور اس کا ایمان اس کے عمل سے پہچانا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے معلوم ہوتا ہے۔ اے لوگو! دین کو اختیار کرو۔ کیونکہ اس میں گناہ کرنا بے دینی کی نیکی سے بہتر ہے اس لئے کہ دین کے ہوتے ہوئے گناہ بخشا جا سکتا ہے لیکن بے دینی میں کوئی نیکی قابل قبول ہی نہیں ہے۔ بروایت ابن شہر آشوب امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اسلام سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا تسلیم کرنا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بلند ہے جس طرح کہ کعبہ کا درجہ مسجد الحرام سے بلند ہے۔

اَقُولُ: پہلی حدیث میں ہے کہ ایمان کی پہچان عمل سے ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام ولایت علی علیہ السلام کو مان لینے کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ جو ولایت کے قائل ہیں وہ مسلمان ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں وہ مومن ہیں اور جو ولایت کے قائل نہیں۔ وہ نہ مسلمان ہیں نہ مومن اسی بنا پر فرمایا:

لَوِاجْتَمَعَ النَّاسُ عَلٰى حُبِّ عَلِيٍّ لَمْ يَخْلُقِ اللّٰهُ النَّارَ وَقَالَ حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَضُرُّ مَعَهَا سَيِّئَةٌ وَبُغْضُ عَلِيٍّ سَيِّئَةٌ لَا يَنْفَعُ مَعَهَا حَسَنَةٌ

"اگر تمام لوگ علی علیہ السلام کی محبت پر جمع ہو جائیں تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا اور فرمایا: علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی

گناہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔ اور علیؑ کے ساتھ عداوت کرنا ایسا گناہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ مند نہیں ہوتی۔"

اور دوسرے رکوع کے ذیل میں اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ کی تفسیر میں بھی اسی مطلب کی بعض حدیثیں مذکور ہو چکی ہیں نیز مقدمہ انوار النجف (ص ۴۵) پر بھی ملاحظ ہوں۔ یعنی حضرت علی علیہ السلام کی ولایت رکھنے والے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول ہوتی ہے اور گناہوں کے نقصان سے بچ جاتے ہیں اور دشمن علیؑ کی نہ نیکی قبول اور نہ گناہ سے توبہ قبول ہوتی ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۲۰۸)

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۙ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

"پھر کیا حال ہوگا جب ان کو جمع کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو اپنی کمائی (کا بدلہ) اور ان کو خسارہ نہ دیا جائے گا تم کہو۔ اے اللہ مالک ملک عطا فرماتا ہے ملک تو جسے چاہے اور لے لیتا ہے ملک تو جس سے چاہے اور عزت دیتا ہے جسے چاہے اور ذلیل کرتا ہے جسے چاہے تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے۔ تحقیق تو ہر شے پر قادر ہے۔"

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے جنگ احزاب کے

موقعہ پر خندق کی کھدائی کے لئے صحابہ کے لئے چالیس (۴۰) ذراع مقرر کئے مہاجر اور انصار میں ہر جماعت سلمان کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھی تو حضورؐ نے فرمایا: اَلسَّلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ۔ پس خندق کی کھدائی شروع ہوئی۔ تو نیچے سے ایک پتھر سخت ایسا نکلا۔ کہ اس پر کدال کام نہ کرتی تھی۔ پس سلمان جناب رسالت مآبؐ کے خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا سنایا۔ تو آنحضرتؐ بنفس نفیس خود تشریف لائے اور پھر سلمان کے ہمراہ خندق میں اترے اور سلمان کے ہاتھ سے کدال لے کر اس کو پتھر پر مارا۔ تو اس کا ایک حصہ توڑ دیا اور اس پتھر سے بجلی کی طرح ایک روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور صحابہ نے بھی تکبیر پڑھی۔ پھر آپ نے دوبارہ اس کدال کو اس پتھر پر مارا۔ اور پھر اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور بجلی کی مانند ایک روشنی ظاہر ہوئی پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اور صحابہ نے بھی نعرہ تکبیر کہی۔ پھر حضورؐ نے سہ بارہ کدال کو اس پتھر پر مارا۔ کہ وہ پتھر بالکل ٹوٹ گیا اور مثل سابق روشنی نمودار ہوئی۔ پس حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ اس کے بعد حضورؐ سلمان کے ہاتھ کو پکڑ کر خندق سے باہر تشریف لائے۔ تو سلمان نے عرض کی۔ یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آج میں نے آپ سے نئی بات دیکھی ہے۔ پس حضورؐ متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جب میں نے پہلی ضرب لگائی اور روشنی پیدا ہوئی تو میں نے اس میں حیرہ اور مدائن کے محل دیکھے اور جبرئیلؑ نے بتایا۔ کہ آپ کی امت کو اس پر غلبہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جب دوبارہ میں نے پتھر پر کدال کی ضرب لگائی اور روشنی ظاہر ہوئی تو میں نے ملک روم کے محلات دیکھے اور جبرائیلؑ نے خبر دی کہ آپ کی امت کو ان پر بھی غلبہ ہوگی اور تیسری مرتبہ ملک صنعاء کے محلات دکھائی دیئے اور جبرائیلؑ نے مجھے فتح کی خبر سنا لوں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۲۱۱)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○

"فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ اللہ تم کو محبوب رکھے اور بخش دے تمہارے گناہ، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے فرما دیجئے اطاعت کرو اللہ اور رسول کی پس اگر روگردانی کرو تو تحقیق اللہ نہیں محبوب رکھتا کافروں کو۔"

معیارِ محبت

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ : یہ آیت کھلے لفظوں اعلان کر رہی ہے کہ محبت کا دعویٰ صرف زبانی کافی نہیں جب تک عملی طور پر اس محبت کی تصدیق نہ ہو۔ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّعْلَمَ اَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهٗ فَلْيَعْمَلْ بِطَاعَةِ اللّٰهِ وَلْيَتَّبِعْنَا

"جس کو یہ پسند ہو کہ وہ جان لے کہ اللہ اس سے محبت رکھتا ہے تو اسے اللہ کی اطاعت اور ہماری پیروی کرنی چاہیے۔"

اس مقام پر مولانا مقبول صاحب مرحوم کو ایک اشتباہ ہوا ہے کہ انہوں نے مَن شرطیہ کو مَنْ حرف جر سمجھا اور سَرَّهٗ شرط مجرور مِن کا قرار دیا حدیث پاک کے مذکورہ جملہ کا ترجمہ یوں بیان کیا کہ (اسرار دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ جان لے کہ خدا اس سے محبت رکھتا ہے پھر وہ خدا کی اطاعت کرے اور ہماری پیروی) حالانکہ یہ ترکیب اور ترجمہ بالکل غلط ہے اور درست وہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں اس کے بعد آپ

نے آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا۔ خدا کی قسم کبھی کوئی بندہ اللہ کا اطاعت گزار نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہ خدا اپنی اطاعت کے اندر ہماری اتباع اس کے دل میں ڈالتا ہے اور قسم بخدا کی کہ کوئی بندہ ہماری اتباع نہیں کرتا۔ مگر یہ اس سے اللہ محبت رکھتا ہے اور باخدا کوئی شخص ہماری اتباع کو نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ وہ ہمارے ساتھ بغض رکھتا ہے اور باخدا ہمارے ساتھ جو بھی بغض رکھے گا وہ اللہ کا نافرمان ہوگا اور جو بھی اللہ کا نافرمان ہو کر مرے گا اس کو خدا رسوا کرے گا۔ اور اوندھے منہ اس کو جہنم میں ڈالے گا۔ ایک حدیث میں حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس امت میں سے جو بھی ہمارے حق کا عارف ہوگا۔ وہ ناجی ہوگا۔ سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک حاکم ظالم کا ساتھی دوسرا خواہش پرست۔ تیسرا اعلانیہ فسق کرنے والا۔

اور نیز آپ سے مروی ہے کہ دین تو صرف محبت ہی کا نام ہے۔ پھر اسی آیت سے استشہاد فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو اطاعت رسولؐ کرو۔ پس خدا تم سے محبت رکھے گا۔ گویا اصل دین محبت ہے اور اطاعت اس کی فرع ہے۔ اور فرع کا درست نہ ہونا اصل کی کمزوری یا فقدان کی دلیل ہے۔ نیز آپ سے مروی ہے کہ فرمایا۔ اس شخص کی اللہ سے محبت نہیں جو اس کی نافرمانی کرے پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

تَعْصِی الْإِلٰـهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ
هٰذَا مُحَالٌ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ
اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

"اللہ کی نافرمانی اور ساتھ اس کی محبت کا دعویٰ یہ بات قطعاً محال ہے۔
اگر تجھے سچی محبت ہوتی تو اس کی اطاعت ضرور کرتا کیونکہ محب اپنے

محبوب کا مطیع ہوا کرتا ہے۔"

امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت ہے کہ اگر کوئی پتھر بھی ہماری محبت رکھتا ہوگا تو خدا اس کو بھی ہمارے ساتھ محشور کرے گا، کیونکہ دین تو محبت ہی کا نام ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ○ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○

"تحقیق اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں سے حالانکہ یہ ذریت بعض سے ہے اور اللہ سننے جاننے والا ہے۔"

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ: قرأتِ اہلِ بیت میں آلِ عمران کے بعد آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لفظ ہیں بلکہ تفسیر برہان روایات میں ہے کہ آل ابراہیم سے مراد آل محمدؐ ہے۔ جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ جب وہ آل محمد ابراہیم اور آل عمران کا ذکر کریں تو خوش ہوتے ہیں اور جب آل محمد کا ذکر ہو تو ان کے دل گھٹتے ہیں اور مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے اگر کوئی شخص بروز محشر ستر نبیوں کے اعمال کے برابر بھی نیک اعمال پیش کرے گا۔ تو اس کے اعمال مقبول نہ ہوں گے جب تک میری اور علی بن ابی طالب کی ولا کو پیش نہ کرے گا۔

آلِ عِمْرَانَ: عمران تین گزرے ہیں ایک حضرت موسیٰؑ اور ہارون کے والد ماجد دوسرے حضرت مریمؑ کے والد، اور تیسرے حضرت ابوطالبؑ، کیونکہ ان کا نام دراصل عمران تھا۔ آیت مجیدہ میں بعض لوگوں نے آل عمران سے مراد حضرت موسیٰ وہارون لئے ہیں اور بعض نے حضرت عیسیٰ مراد لئے ہیں اور تفسیر عمدۃ البیان میں ہے کہ

تفسیر اہل بیت میں آل عمران سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور بروایت ابن عباس انہوں نے نقل کیا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میں آل ابراہیم علیہ السلام ہوں اور علی علیہ السلام آل عمران ہیں۔

تنبیہ: آل ابراہیم اور آل عمران کی لفظیں گو عام ہیں لیکن ان سے مراد صرف وہ انسان ہو سکتے ہیں جو طاہر اور معصوم ہوں کیونکہ اصطفاء غیر معصوم کا نہیں ہو سکتا اور نیز اس آیت سے یہ صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ملائکہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ ان کو عالمین پر چنا گیا ہے اور فرشتے عالمین میں داخل ہیں۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: یعنی خدا ان کے اقوال سننے والا اور نیتوں کے جاننے والا ہے اور چونکہ ان کے اقوال ونیات میں کوئی نقص نہیں تھا بلکہ وہ ظاہری وباطنی دونوں قسم کی کثافتوں سے صاف تھے اور طاہر ومعصوم تھے لہٰذا تمام جہانوں پر ان کو مصطفیٰ بنا دیا۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷)

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (ال عمران:۳۶)

"جب عرض کی زوجہ عمران نے اے رب: میں نے نذر کی ہے تیرے لئے وہ جو میرے شکم میں ہے کہ (وہ عبادت کے لئے) آزاد ہوگا۔ پس تو قبول فرما میری نذر کو تحقیق تو سننے جاننے والا ہے پس جب اس کو جنا تو عرض کی اے رب: میں نے لڑکی جنی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا جنا

ہے اور نہیں لڑکا مثل لڑکی کے اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں
تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو۔" (آلعمران آیت ۳۶)

کے میوہ جات موجود پاتے تھے مثلاً موسم گرما میں موسم سرما کے میوے اور موسم سرما میں موسم گرما کے اور بالکل تر و تازہ۔ اور حیرت سے دریافت فرماتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ تو وہ جواب میں کہتیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے اور حضرت مریم علیہ السلام کو خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ جب محراب عبادت میں مشغول نماز ہوتیں تو ان کی جبین مبین سے ایک نور ساطع ہو کر محراب کو منور کر دیتا تھا۔ (صافی)

سبحان اللہ: یہ مریم کی شان تھی۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے حضرت مریم کبریٰ صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شان کے متعلق بھی صرف ایک روایت عرض کرتا ہوں جو اس مقام پر نہایت موزوں ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب فاطمہ علیہ السلام اور حضرت امیر علیہ السلام کے خانگی معاملات کا دستور یہ تھا کہ گھر کے تمام کام کاج بتول معظمہؑ کے ذمہ اور باہر کے امور حضرت امیر علیہ السلام کے ذمہ تھے ایک دن جب امیر المومنین علیہ السلام گھر میں تشریف لائے تو دریافت فرمایا۔ اے فاطمہؑ: کوئی چیز کھانے کے لئے ہے؟ تو خاتون جنتؑ نے عرض کی کہ آج تیسرے روز سے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے پہلے اطلاع کیوں نہ دی! تو مخدومہ نے عرض کی کہ بابا جان نے فرمایا ہے کہ اپنے ابن عم (شوہر) سے کسی چیز کی فرمائش نہ کیا کرو۔ اگر وہ خود کچھ لائیں تو احسان سمجھو ورنہ کسی شے کے لانے کی فرمائش نہ کرو۔ پس آپ باہر تشریف لائے اور کہیں سے ایک دینار قرض لیا۔ بوقت شام واپس تشریف لا رہے تھے کہ رستہ میں مقداد بن اسود سے ملاقات

ہوئی۔ آپؑ نے اس سے بے وقت گھر سے نکلنے کا سبب دریافت فرمایا۔ تو اس نے عرض کی یا امیر المومنین علیہ السلام بھوک کے مارے گھر سے نکلا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے گھر سے نکلنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ اور ایک دینار قرض لایا ہوں۔ لیکن تیری ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھتا ہوں۔ لہٰذا یہ دینا تو لے لے۔ پس دینار مقداد کو دے کر خالی ہاتھ واپس گھر کی طرف متوجہ ہوئے دیکھا کہ جناب رسالت مآبؐ تشریف فرما ہیں اور خاتون معظمہ مصروف عبادت ہیں اور درمیان میں ایک سرپوش سے ڈھکی ہوئی چیز موجود ہے۔ بی بی پاک جب نماز سے فارغ ہوئیں اور سرپوش اتارا۔ تو دیکھا ایک بڑا برتن ہے جو گوشت وروٹی سے پر ہے اس مقام پر جناب امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

يَافَاطِمَةُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا۔

''(اے فاطمہ) آپ کو یہ چیز کہاں سے پہنچی؟''

تو جناب سیدہ نے عرض کی۔

هُوَمِنْ عِنْدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِحِسَابٍ

''یہ اللہ کی جانب سے ہے اور خدا جسے چاہے بے حساب رزق عنایت فرماتا ہے۔'' (تفسیر انوار النجف: جلد ۳، پارہ ۳، ص ۲۲۲)

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ○ (آل عمران: ۴۱)

''عرض کی اے پروردگا! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ مجھے بڑھاپا

پہنچ چکا ہے۔ اور میری عورت بانجھ ہے کہا (فرشتے نے) کہ خدا اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے عرض کی اے رب مقرر کر میرے لئے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو نہ بولے گا لوگوں سے تین دن تک مگر اشارے سے اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور اس کی تسبیح کر صبح و شام۔"

شکم مادر میں کلام

حضرت یحییٰ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے اور حضرت یحییٰ چھ ماہ عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے شہید کر دیئے گئے تھے۔ تفسیر امام علیہ السلام سے تفسیر صافی منقول ہے کہ سوائے حضرت زکریا علیہ السلام کے حضرت مریم کے پاس کوئی بھی نہیں جایا کرتا تھا اور آپ جس طرف جاتے تھے حضرت مریم کے حجرہ کو قفل لگا کر جاتے تھے پس جب حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ہوا۔ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ لوگ اس معاملہ میں مجھے تہمت دیں گے چنانچہ اپنی زوجہ سے یہ ماجرا بیان کیا تو اس نے جواب دیا کہ آپ خوف نہ کریں اور مریم کو میرے پاس لائیں تاکہ میں اس سے حقیقت دریافت کروں۔ پس حضرت زکریا علیہ السلام یا حضرت مریم کو لائے تو چونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ حضرت مریم کی بڑی بہن تھی۔ لہٰذا تعظیم کے لئے نہ اٹھی تو حضرت یحییٰ نے بطن شکم مادر میں آواز دی اے اماں! آپ کے پاس جہان کی عورتوں کی سردار آئی ہے جو جہاں کے مردوں کے سردار کی ماں ہے لہٰذا آپ کو اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیے پس زوجہ زکریا علیہ السلام تعظیم مریم کے لئے اٹھیں۔

اہل بیت عصمت کے لئے بھی شکم مادر کے اندر کلام کرنا روایات سے ثابت ہے

کہتے ہیں جناب رسالت مآبؐ جب جناب فاطمہ بنت اسد کے پاس تشریف لاتے تھے تو جناب فاطمہ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ بعض بنی ہاشم نے بی بی کو اس تعظیمی قیام سے روکنا چاہا۔ تو شکم سے آواز بلند ہوئی کہ اماں پر یہ رسول وسید کائنات ہیں ان کی تعظیم کے لئے آپ کو اٹھنا چاہیے (کتب معتبرہ سے یہ روایت اگرچہ مجھے نہیں مل سکی لیکن بیان کرنے والے اسی طرح بیان کرتے ہیں البتہ یہ فعل قدرت خدا سے بعید نہیں اور نیز اس کی نظیر بھی پہلے حضرت یحییٰؑ میں موجود ہے۔ لہٰذا استعجاب کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح شکم اطہر میں جناب بتولؑ معظمہ خاتون جنت کا اپنی ماں کے لئے مونس تنہائی ہونا اور سید الشہداء روحی اور ارواح المومنین لہ الفدا کا شکم مادر میں اپنی والدہ ماجدہ سے ہم کلام ہونا بھی روایات میں موجود ہے جو خدا درخت میں کلام پیدا کر سکتا ہے۔ حیوانات سے کلام کروا سکتا ہے بلکہ جمادات سے بھی گویائی پیدا کر سکتا ہے چنانچہ جناب رسالت مآبؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کا بولنا اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرنا عام کتب میں مذکور ہے پس کیا عجب ہے کہ وہ بچے کو شکم کے اندر طاقت گویائی دے دے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے تو بعد از پیدائش بھی بچہ بولنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایک خاص عرصہ اس کی تربیت ظاہری میں صرف نہ ہو جائے پس ہر خلاف عادت چیز کو محال عقلی کہنے والے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مہد میں تکلم کرنے یا بچے کے حضرت یوسف کی پاکدامنی کی گواہی دینے کو بھی اوپری نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن قدرت خدا کو محیط جاننے والوں کے لیے جس طرح بعد از ولادت اور قبل از وقت بچے کا بولنا ممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح قبل از ولادت بھی ممکنات میں سے ہے البتہ عادتاً محال ہے لیکن بہت سے عادی محال بقدرت خدا واقع ہو جایا کرتے ہیں اور خدا ہر شے پر قادر ہے اور یہی چیز خاصان خدا کا دوسری عام مخلوقات

سے طرہ امتیاز ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳ ص ۲۲۶)

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ (آل عمران: آیت ۴۳)

''اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کیا اور تجھے برگزیدہ فرمایا عالمین کی عورتوں پر اے مریم قنوت کر اپنے رب کے لئے اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔''

انتخاب مریمؑ

وَاِذْ قَالَتْ : گذشتہ اذ قالت پر عطف ہے اور آیت جتلاتی ہے کہ حضرت مریم محدثہ تھیں کہ ان سے فرشتے کلام کرتے تھے اور پہلے اصطفا سے مراد قبول کر لینا اور دائرہ محبت میں لے لینا ہے اور دوسرے اصطفا سے مراد منتخب و برگزیدہ کرنا دوسروں کے مقابلہ میں ہے اسی لئے پہلا مطلق ہے اور دوسرا اعلیٰ کے ساتھ مستعمل ہے نیز ان کی طہارت سے مراد عصمت ہے اور بعضوں نے بتول ہونا مراد لیا ہے یعنی آلائش حیض سے پاک وصاف تھی تا کہ ہر وقت بیت المقدس میں رہ کر عبادت کر سکے اور بعید نہیں کہ دونوں معنی اس مقام پر مراد ہوں اور پہلا معنی زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا بعد میں تذکرہ ہے اور وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے پس حضرت مریم علیہ السلام کی عصمت کی پہلے شہادت دے دی تا کہ کسی کو اس کے متعلق شک وشبہ نہ رہے اور بدگمانی کی طرف کوئی ذہن اقدام نہ کرے۔

سوال: کیا حضرت مریمؑ کو پورے عالمین کی عورتوں پر برگزیدگی کا شرف

حاصل ہوا ہے؟

جواب: آیت مجیدہ کے ظاہری الفاظ تو اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں کیونکہ عالمین جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف ولام بھی داخل ہے اور قواعد کے لحاظ سے اس کا معنی استغراق ہوتا ہے۔ یعنی حضرت مریمؑ کو تمام جہانوں کی عورتوں پر خدا نے سبقت دے دی۔ اور نیز استثناء کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو تمام جہانوں کی عورتوں پر ترجیح دی گئی لہٰذا یہ کہنا کہ اس کو صرف اپنے زمانہ کی عورتوں پر فوقیت عطا کی گئی آیت مجیدہ کا ظاہر اس مطلب کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔

سوال: عقیدہ شیعہ کی رو سے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا عالمین کی عورتوں کی سردار ہے چنانچہ جناب رسالت مآبؐ سے اس بارہ میں متعدد فرامین صادر ہوئے ہیں نیز کتب فریقین میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: میری شہزادی فاطمہؑ جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جنت صرف ایک عالم کی عورتوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمین کی پاک و نیک عورتیں وہاں ہوں گی اور جناب فاطمہؑ بلا استثناء سب کی سردار ہیں لیکن آیت مجیدہ میں حضرت مریمؑ کو تمام جہانوں کی عورتوں میں سے برگزیدہ کہا گیا ہے اب ان ہر دو مقاموں پر غور کرنے کے بعد تعارض سامنے آ جاتا ہے اور آیت اور حدیث میں تعارض کی صورت میں آیت ہی کو ترجیح دی جایا کرتی ہے۔

جواب: آیت مجیدہ میں حضرت مریم علیہ السلام کو برگزیدگی کا تمغہ عطا کیا گیا ہے اور حدیث پاک میں جناب فاطمہ زہراؑ کو سیادت کا تاج دیا گیا ہے لیکن ہر دو مقام پر حصر نہیں ہے لہٰذا مریمؑ کا انتخاب جناب فاطمہؑ کے انتخاب کے منافی نہیں اور حضرت فاطمہؑ کی سیادت جناب مریمؑ کی سیادت سے متصادم نہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی اس کرامت میں ان کے ساتھ شریک ہوں چنانچہ

شیعہ وسنی ہر دو کی کتب میں اس کی تائید موجود ہے۔

① عن الدر المنثور عن انس: ان رسول اللہ قال حسبك من نساء العالمين مريم بنت عمران وخديجة بنت خويلد و فاطمه بنت محمد وآسية امراة فرعون۔

''درمنثور انس سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے مریم بنت عمران خدیجہ بنت خوید، جناب فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجہ فرعون فضیلت وشرف کے لئے کافی ہیں۔''

② وفيه عن ابن عباس قال رسول الله افضل نساء العالمين خديجه وفاطمه و مريم وآسية امراة فرعون

''ابن عباس سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کہ عالمین کی عورتوں میں سے افضل۔ خدیجہ، فاطمہ، مریم علیھن السلام اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں۔''

③ وفيه عن الحسن۔ قال رسول اللہ ان اللہ اصطفیٰ علی نساء العالمين اربعا آسية بنت مزاحم ومريم بنت عمران وخديجه بنت خويلد وفاطمه بنت محمد صلى الله عليه وآلہٖ وسلم۔

حسن بصری سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ تمام جہانوں کی عورتوں میں سے خدا نے چار کو چن لیا۔ ① آسیہ بنت مزاحم ② مریم بنت عمران ③ خدیجہ بنت

خویلد ۞ فاطمه بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔"

۞ الخصال۔ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال خط رسول اللّٰہ اربع خطوط ثم قال خیر نساء اھل الجنه میرم بنت عمران وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد وآسیة بنت مزاحم امراۃ عمران۔

"خصال میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے چار خط کھینچے اور پھر فرمایا کہ جنت کی عورتوں میں سب سے بہترین۔ مریم دختر عمران۔ خدیجہ دختر خویلد۔ فاطمہ دختر محمد اور آسیہ دختر مزاحم زوجہ فرعون ہیں۔"

۞ فیہ عن ابی الحسن الاول علیہ السلام قال قال رسول اللّٰہ ان اللّٰہ عزّوجل اختار من النساء اربعا مریم وآسیہ وخدیجہ وفاطمہ الخیر۔

"امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا۔ تحقیق اللہ سبحانہ، نے عورتوں میں سے چار کو منتخب فرمایا۔ یعنی مریمؑ، آسیہؑ وخدیجہؑ اور فاطمۃ الخیرؑ۔

بہرکیف اس مضمون کی احادیث کتب فریقین میں حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔

۞ جس طرح ایک سکول کی کلاس میں مختلف مضامین کے لحاظ سے چند طلبہ نمبر اول پر فائز ہو جایا کرتے ہیں اگرچہ مجموعی طور پر ان کے مراتب میں کافی فرق ہوتا ہے مثلاً ایک لڑکا ایک مضمون میں فسٹ ہے دوسرا دوسرے میں، تیسرا تیسرے میں اور چوتھا چوتھے میں، تو کہا جائے گا کہ یہ چاروں پورے سکول میں فسٹ ہیں لیکن مجموعی

نمبروں کا تناسب ہوگا تو ان چاروں میں ایک فرسٹ ہوگا دوسرا سیکنڈ وعلیٰ ہذا القیاس بہر کیف یہ ضروری نہیں کہ جس طرح وہ اپنے ایک ایک مضمون میں امتیازی شان کے حامل ہیں مجموعی طور پر بھی وہ سب یکسانیت رکھتے ہوں بلکہ عادت کا تقاضا یہی ہے کہ ان میں تفاوت ہوگا اور ان کا یہ باہمی تفاوت ان کے پورے سکول یا جماعت میں فسٹ آنے کے منافی نہیں۔

پس اسی طرح درست ہے کہ پورے عالمین میں سے چند خواتین ممتاز ہوں۔ لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے اور مجموعی طور پر ان سب میں سے صرف ایک ہی ممتاز ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت مریم کس صفت میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ اور اس کی مصطفائی و برگزیدگی کا محور و مدار کون سی صفت ہے۔

تو اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے ارو حضرت مریم کے متعلق آیات الٰہیہ کو غور سے دیکھا جائے تو جناب مریم کا کوئی فضیلت کا پہلو ایسا نہیں جس کو قرآن مجیدہ نے بیان نہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت مریم کی خصوصی صفات میں سے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے یہ ہیں۔

① حضرت مریم حیض اور اس قسم کی آلائشات نسوانی سے پاک و منزہ تھیں۔

② عفیفہ اور پاک دامن تھیں اور دونوں صفتوں کو طَھَّرَكِ کا لفظ ظاہر کر رہا ہے اور نیز اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا جملہ بھی حضرت مریم کی عفت پر نص ہے۔

③ کلمات اللہ کی تصدیق کرنے والی تھی۔

④ کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والی تھی چنانچہ ارشاد ہوا: صَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ۔

⑤ قنوت کرنے والی تھی چنانچہ ارشاد ہے: وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ

(۹) فرشتے ان سے کلام کرتے تھے پس محدثہ تھی۔

اور ظاہر ہے کہ ان صفات کے لحاظ سے حضرت مریمؑ کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں دوسری متعدد خواتین بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ ہاں مریمؑ کی وصف وثنا جو قرآن میں خصوصیت کے ساتھ اور متعدد مرتبہ نہایت اہمیت سے بیان ہوئی ہے وہ ہے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے تولد کا قصہ۔ چنانچہ ابھی بعد کی آیتوں میں بیان ہوگا۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (سورۂ انبیاء)

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ (سورۂ تحریم)

پس قرآن مجید میں حضرت مریمؑ کی جملہ مذکورہ صفات میں سے صرف حضرت مسیحؑ کی والدہ ہونا اور کسی مرد کے مس کئے بغیر حضرت عیسیٰؑ کی ماں بننا ان کا ایک ایسا خصوصی نشان ہے کہ اس میں عالمین کی عورتوں میں سے اس کا کوئی بھی شریک نہیں پس وہ اس صفت اور شان میں امتیاز کلی کی حامل ہیں اور تمام جہانوں کی عورتوں میں سے وہ اس لحاظ سے برگزیدہ اور منتخب ہیں نہ کہ تمام باقی صفات کے اعتبار سے جیسا کہ ظاہر ہے پس جن روایات میں حضرت مریمؑ کو عالمین کی عورتوں میں سے ایک امتیازی حیثیت کی حامل کہا گیا ہے ان میں ان کی صرف اسی خصوصیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی طرح حضرت مریمؑ کے علاوہ جناب خدیجہؑ اور جناب آسیہؑ بھی عالمین کی عورتوں میں

سے دامن انتخاب خداوندی کے اندر داخل ہیں اور یہ انتخاب ان کی نمایاں اور مخصوص بعض صفات کے تحت ہے جو ان کی عالمین میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ پس باقی تمام عورتوں پر تو ان کی فضیلت ثابت ہوگئی لیکن کیا یہ چاروں پاک بیبیاں مساوی اور یکساں رتبہ پر فائز ہیں؟ حضرت مریم علیہ السلام کے متعلق قرآنی تصریح صرف اس کے اپنی مخصوص صفت کے لحاظ سے منتخب اور ممتاز ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور الفاظ آیت اور ترکیب جملہ قطعاً مریم میں اصطفاء کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتے اور فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں چار بیبیوں کے انتخاب کا اعلان بھی مریم میں انتخاب کے حصر کے منافی ہے جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن حضرت مریم کے مجموعی صفات کے نتیجے کے اعلان سے ساکت ہے تو فرمان نبوی جناب فاطمہؑ کی عمومی سیادت کے اعلان کے متعلق یقیناً تعارض سے خالی ہے بلکہ بعض روایات میں تو حضرت مریم کی سیادت کی حضرت فاطمہؑ کے مقابلہ میں صاف طور پر نفی موجود ہے جیسا کہ درمنثور سے منقول ہے۔

عن فاطمہ: قال لی رسول اللہ انت سیدۃ نساء اھل الجنۃ لا مریم البتول۔

یعنی جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:

"کہ جنت کی عورتوں کی صرف تو ہی سردار ہے نہ کہ مریم بتول۔"

احادیث آئمہ علیہم السلام میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ حضرت مریم کا اصطفاء صرف عیسیٰؑ کی ولادت کے لئے تھا چنانچہ

(۱) عن تفسیر القمی قال علیہ السلام اصطفاھا مرتین اما الاولی فاصطفاھا ای اختارھا واما الثانیۃ فانھا حملت من

غیر فحل فاصطفاھا بذالك علی نساء العالمین

''تفسیر قمی سے منقول ہے کہ معصوم نے فرمایا خداوند کریم نے حضرت مریمؑ کو دو دفعہ چنا۔ پہلی دفعہ تو (اپنی عبادت کے لئے) اسے مختار بنایا اور دوسری دفعہ وہ چونکہ بغیر شوہر کے حاملہ ہوئیں پس اس کو تمام عالمین کی عورتوں پر اس خصوصیت کے لحاظ سے منتخب فرمایا:

(۲) عن المجمع قال ابو جعفر علیہ السلام معنی الآیۃ اصطفٰك لذریۃ الانبیاء وطھرك من السفاح واصطفٰك لولادۃ عیسیٰ من غیر فحل۔

''امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے۔ کہ خدا نے تجھے ذریت انبیاء ہونے کے لئے برگزیدہ کیا۔ اور بدکاری سے پاک کیا اور بغیر باپ کے عیسیٰؑ کی پیدائش کے لئے تجھے انتخاب کیا۔

پس قرآن مجید میں تدبر کرنے اور احادیث میں نظر دوڑانے کے بعد یہ نتیجہ بخوبی سامنے آجاتا ہے کہ حضرت مریمؑ کا عالمین کی عورتوں پر اصطفاء صرف اسی صفت کی بناء پر ہے اور یہی وہ صفت ہے جس سے عالمین کی عورتیں محروم ہیں۔ لیکن جناب خاتون جنت کی سیادت کسی ایک وصف کے پیش نظر نہیں بلکہ علی الاطلاق ان کو سیدۃ نساء العالمین کا خطاب دیا گیا ہے پس وہ مریمؑ سے بھی افضل ہیں اور باقی عام عورتوں سے بھی ان کو سقت حاصل ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ چاروں عصمت مآب بیبیاں بعض اوصاف مخصوصہ میں عالمی امتیاز رکھتی ہوں۔ لیکن جملہ صفات حسنہ کے لحاظ سے ان میں باہمی طور پر تفاوت مراتب ہو۔ اور بعض بعض سے افضل ہوں چنانچہ مثال سابق سے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

اعتراض: اب رہا یہ سوال کہ حضرت مریم کے اصطفاء کا اعلان خداوند کریم نے بذریعہ قرآن مجید نے فرمایا۔ اور خاتون جنت کی سیادت کا اعلان حدیث کے ذریعے ہوا۔ قرآن کی سند قطعی اور حدیث کی سند ظنی ہے کو قطعی کے مقابلہ میں ظنی کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔

جواب: سند حدیث بے شک ظنی ہوتی ہے لیکن تواتر کے بعد اسے بوی قطعیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور حدیث مذکور کا کتب فریقین میں متواتر ہونا ثابت ہے اور اگر بالفرض تواتر ثابت نہ بھی ہو تب بھی اس سے تمسک پکڑنے میں خوابی تب لازم آتی کہ آیت اور حدیث میں تعارض ہوتا اور ہم گزشتہ بیان میں ثابت کر چکے ہیں کہ مفہوم آیت و حدیث میں قطعاً تعارض نہیں۔ کیونکہ اولاً تو آیت مجیدہ اصطفاء کا مریم میں حصر نہیں بتلاتی اور ثانیاً جس خصوصیت کا مریم میں حصر ہے اس سے کسی حدیث کا تعارض نہیں بلکہ وہ وصف صرف مریم کی ہی ہے اور قرآن مجید کا ایک امر کے بیان سے سکوت اس کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بلکہ بہت سے شرعی امور ایسے ہیں جن سے قرآن خاموش ہے لیکن بذریعہ حدیث ان پر ایمان فرض ہے پس من جملہ ایسے امور کے ایک یہ بھی سمجھ لینا چاہیے۔

(۲) حضرت مریم علیہ السلام کی متذکرہ صفات جناب زہراہ سلام اللہ علیہا میں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ تفسیر عمدۃ البیان میں جناب رسالت مآب سے مروی ہے کہ جناب فاطمہؑ عالم کی عورتوں کی سردار، میری پارہ جگر، نور چشم اور میوہ دل ہے جب وہ عبادت خدا کے لئے محراب میں کھڑی ہوتی ہے تو اس کے نور سے ملائکہ اس طرح فیض حاصل کرتے ہیں جس طرح اہل زمین آسمانی ستاروں کی روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور خدا فرشتوں سے خطاب فرماتا ہے کہ میری کنیز خاص فاطمہ کو دیکھو کہ میرے

خوف سے محراب عبادت میں مشغول گریہ ہے اور اس کا بدن کانپتا ہے وہ تمام عورتوں کی سردار ہے اور میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں اس کو اور اس کے شیعوں کو آتش جہنم سے بے خوف کروں گا۔ ادھر اگر مریمؑ کے لئے اِصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ کا خطاب ہے تو جناب فاطمہؑ کے لئے يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ کا ارشاد ہے اگر وہ بتول تھیں تو یہ بھی بتول تھیں اگر ان سے ملائکہ کلام کرتے تھے تو ان کے ساتھ بھی ملائکہ کا کلام کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب فاطمہؑ کا لقب محدثہ اس واسطے ہے کہ ملائکہ ان سے باتیں کرتے تھے۔ اور جناب مریم کی طرح ان سے بھی خطاب کر کے کہتے تھے:

يَا فَاطِمَةُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ يَا فَاطِمَةُ اُقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ

"اے فاطمہؑ! تحقیق اللہ نے تجھے چن لیا اور پاک کیا اور عالمین کی عورتوں پر تجھے برگزیدہ فرمایا۔ اے فاطمہ اپنے رب کے لئے قنوت اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔"

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۤءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

"یہ غیب کی خبروں سے ہے۔ کہ ہم وحی کرتے ہیں تیری طرف اور آپ نہ تھے ان کے پاس جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ کون کفالت کرے گا مریم کی۔ اور آپ نہ تھے ان کے پاس جب وہ جھگڑ رہے تھے۔"

ایک شب جناب فاطمہؑ نے فرشتوں سے کہا کیا مریم عالمین کی عورتوں سے افضل تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھی اور آپ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے۔

اَقُــوْلُ: یعنی مریم اس ایک خصوصی صفت کے لحاظ سے تو عالمین کی عورتوں سے ممتاز ہے اور مجموعی صفات حسنہ کے اعتبار سے فقط اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہے اور جناب فاطمہ زہراءؑ علیہا السلام مجموعی صفات کے اعتبار سے عالمین کی عورتوں کی سردار ہے حضرت مریم علیہا السلام صرف ایک حجت خدا حضرت عیسیٰؑ کی ماں ہے اور جناب فاطمہؑ گیارہ اماموں کی اصل ہے جن کے آخری امام حضرت عیسیٰؑ کے بھی مقتدا ہوں گے اور حضرت مریم علیہا السلام کی وہ خصوصی صفت جو عالمین کی عورتوں کے مقابلہ میں اس کا امتیازی نشان ہے یعنی بغیر شوہر کے عیسیٰؑ کی ماں بننا غالباً اس ضرورت کے ماتحت ہے کہ مریمؑ معصومہ ہے اور اس زمانہ میں ان کا کفو مردوں میں سے کوئی موجود نہ تھا کیونکہ زکریا علیہ السلام ان کے بہنوئی تھے اور یحییٰؑ ان کے بھانجے تھے اور ان کے علاوہ مردوں میں سے کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا۔ جو مریم علیہا السلام کا کفو ہو سکتا۔ لیکن جناب فاطمہ علیہا السلام کا کفو حضرت علی علیہ السلام موجود تھا اور حضرت مریم علیہا السلام کی یہ صفت اگر چہ ان کی امتیازی حیثیت کی حامل ہے لیکن عوام کی نظروں میں اسے عیب کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت مریم علیہا السلام کے لئے وہ اتہام و بدگمانی کا موجب بن گئی۔ لیکن جناب فاطمہ علیہا السلام کی ساحت عصمت اور دامن عفت اس بدنما عیب سے پوری طرح محفوظ و مصون تھا پس ان کی ناکتخدائی نے واقعیت کے لحاظ سے گرچہ ان کو ممتاز کیا لیکن ظاہری طور پر ان کی بدنامی اور شرمساری کی موجب ہوئی چنانچہ اپنی پاکدامنی و عفت کے اثبات میں اسے اپنے

نوزائیدہ فرزند حضرت عیسیٰ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس طرف جناب فاطمہ علیہا السلام کی حضرت علی علیہ السلام سے شادی جس طرح واقعیت کے لحاظ سے ان کے علوشان کی موجب تھی اسی طرح ظاہری نگاہوں میں بھی ان کی برتری وسیادت کے لئے غیر متزلزل علامت ہے پس جناب فاطمہ علیہا السلام کو اس اعتبار سے بھی حضرت مریم علیہا السلام سے وہ فوقیت حاصل ہے جس سے کسی منصف مزاج کو انکار کی مجال نہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۳، ص ۲۲۸ تا ۲۳۲)

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ○ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ○

''تحقیق عیسیٰ کی شان اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اس کو بھی پیدا کیا مٹی سے پھر فرمایا کہ ہو جا پس وہ ہو گیا حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ بنیں پس اگر جھگڑیں وہ اس بارے میں بعد اس کے کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو فرما دیجئے آؤ بلا لیں ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو۔ ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو پھر دعا مانگیں اور مقرر کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر۔''

. کُنْ فَیَکُوْنَ: ہر بیان کے لحاظ سے درست تو اس طرح ہوتا کہ کہا جاتا کُنْ

فَکَانَ ۔ لیکن ظاہراً اس کو حکایت حال ماضی قرار دے کر یَکُوْنَ استعمال کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ جب بھی کسی شی ء کی ایجاد کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے ارشاد کُنْ سے شی ء فَیَکُوْن کی منزل تک پہنچ جاتی ہے پس حضرت آدم کو پیدا کرنے کے لئے بھی اس نے ارشاد کُنْ کیا اور وہ فَیَکُوْنَ کی منزل تک پہنچ گیا۔

حضرت آدمؑ کی مثال دے کر حضرت عیسیٰؑ کی بغیر باپ کی پیدائش کے متعلق نصرانیوں کے شبہ کا حل کرنا مطلوب ہے کہ خالق حکیم کسی شی ء کی تخلیق میں اسباب وعلل اور مواد کا محتاج نہیں اور نہ مرور زمانہ اور تخلل وقت کا حاجت مند ہے جس طرح وہ آدم کو تدریجی طریق سے مستثنیٰ قرار دے کر فوریت تکوینیہ سے خلق فرما سکتا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس طرح پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا ہے پس عیسیٰؑ اس کا بندہ ہے خدا نہیں۔

تفسیر آیت مباہلہ

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کی نفی کے لئے گزشتہ آیت بیان خداوندی ہونے کے علاوہ ایک ناقابل تردید برہان ساطع اور دلیل قاطع بھی تھی اس لئے اس کو دوسری آیت میں علم سے تعبیر فرما رہا ہے یعنی اگر وہ آیت نہ بھی ہوتی تب بھی اس کی برہانیت یقین واطمینان کے لئے بذات خود کافی تھی۔ پس مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فرمایا اور مِنْ بَعْدِ مَابَيَّنَّا نہیں فرمایا۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ○

”تحقیق یہ (جو سابق میں عیسیٰ کے متعلق ذکر ہوا) بیان حق ہے اور کوئی

بھی معبود نہیں سوائے خدا کے اور تحقیق اللہ ہی غالب حکمت والا ہے پس
اگر وہ روگردانی کریں تو خدا فسادیوں کو جاننے والا ہے۔"

فَقُلْ تَعَالَوْ: گویا حق کے اثبات کے لئے دو طریقے تھے۔ ایک دلیل و برہان کا اور دوسرا استجابت دعا کا چونکہ پہلا طریقہ استعمال کرنے کے بعد جب معلوم ہوا کہ وہ اپنے ضد پر اڑے ہوئے ہیں لہذا دوسرے طریقہ کی ان کو دعوت دی گئی اور وہ یہ کہ آپس میں مباہلہ کرلیں یعنی ایک دوسرے کے لئے ہلاکت کی اللہ سے دعا مانگی پس جو جھوٹا ہوگا۔ ہلاک و برباد ہوگا۔ مباہلہ کا معنی ہے ایک دوسرے پر لعنت کرنا۔

تعالوا ندع۔ اصل مباہلہ میں طرفین سے ایک ایک آدمی کافی تھا لیکن اپنے دعویٰ پر انتہائی اطمینان و وثوق ثابت کرنے کے لئے ابناء۔ نساء او انفس کو دعائے ہلاکت میں شریک کیا گیا۔ کیونکہ انسان بعض اوقات اپنی ضد پر اڑ کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کی پرواہ نہیں کیا کرتا۔ لیکن بال بچوں اور اعزاء و اقرباء کو کسی صورت میں معرض ہلاکت میں ڈالنا پسند نہیں کرتا جیسا کہ فطری محبت کا تقاضا ہے اس آیت میں غور کرنے سے چند چیزیں بخوبی سمجھ میں آتی ہیں۔

☆ آیت کا لب و لہجہ بتلاتا ہے کہ ابناء۔ نساء اور انفس سے مراد وہ نفوس ہیں جو اصل دعوئی میں مدعی کے ساتھ شریک ہوں۔ صرف طرفین سے کثرت کی خاطر مزید بھرتی کرکے رطب و یابس کو جمع کرکے لانا مقصود نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ نصاریٰ کی طرف سے جو زن و مرد اس میں شرکت کرتے وہ صرف وہی ہو سکتے تھے جو بدن و جان حضرت حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے مدعی تھے تا کہ اس بارہ میں اپنی جانوں پر کھیل جانا آسان سمجھتے، بلمل یقین اور مذبذب مزاج لوگوں کا مباہلہ میں قدم رکھنا قطعاً معقول نہیں تھا اور اس طرف سے جو زن و مرد نصاریٰ کے مقابلہ میں جائے وہ وہی ہونا چاہیے

جس کو حضرت عیسیٰؑ کی عبد اور مخلوق خدا ہونے کا یقین کامل ہو اور رسالت مآبؐ کے ساتھ دعویٰ مذکورہ میں شریک ہو اور دعوت اسلام میں بھی ان کے ساتھ حصہ دار ہو ورنہ بزور شمشیر کلمہ اسلام کو منہ پر جاری کرنے والوں کے ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ:

⊛ اطمینانِ قلب اور سکون خاطر کے بغیر مخلصانہ طور پر جھوٹے کے لئے ہلاکت کی دعا مانگنا نہایت مشکل ہے۔ ورنہ یہ خیال پیدا ہوگا کہ شاید میں خود جھوٹا ہوں تو پس کیسے دعا میں خلوص رہے گا۔ خلوص تب ہی ہو سکتا ہے جب اپنی طرف سے سو فیصد یقین ہو نیز آیت کی ابتداء میں ہے کہ اگر وہ لوگ اس علمی گفتگو اور عقلی دلیل کو تسلیم نہ کریں تو مباہلہ کا طریق اختیار کرلو۔ یعنی مباہلہ میں ساتھ جانے والے افراد کا دلیل و برہان کی ناکامی کے بعد ساتھ لے جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح دلیل دعویٰ کو منوانے کے لئے تھی۔ یہ بھی اسی دعویٰ کو منوانے کے لئے میدان میں اترے ہیں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ صرف وہی ہستیاں ہی ساتھ جا سکتی تھیں جو دعوت اسلام میں اور دعویٰ عبدیت عیسیٰؑ میں جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ برابر کے شریک تھے چنانچہ آیت کے اختتام میں کَاذِبِیْنَ جمع کا صیغہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ رسولؐ کے ہمراہ جانے والے صَادِقِیْنَ تھے اگر دعوت نصاریٰ کے علمبردار اور مدعی صرف آپ ہی ہوتے اور ساتھ جانے والے افراد کی حیثیت گواہ کی سی ہوتی تو کَاذِبِیْنَ جمع نہ لایا گیا ہوتا کیونکہ نصاریٰ کی نگاہوں میں اگر معاذ اللہ کاذبین تھے تو سب کے سب جانے والے تھے اور خدا کے علم میں اگر صَادِقِیْنَ تھے تو بھی سب جانے والے تھے تو معلوم ہوا کہ نصاریٰ کی نظروں میں بھی یہ سب کے سب دعوت دہندہ اور مدعی عبدیت عیسیٰؑ تھے اور عند اللہ بھی یہ سارے جناب رسالت مآبؐ کے شریک کار تھے۔

✪ اَبْنَاءَ ۔ نِسَآءَ اور اَنْفُسَ یہ تینوں صیغے جمع ہیں اور مضاف بھی اور ظاہر ہے کہ جمع مضاف سے استغراق مستفاد ہوا کرتا گویا معنی یہ ہوا کہ اپنے تمام بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو لاؤ۔ لیکن چونکہ لانا صرف انہی کو تھا جو دعوت مذکورہ اور دعویٰ عبدیت عیسیٰؑ میں شریک رسولؐ تھے تو مقصد یہ ہوا کہ تمام وہ بیٹے وہ عورتیں اور وہ نفس جو اس مدعا میں بحیثیت مدعی کے ہیں بلائے جائیں پس نظر انتخاب رسالتؐ میں اس معیار کے لحاظ سے بیٹوں میں سے سوائے حسنینؑ کے کوئی بچہ اس قابل نہ تھا اور عورتوں میں سے سوائے مخدومہ کائنات خاتون جنت کے اور کوئی نہ تھی اور مردوں میں سے سوائے علیؑ کے اور کوئی نہ تھا۔

سوال: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر جلیل القدر اور اکابر صحابہ جو اس وقت موجود تھے اسی طرح زوجات محترمات بھی سب کے سب مذکورہ دعویٰ اور دعوت میں شریک رسولؐ تھے اور ان کو پورا پورا اطمینان حاصل تھا اور میدان مباہلہ میں جانے کے اہل تھے لیکن چونکہ وہاں صرف بطور نمونہ کے مختصر افراد کو لے جانا تھا۔ اس لئے جناب رسالت مآبؐ نے صرف حسنین علیہم السلام اور فاطمہ علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام کے لے جانے پر اکتفا کر لی۔

جواب: ابناء، انساء وانفس کی اضافت جو مفید استغراق ہے نمونہ کے طور پر چند افراد کو ہمراہ لے جانے کے خلاف ہے اور اگر بالفعل استغراق نہ مانا جائے تب بھی جمع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں اور نمونہ کے لئے بھی لے جانا تھا تو کم از کم اتنے افراد کا انتخاب ہر صف سے ضروری تھا کہ اقل جمع تو صادق آسکتی پس اس صورت میں ابناء کے لئے تین اور نساء کے لئے بھی تین البتہ انفس کے لئے صرف ایک اور بڑھانا پڑتا کیونکہ آپ خود بنفس نفیس مل کر تین ہو جاتے پس اس طرح نہ ہونا صاف جتلاتا ہے کہ

اس میدان میں سوائے ان ہستیوں کے جانے کا کوئی دوسرا اہل نہیں تھا؟

✪ نصاریٰ نجران کی تفہیم کے لئے جب قرآن کی پیش کردہ دلیل و برہان کارگر نہ ہوئی تو میدانِ مباہلہ کی تشکیل دیتے ہوئے عترت طاہرہ کو پیغمبر کا ساتھ لے جا کر حق و باطل کے درمیان امتیازی نشان قائم کرنا تا قیامت امت اسلامیہ کے لئے دعوت فکر ہے کہ جس طرح نصرانیوں کے مقابلہ میں یہ لوگ رسولؐ کے شریک کار ہیں اور صرف قرآنی ادلہ پر اکتفا نہیں کی جا سکتی اسی طرح تا قیامت اہل اسلام کے لئے بھی ان کی قیادت ضروری ہے اور صرف کتاب اللہ سے تمسک پکڑ کر ان کو نظر انداز کرنا یقیناً نادرست ہے۔

✪ چونکہ قرآن مجید میں جہاں نساء کو ابناء کے مقابلہ میں استعمال گیا گیا ہے وہاں اس سے مراد بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا بعید نہیں کہ نساء سے مراد یہاں بیٹاں ہوں۔ پس اس کی مصداق صرف خاتون جنت ہی ہوگی اور اگر نساء کے معنی میں تعلیم کی جائی۔ تو عورت کی تین اہم حیثیات میں سے خاتون جنت ہر طرح مصداق آیت ہے کیونکہ دعوت مباہلہ میں چار جانے والے مردوں میں سے دو کی ماں ہے اور ایک کی زوجہ ہے اور ایک کی دختر ہے کیونکہ نساء کا لفظ امراۃ کی جمع ہے۔ خلاف قیاس۔ اور اس کا معنی ہے عورت اور عورت کے لئے رشتہ کے اہم پہلو صرف یہی تین ہیں کہ زندگی میں قدم رکھتے ہی پہلے پہل بیٹی ہوتی ہے پھر زوجہ بنتی ہے اور پھر ماں بن جاتی ہے۔

✪ ابناء جمع ہے ابن کی۔ آیت مجیدہ میں ابناء کو ہی مباہلہ میں شریک قرار دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا۔ کہ اصطلاح قرآن میں لڑکی کی اولاد کو بھی ابن کہنا مبنی بر حقیقت ہے پس حسنین شریفین جناب رسالت مآبؐ کے بفرمان قرآن فرزند ثابت ہوئے۔

✪ اَنفُسُ جمع ہے نفس کی، قرآنی الفاظ جتلاتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ

کو اس میدان اور اس دعوت میں ان مردوں کو شریک کرنے کا حکم تھا۔ جن کی رسولؐ کے ساتھ یگانگت اور یک جہتی اسی طرح ہو جس طرح جسم طرح سے نفس کی نسبت ہوا کرتی ہے اور وہ شخص ہی ساتھ جانے کا اہل ہو سکتا تھا جو رسولؐ کے لئے بمنزلہ نفس کے ہو۔ پس اس آیت کی رو سے علی علیہ السلام کا نفس رسولؐ ہونا ثابت ہوا اور جمع کے صیغہ سے خطاب کے باوجود صرف حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب اس امر کی دلیل ہے کہ صحابہ رسولؐ میں سے جانثاری اور وفاشعاری کے لحاظ سے دوسرا کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا۔ جس کو جناب رسالت مآبؐ اپنے نفس کی حیثیت رو سے مباہلہ میں لے جاتے ہیں یہی آیت حضرت علیؑ کی جملہ صحابہ بلکہ باقی تمام انبیاء سے بھی افضل ہونے کی نص صریح ہے کیونکہ نفس اور شے کا حکم ایک ہوا کرتا ہے تو جن لوگوں پر رسولؐ کی فضیلت ثابت ہوگی۔ انہی پر رسولؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلامؑ کی فضیلت بھی ثابت ہوگی اور اسی سے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بالافصل بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے اور جناب رسالت مآب کا فرمانا: يَا عَلِي اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ جِسْمُكَ جِسْمِيْ۔ دَمُكَ دَمِيْ رُوْحُكَ رُوْحِيْ لفظ قرآن اَنْفُسَنَا کی تفسیر ہے۔

✪ آیت مجید میں پہلے ابناء نا کا ذکر تھا۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ نے بھی عمل کی صورت میں ان کو پہلے رکھا پس حضرت حسن کا انگلی سے اور حسین علیہ السلام کو گود میں اٹھالیا اور اس کے بعد آیت میں نساء نا کا ذکر تھا تو حضورؐ نے مقام عمل میں اپنے پیچھے خاتون جنت کو رکھا اور آیت میں آخر پر اَنْفُسَنَا کی لفظ تھی لہذا مقام عمل میں سب سے پیچھے حضرت علی علیہ السلام تھے اگرچہ اس ترتیب کے عمل میں لانے کا امر نہیں تھا۔ تاہم جناب رسالت مآبؐ نے ظاہری مفہوم سے واقعی مصداق کی ترتیب کو اپنے عمل سے اس طرح منطبق کر کے دکھایا کہ کبھی کبھی مرد آیت کے مصادیق کی تعیین وتطبیق میں

ٹھوکر نہ کھانے پائے۔

✪ جنابِ خاتونِ جنت کو درمیان میں رکھنے سے مقامِ عمل میں مخدومۂ کائنات کے پردہ کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے تا کہ۔ سامنے نصاریٰ نظر اٹھا کر ادھر دیکھیں تو ان کے آگے رسالت کی نوری دیوار حائل ہو جائے اور پیچھے سے مسلمان جاتے ہوئے دیکھیں تو ان کی سامنے امامت کا پردہ آ جائے اور عصمت مآب بی بی پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ حتیٰ کہ قدموں کے نشان بھی رسالت و امامت کے نقوشِ پا کے درمیان مستور ہو کر رہ جائیں۔

✪ میدانِ مباہلہ میں اس طرف سے پانچوں بزرگواروں کا جانا اور مقابلہ میں نصاریٰ کا جزیہ منظور کرتے ہوئے مباہلہ سے ہٹ جانا امر کا کاشف ہے کہ پانچ ہستیوں کی صداقت کو وہ ان کی پر اطمینان روش اور ہمہ ترین سکون پیش قدمی سے بھانپ گئے تھے اور مباہلہ کے بعد انہیں یقین تھا کہ اگر ایسا ہوا تو موردِ عذاب ہو جائیں گے۔ پس انہوں نے جزیہ منظور کرنے کے عمل سے ان پانچوں کی صداقت کا اعتراف کر لیا اور قرآن کی آیت نے اس پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی۔

✪ اس پورے واقعہ اور قرآنی فرمان میں تدبر کرنے سے انسان بخوبی وبآسانی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں آنے والے جھوٹے اور مستحق لعنت تھے اور قصہ کا تعلق اگرچہ صرف ایک واقعہ سے تھا۔ لیکن قرآن کا پورے اہتمام کے ساتھ ان کی صداقت اور ان کے مدمقابل کے جھوٹ کا اعلان کرنا اس امر کا کاشف ہے کہ ان کی صداقت صرف اسی جزوی واقعہ میں منحصر نہیں تھی اور ان کا دعوتِ اسلام اور دعوائے عبدیتِ عیسیٰ علیہ السلام میں جنابِ رسالت مآبؐ کے ساتھ شریک کار ہونا بھی اسی کا شاہد ہے ورنہ اگر ان میں صداقت کا وجود صرف اسی دن کے لئے ہوتا تو یقیناً ان

کا انتخاب اس قسم کے اہم مقابلہ کے لئے ناموزوں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ واقعہ صرف ان کی صداقت کے اعلان کا بہانہ تھا۔ ورنہ تمام صحابہ رسالت مآبؐ میں سے کوئی آدمی ایسا موجود نہ تھا جو اس فضیلت میں ان کے ہم پلہ ہو سکتا اور اگر ایسا ہوتا تو آپ اس انتخاب میں یقیناً اس کو نظر انداز نہ فرماتے اس لئے کہ آیت کے الفاظ ابناء، نساء اور انفس کے جمع اور استغراق کے وسیع الذیل الفاظ زیادہ سے زیادہ قابل انتخاب افراد کو اپنے دامن میں جگہ دینے کو تیار تھے اور جناب رسالت مآبؐ کی نظر انتخاب میں بھی بخل نہ تھا بلکہ وہ خلق عظیم کا مالک رسول کشادہ روئی سے ساتھ ملانے کو تیار ہو جاتا۔ بشرطیکہ کوئی ادھر آنے کی صلاحیت رکھتا۔ پس ثابت ہوا کہ اس معیار پر پورے اترنے والے صرف یہی تھے جن کو لے جایا گیا تو اس واقعہ میں ان کا انتخاب اور چناؤ اور ان کے مقابل والوں کو جھوٹے کی سند کا ملنا تا قیامت ایک دستور العمل ہے کہ جب بھی یہ لوگ کسی میدان میں پہنچیں اور حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو جاوے تو معیار یہی ہے کہ جس طرف یہ لوگ ہوں گے صداقت اور حق اسی جانب ہوگا اور ان کی مقابل جماعت کا ذب و باطل پرست ہوگی۔

✪ چونکہ حسنین شریفین علیہم السلام باوجود کم سنی کے مباہلہ کے پروگرام میں شامل اور خداوند کریم کی جانب سے مدعو تھے۔ لہٰذا یہ آیت ان کے کمال عقل پر نص قطعی ہے کیونکہ ایسے پروگراموں میں ناقص العقل کی شرکت یقیناً ناموزوں ہے اور جناب بتول علیہا السلام معظمہ کی شمولیت اور ان کا مدعو ہونا بھی ان کے کمال عقل کی برہان قطعی ہے یعنی جس طرح بچپنہ حسنین علیہما السلام کے کمال عقل سے مانع نہیں اسی طرح نسوانیت جناب زہرا علیہا السلام کے کمال میں مخل نہیں اور یہی اس خانوادہ عصمت کا امت کے عام مردوں اور عورتوں سے امتیازی نشان ہے۔

واقعہ مباہلہ کے متعلق روایات

بنابر مشہور ۲۴ ذوالحجہ ۱۰ھ کو بعداز فتح مکہ یہ واقعہ پیش آیا کیونکہ آپ نے اطراف میں دعوت السلام کے خطوط بھیجے چنانچہ ایک خط نصاریٰ نجران کو بھی لکھا پس تحقیق کے لئے ان کا وفد مدینہ میں آیا اور انہوں نے پہلے مناظرہ کیا اور بعد میں مباہلہ کا فیصلہ ہوا۔

✿ بروایت تفسیر قمی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نصاریٰ نجران کا وفد جب جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچا تو ان کے سردار تین شخص تھے۔ اہتم، عاقب اور سید۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے ناقوس بجائے اور پھر نماز ادا کی۔ صحابہ کرام کو مسجد رسولؐ میں ان کا یہ فعل ناگوار گزرا اور بارگاہ رسالت میں دبی زبانی سے عرض بھی کی لیکن آپؐ نے فرمایا کہ رہنے دیجئے۔ جب وہ فارغ ہو چکے تو آپ کے قریب آ کر کہنے لگے۔ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا۔ اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کی طرف اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد خدا اور مخلوق خدا تھے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ اگر یہ صحیح ہے تو فرمایئے ان کا باپ کون تھا؟ پس وحی نازل ہوئی کہاں سے سوال کیجئے۔ تمہارا آدمؑ کے متعلق کیا خیال ہے کیا وہ عبد خدا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور نکاح وغیرہ کا محتاج تھا؟ تو آپ نے ان سے یہی سوالات کئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ بتایئے۔ اس کا باپ کون تھا۔ پس وہ شرمسار ہو کر لاجواب ہو گئے۔ چنانچہ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ سے لے کر آیت مباہلہ کے آخر تک یہ آیتیں اتریں۔ پس آپ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ مباہلہ کرلو۔ اگر میں سچا ہوں گا تو تم پر خدا کی لعنت اور عذاب نازل ہوگا

اور اگر تم سچے ہو گے تو مجھ پر خدا کی لعنت نازل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ واقعی یہ منصفانہ فیصلہ ہے اور مباہلہ کا وعدہ کر کے چلے گئے تو ان کے رؤسا سید۔ عاقب اور اہتم نے کہا کہ اگر وہ مباہلہ کرنے کے لئے اپنی قوم کو لائے۔ تو ہم مباہلہ کریں گے کیونکہ وہ نبی نہ ہوگا اور اگر وہ اپنی خاص اہل بیت کو ہمراہ لا کر مباہلہ کرے گا تو ہم مباہلہ نہ کریں گے کیونکہ اس کا اپنی اہل بیت کو ساتھ لانا اس کی صداقت کی دلیل ہے جب صبح ہوئی تو آپ نے حضرت امیر المؤمنینؑ، جناب فاطمہؑ اور حسن اور حسین علیہم السلام کو ساتھ لیا۔ نصاریٰ نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو ان کو جواب دیا گیا کہ ایک اس کا چچا زاد وصی اور داماد علی بن ابی طالبؑ ہے اور ایک اس شہزادی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہے اور دو بیٹے حسن اور حسین علیہما السلام ہیں پس یہ سن کر بارگاہ رسالتؐ میں عرض گزار ہوئے۔ یا رسول اللہ! ہم آپؐ کی مرضی کے تابع ہیں ہمیں مباہلہ سے معافی دیجئے پس آپ نے جزیہ پر ان سے صلح کر لی اور وہ چلے گئے۔

✪ عیون الاخبار سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہارون نے دریافت کیا تھا کہ تم کیسے ذریت پیغمبر کہلاتے ہو حالانکہ ہمارے پیغمبر کی نسل نہیں ہے کیونکہ نسل بیٹوں سے ہوا کرتی ہے نہ کہ بیٹیوں سے اور تم بیٹی کی اولاد ہو؟ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے قرابت اور قبر رسولؐ اور صاحب قبر کا واسطہ دے کر اس سوال کے جواب سے معافی چاہتا ہوں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ مجھے جہاں تک خبر پہنچی ہے آپ اولاد علیؑ میں سردار اور ان کے امام وقت ہیں لہذا میرے ساتھ اس مسئلہ میں دلیل و برہان سے بات فرمائے اور میں جو کچھ آپ سے دریافت کر رہا ہوں۔ اس کی ہرگز معافی نہ دوں گا۔ جب تک آپ قرآن مجید سے اپنے دعویٰ کا ثبوت نہ دیں اور اے اولاد علیؑ:۔ تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا

کوئی حرف نہیں جس کی تاویل تمہارے پاس نہ ہو اور تم اس کے احتجاج میں پیش کرتے ہو۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتَابِ مِنْ شَیْءٍ اور دیگر تمام علماء کے قیاسیات اور خیالات سے تم استغنا ظاہر کرتے ہو؟

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: اچھا مجھے اجازت دیجئے۔ تا کہ کچھ کہوں، ہارون نے کہا۔ اجازت ہے بیان کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پڑھا: خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمَانَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَاِلْيَاسَ

"اور اس کی ذریت سے داؤد، سلیمانؑ اور ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ ہیں اور ہم احسان کرنے والوں کی ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ اور ذکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ (بھی ان کی ذریت سے۔"

پس میں نے دریافت کیا کہ بتایئے حضرت عیسٰیؑ کے باپ کون تھے۔ ہارونؒ نے جواب دیا کہ عیسیٰؑ کا باپ نہیں تھا پس میں نے کہا کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو ماں کی وجہ سے ذریتِ انبیاء میں داخل فرمایا اور اسی طرح ہمیں بھی ماں کے ذریعے سے ذریت پیغمبر قرار دیا۔

پھر میں نے کہا کچھ اور بھی کہوں؟ اس نے کہا کہ ہاں! پس میں نے آیت مباہلہ تلاوت کی اور کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جناب رسالتمآبؐ نے نصاریٰ کے مباہلہ کے دن علی ابن ابی طالبؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ کسی اور کو بھی دعوت دی ہو اور

آیت میں اَبۡنَاءَ نَا سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ نِسَاءَ نَا سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور اَنۡفُسَنَا سے مراد جناب علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

⊛ امام علی رضا علیہ السلام سے مامون نے جو سوالات کئے تھے من جملہ اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مامون نے دریافت کیا کہ آپ کے جد پاک حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت پر دلیل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: آیت اَنۡفُسَنَا مامون نے کہا: ٹھیک ہے بشرطیکہ نِسَاءَ نَا کا لفظ نہ ہو، آپ نے فرمایا: ہاں اگر اَبۡنَاءَ نَا نہ ہو۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ما الدلیل علیٰ خلافة جدك علی بن ابی طالب؟ قال آیة انفسنا قال لولا نساء ناقال لولا ابناء نا

اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب مامون نے حضرت علیؑ کی خلافت کی دلیل طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اَنۡفُسَنَا کی آیت یعنی مباہلہ، کیونکہ اس آیت میں علیؑ کو نفس رسولؐ ہونا استحقاق خلافت کے لئے کافی ہے کیونکہ جن پر رسولؐ کو افضلیت حاصل ہے ان پر نفسِ رسولؐ کو بھی افضلیت حاصل ہوگی اور شیٔ اور نفس شیٔ کا حکم ایک ہوا کرتا ہے۔ اس پر مامون نے اعتراض کیا لَوۡلَا نِسَاءَ نَا یعنی اَنۡفُسَنَا سے حضرت علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا ثابت نہیں، کیونکہ یہاں انفس سے مراد مطلق مرد ہیں اور حضرت علیؑ اُن میں سے ایک فرد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں خدا نے نِسَاءَ نَا کو ذکر فرمایا ہے اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انفس سے مراد مرد ہیں۔ ہاں اگر نِسَاءَ نَا کی لفظ نہ ہوتی تو علیؑ کا نفس رسولؐ ہونا اس آیت سے سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ نے اس کی تردید میں فرمایا: لولا اَبۡنَاءَ نَا یعنی اگر نِسَاءَ نَا کے قرینہ سے اَنۡفُسَنَا کا معنی مطلق مرد ہو تو اَبۡنَاءَ نَا کیوں ذکر کیا یہ بھی تو مردوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یا یوں

کہئے کہ نِسَاءَ نَا کے مقابلہ میں اگر اَبنَاءَ نَا کا ذکر نہ ہوتا تو نِسَاءَ نَا سے مراد عورتیں اوران کے مقابلہ میں انفس سے مراد مرد لئے جا سکتے تھے لیکن جب ان کا مقابلہ اَبنَاء سے ہو تو با اصطلاح قرآن نساء سے مراد لڑکیاں ہو جایا کرتی ہیں لہٰذا انفس اپنے معنی حقیقی پر رہتے ہوئے حضرت علیؑ کے فضیلت مذکورہ کے اثبات کا موجب ہو جائے گا۔

ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے چونکہ اَنفُسَنَا سے حضرت علیؑ کو نفسِ رسولؐ ہونا ثابت کر کے ان کا استحقاقِ خلافت بیان فرمایا۔ مامون نے اعتراض کیا کہ حضرت علیؑ کو نفسِ رسولؐ کہنے میں ایک خرابی لازم آتی ہے اور وہ یہ کہ خاتونِ جنت حضرت علیؑ کی زوجہ ہے اور رسولؐ کی دختر ہے پس علیؑ نفسِ رسولؐ کیسے ہو سکتے تھے جبکہ وہ رسولؐ کے بیٹے قرار دیا تو علی نفسِ رسولؐ کیسے ہو سکتے تھے جبکہ وہ رسولؐ کی شہزادی کے شوہر ہیں تو آپ نے اس کے اس شبہ کا جواب اس طرح دیا کہ حسنین شریفین کو جب خدا نے رسولؐ کے بیٹے قرار دیا تو علی نفسِ رسولؐ ثابت ہوئے کیوں کہ علیؑ کے بیٹوں کو خدا رسولؐ کے بیٹے فرما رہا ہے۔ گویا معنوی طور پر حضرت علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا ظاہری رشتہ سے مانع نہیں ہو سکتا۔

✪ اہلسنت کی تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے جب قوم نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو نصاریٰ نے کہا ہم سوچ کر جواب دیں گے جب علیحدہ مجلسِ مشاورت قائم ہوئی تو انہوں نے مل جل کر عاقب سے کہا کہ جو اُن کا صاحب رائے تھا۔ عبدالمسیح (یہ اس کا لقب ہے) تیرا کیا مشورہ ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اے نصرانیو! خدا کی قسم تمہیں معلوم تو ہے ہی کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نبی مرسل ہے اور اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا ہے اور خدا کی قسم کبھی کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کی جراءت نہیں کی مگر یہ کہ اس کا پوری طرح ستیاناس ہو گیا۔ ان کے چھوٹے بڑے سب فنا ہو گئے

اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ ہاں اگر تم اپنے مذہب کے خیر خواہ ہو اور اسی دین پر رہنے کے متمنی ہو تو چپ چاپ واپس جانے میں اپنی خیر سمجھو؟

پس جب صبح ہوئی تو جناب رسالتمآبؐ نے حسینؑ کو گود میں لیا اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑا اور جناب فاطمہؑ ان کے پیچھے روانہ ہوئیں اور حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ کے پیچھے تھے اور آپ ان کو فرما رہے تھے کہ دیکھنا جب میں دعا مانگوں تو تم سب آمین کہنا۔ نجران کے اسقف (پادری) نے نصاریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں اگر وہ اللہ سے سوال کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا۔ پس ان لوگوں سے مباہلہ نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور قیامت تک زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا۔ پس انہوں نے یہ بات مانتے ہوئے بارگاہ رسالتؐ میں عرض کی کہ ہماری رائے یہ ہے کہ ہم مباہلہ چھوڑ دیں۔ آپ اپنے دین پر رہیں اور ہم اپنے دین پر رہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم مباہلہ سے انکار کرتے ہو تو پھر تمہیں اسلام قبول کرنا چاہیے۔ پس مسلمانوں کے ساتھ تم نفع اور نقصان میں شریک ہو جاؤ گے تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر جہاد کی دعوت دیتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے ساتھ لڑنے کی جرأت نہیں کرتے۔ البتہ ہم آپ سے مصالحت کے خواہشمند ہیں جس کی شرائط یہ ہوں گی۔

① آپ ہمیں نہ چھیڑیں گے۔

② ہمیں خوفزدہ بھی نہ کیا جائے گا بلکہ پُرامن زندگی گزارنے کی سہولت ہمیں دی جائے گی۔

③ ہمیں اپنے دین کے چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

④ ہم ہر سال ۲ ہزار لباس ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار رجب میں اور تیس

(۳۰) زرہ لوہے کی ادا کرتے رہیں گے۔ پس آپ نے منظور فرمایا اور فرمایا کہ مجھے قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تحقیق موت اہل نجران پر اپنے کھول چکی تھی اور اگر وہ مباہلہ کر کے تو بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو جاتے اور پوری وادی اُن کے لئے آگ سے بھڑک اٹھتی اور خدا نجران اور اہل نجران کو تباہ کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر پرندے بھی زندہ نہ رہ سکتے اور ایک سال کے اندر اندر تمام روئے زمین کے نصرانی لقمہ اجل ہو جاتے۔

نوٹ: اس روایت میں جزیہ کی شرائط میں ہے کہ دو ہزار لباس سالانہ ادا کریں گے ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں، لیکن یہاں صفر سے مراد ماہ محرم ہے، کیونکہ عرب لوگ ماہ محرم کو صفر اوّل اور صفر کو صفر ثانی کہا کرتے تھے۔ جب اسلام نے صفر اوّل کے مہینے کو بھی حرمت والے مہینوں میں شمار کر دیا تو اس کا نام شہر اللہ المحرم پڑ گیا اور آہستہ آہستہ شہر اللہ کا لفظ بھی کٹ گیا اور صرف محرم مشہور ہو گیا۔

۵ تفسیر درِ منثور سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے اہل نجران کو دعوت نامہ لکھا کہ میں تم لوگوں کو اللہ کی عبادت اور اُسی کی ولایت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں جزیہ ادا کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ جہاد کریں گے۔ جب خط وہاں پہنچا اور وہاں کے اسقف نے خط پڑھا تو بہت گھبرایا اور خوفزدہ ہوا اور اہل نجران کے ایک شخص شرجیل ابن وداعہ کو بلا بھیجا اور اس کو یہ خط پڑھنے کے لئے دیا۔ جب وہ خط پڑھ چکا تو اسقف نے اُس سے اس بارہ میں مشورہ طلب کیا۔ شرجیل نے جواب دیا کہ تجھے معلوم ہے کہ خداوند کریم نے ابراہیمؑ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ذرّیت اسمٰعیلؑ میں نبوت کو قرار دوں گا تو ممکن ہے یہ وہی شخص ہو۔ بہر کیف مجھے نبوت کے معاملہ میں دخل اندازی کی مجال نہیں البتہ کوئی دنیاداری کا مشورہ

ہوتا تو اپنی رائے اس بات پر جم گئی کہ شرجیل بن وداعہ اور عبداللہ بن شرجیل اور جبار بن فیض کو معلومات حاصل کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا جائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

پس یہ وفد مدینہ پہنچا۔ حضرت عیسےٰؑ کے متعلق بات چیت ہوئی۔ جب انہوں نے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں کل جواب دوں گا، چنانچہ اسی رات کو یہی آیات اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی سے لے کر آخر تک نازل ہوئیں بالآخر جب مباہلہ تک نوبت پہنچی اور صبح کو جناب رسالتمآبؐ بمع ساتھیوں کے میدانِ مباہلہ میں پہنچے تو شرجیل نے ساتھیوں سے کہا کہ ان سے مباہلہ ہماری ہلاکت کا موجب ہوگا چونکہ اس کو اپنے ساتھیوں نے اپنی طرف سے کلی اختیار دے دیا تھا پس شرجیل نے جزیہ دینا منظور کر کے آپؐ سے مصالحت کر لی۔

بہرکیف نصاریٰ کے وفد کے ناموں میں اختلاف ہے لیکن تمام مفسرین کو اس بات پر پورا اتفاق ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے ہمراہ سوائے علیؑ و بتولؑ و حسنین علیہم السلام کے اور کوئی نہ تھا اور اس روایت کو شیعہ سنّی مفسرین نے متفقہ طور پر لکھا ہے اور ابن طاؤس فرماتے ہیں کہ میں نے روایت مباہلہ کو اکاون صحابہ وتابعین سے نقل کیا ہے کہ مصداق آیت حضرت علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں اور جو لوگ اس قسم کی متواترات سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے عناد و حسد و بغض و کینہ کے اور کچھ نہیں اور خدا خود ہی ان سے حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

(تفسیر انوار النجف، جلد ۳۔ پارہ نمبر ۳، صفحہ ۲۴۸ تا ۲۵۷)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (سورہ آل عمران۔ آیت ۹۲)

"جو تمھیں پیاری ہیں اور جو بھی خرچ کی کوئی چیز تحقیق اسے خدا جاننے والا ہے۔"

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ: مجمع البیان اور صافی میں مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک کپڑا خریدا اور آپ کو بہت پسند آیا پس اسے صدقہ کر دیا اور فرمایا کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ سے سنا ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر دوسرے کو ترجیح دے تو خدا اسے بروز محشر بہشت کرامت فرمائے گا اور جو اپنی پسندیدہ شئی راہ خدا میں دے دے تو خدا فرمائے گا کہ بندے بندوں کو نیکی کا بدلہ نیکی سے دیا کرتے ہیں اور میں اس کا بدلہ جنت دیتا ہوں۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ الَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

"تحقیق پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے جو موجب موجب برکت و ہدایت ہے تمام جہان والوں کے لئے۔"

(سورہ آل عمران آیت ۹۵)

وجہ تسمیہ

کہتے ہیں کہ بکہ بک بہک کے باب سے ہے اور بکہ معنی ہے اژدہام اور ہجوم کی وجہ سے اس کا نام بکہ ہو گیا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت علل الشرائع منقول ہے اور وہ جگہ کعبہ کے ارد گرد طواف کرنے کا مقام ہے یا یہ کہ بک" کا معنی گردن مروڑنا چونکہ سرکشوں اور متکبروں کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور ان کی سرکشی کی مہلت نہیں دی جاتی۔ اس لئے اس کو بکہ کہا گیا اسی طرح مکہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی اصل بکہ ہے اور با کو میم سے تبدیل کر لیا گیا ہے جس طرح لازب اور لازم کی دو لائنیں ہم معنی ہیں یا یہ کہ مک سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چوسنا پانی کی نایابی اور قلت

کی وجہ سے اس کو مکہ کہا گیا ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ کعبہ کی جگہ کا نام بکہ ہے اور شہر کا نام مکہ ہے۔

هُدًى لِلْعَالَمِيْنَ: کعبہ کی ہدایت دینی و دنیاوی ہر دو طرح کی ہے عبادت و مناسک حج کی ادائیگی فروتنی وانکساری اور خدا ترسی دار آخرت کی تعمیر سے متعلق ہیں اور عالمی اجتماع یکجہتی و یگانگت کا عمومی مظاہرہ اور اتفاق و اتحاد کا عملی درس تمدن و معاشرت کی اصلاح سے وابستہ ہیں۔

مختصر تاریخ کعبہ

تفسیر صافی میں بروایت فقیہ و عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب خداوند کریم نے زمین کو خلق فرمانے کا ارادہ کیا تو ہواؤں کو پانی میں موج پیدا کرنے کا حکم دیا چنانچہ اس کی موجوں سے جھاگ پیدا ہوئی۔ پس وہ بیت اللہ کے مقام پر یکجا ہوئی اور ایک جھاگ کا پہاڑ بن گیا۔ پھر خدا نے اس کے نیچے سے زمین کو بچھا دیا۔ بروایت فقیہ کعبہ کی زمین کا ٹکڑا تمام زمینوں سے پہلے پیدا کیا گیا اور اسی سے باقی زمین کو بڑھایا گیا (مکہ کو ام القریٰ کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے)

مجمع البیان میں ہے کہ کعبہ کی زمین کا ٹکڑا باقی زمین سے دو ہزار سال قبل خلق ہوا اور یہ پانی کے اوپر ایک سفید جھاگ کی مانند تھا۔ بروایت کافی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مقام کعبہ باقی زمین سے بلند تھا اور چاند و سورج کی طرح چمکتا تھا پس جب حضرت آدمؑ کو اتارا گیا اور اطراف کی تمام زمین کو بلند کر کے اس کو دکھایا گیا۔ ارشاد قدرت ہوا کہ یہ سب زمین تیری ملکیت ہے۔ حضرت آدمؑ نے عرض کی: اے پروردگار! یہ سفید و چمکدار زمین کونسی ہے ارشاد ہوا کہ یہ میری زمین میں میرا حرم ہے اور تیرے اوپر تا زیست روزمرہ اس کے سات سو (۷۰۰) طواف واجب ہیں پس

جب ہابیل کو قابیل نے قتل کیا تو اس سے وہ نورانیت ختم ہوگئی اور اس کی سفیدی کی جگہ سیاہی نے لے لی اور نیز آپ سے مروی ہے کہ حضرت آدمؑ کے لئے خدا نے موتی کی شکل میں کعبہ کو جنت سے اتارا تھا۔ اس کے بعد اس کو اٹھایا چنانچہ اس کی بنیاد باقی رہ گئی اور وہ اس کعبہ کی سیدھ میں ہے۔ جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں پس حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو انہی بنیادوں پر کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا۔

جس وقت کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا اس وقت وہاں صرف حضرت اسمٰعیلؑ اور یمن کا ایک قبیلہ جرہم اطراف میں آباد تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کے بعد بنی جرہم اور عمالقہ نے یکے بعد دیگرے اس کی از سرِ نو تعمیر کی۔ جب کعبہ کی تولیت حضرت رسالتمآبؐ کی جدِ اعلیٰ قصی بن کلاب کے سپرد ہوئی تو انہوں نے گرا کر دوبارہ اس کی پختہ تعمیر کی اور عمدہ لکڑی سے ان کو مسقف کیا اور اس کے پہلو میں دارالندوہ تعمیر کر دیا۔ جس میں وہ مقدمات کے فیصلے کرتے تھے اور وہی ان کا اسمبلی ہال بھی تھا اور قریش کے باقی قبیلوں پر جہات کعبہ کو تقسیم کر دیا، چنانچہ قریشیوں نے کعبہ کے اردگرد گھر بنوا لئے اور ان کے دروازے کعبہ کی طرف کئے (میزان) (تفسیر انوار النجف۔ جلد ۲، پارہ ۲، صفحہ ۶۔۷۔۸)

زمینِ کربلا

بعض روایات میں ہے کہ ایک دفعہ زمین کعبہ نے اپنی برتری پر ناز کیا کہ مجھ جیسا کون ہے میں کعبہ کا مسکن ہوں تو فوراً وحی الٰہی ہوئی۔ خاموش! اے کعبہ کی زمین کربلا کے مقابلہ میں تیری فضیلت کو وہ نسبت ہے جو نوکِ سوزن پر اٹھتے ہوئے پانی کے قطرہ کو پراز آب سمندر سے ہوا کرتی ہے۔ بقسم اگر اس زمین اور اس کے ساکن کو خلق نہ کرتا تو تجھے پیدا نہ کرتا اور نہ تیرا کعبہ پیدا ہوتا (مرادی ترجمہ کر دیا گیا ہے)۔ (سفینۃ البحار)

اس روایت اور سابق روایات میں توفیق کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صرف کعبہ کی

طرف جھکنے والے اور اہلبیت اطہار کو پس پشت ڈالنے والے چونکہ صرف کعبہ پر ہی ناز کرتے ہیں اور اپنی بخشش کا انحصار صرف اسی میں سمجھتے ہیں تو ان کی تنبیہ کے لئے ارشاد ہے کہ بے شک کعبہ اور زمین اپنی جگہ شرف و فضل کے حامل ہیں لیکن اگر کربلا والوں کی سرفروشی نہ ہوتی اور ان کے ناحق خون سے اسلام کی حفاظتی حصار کی تعمیر نہ ہوتی تو پورے اسلام کو یزیدی طاغوتی حملوں نے نیست و نابود کر دیا ہوتا اور جب اسلام ہی ختم ہو جاتا تو کعبہ کا وقار کس کام کا؟ کعبہ اپنے مقام پر محترم ہے لیکن کسی محترم کے خالی وجود کو کیا کیا جائے۔ جب احترام کرنے والا ہی دنیا میں موجود نہ ہو؟ اے کعبہ کا احترام کرنے والو! پہلے اس دروازہ پر پہنچو جس نے کعبہ کا احترام بچایا ہے اور تمہیں احترام کرنا سکھایا ہے اور زمین کعبہ اگر ناز کرے کہ میں محترم ہوں تو اس ناز سے پہلے اس کو زمین کربلا کے سامنے سرنگوں ہو کر نیازمندی کا اظہار کرنا پڑے گا۔ بے شک وہ تمام زمینوں پر سر افتخار بلند کر سکتی ہے لیکن زمین کربلا کے سامنے اس کا سر نیاز خم ہی رہے گا۔ پس زمین کربلا کی افضلیت اس لحاظ سے ہے کہ اس کا ساکن محسنِ اسلام ہے اور حج بیت اللہ اسلام کا ایک فرعی حکم ہے گویا بیت اللہ صرف حاجیوں کا محورِ التفات ہے اور حسینؑ تمام اہلِ اسلام کے لئے مرکزِ ہدایت ہے۔ پس مقام عمل میں کوئی زمین کعبہ کی زمین سے افضل نہیں ہو سکتی اور مقام ہدایت و رشد میں کوئی زمین کربلا کی زمین سے زیادہ درس آموز نہیں ہو سکتی، لہٰذا دونوں اپنے اپنے مقام پر افضل ہیں لیکن افضلیت کی حیثیتیں جدا جدا ہیں اور فرعی فضیلت قطعاً اصلی فضیلت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم یہ دونوں معنوی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں، لہٰذا جو کعبہ کا متوالا ہو اور کربلا والوں کو نظر انداز کر کے زمین کربلا کو حقیر سمجھے اس کے لئے کعبہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو شخص کربلا والوں کی محبت کا دم بھرتا ہو اور زمین کربلا کا زائر ہو لیکن کعبہ جانے کی

استطاعت رکھنے کے باوجود اس کو ترک کرے تو اس کا کربلا والوں سے محبت کا دعویٰ کرنا محض زبانی و بے بنیاد ہے، کیونکہ حسینؑ نے خود جامِ شہادت نوش فرما کر شعائر اسلامیہ کو زندہ کیا تھا تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص حسینی کہلوا کر شعائر اسلامیہ کو قائم کرنے سے گریز کرتا ہو۔ امامت اصل ہے اور حج فرع ہے پس جس طرح حج کا فعل بغیر اقرار امامت کے نادرست ہے اسی طرح اقرار امامت بغیر افعالیہ فرعیہ کے اقرار زبانی اور تعلقہ لسانی ہے، کیونکہ اصل و فرع دونوں ایک دوسرے کے بغیر فائدہ مند نہیں ہوا کرتے۔

سوال: یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس توجیہ کے اعتبار سے تو پھر مدینہ منورہ کی زمین کو سب سے افضل کہنا چاہیے۔

جواب: اس میں شک نہیں کی ایک زبان مخصوص تک مدینہ منورہ ہدایت خلق کا سرچشمہ رہا اور اسی لحاظ سے اطراف عالم کے جویان حق کی ہجرت گاہ بھی رہا حتٰی کہ اہل مکہ کے لئے بھی وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ کو چلے جانے کا حکم تھا۔ اور زمین مدینہ کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے لیکن حضرت رسالتمآبؐ کے بعد جب اسلامی شرعی حدود کی پامالی کے لئے اموی سلاطین جور نے اپنی اندھا دھند پیش قدمی سے اسلامیان عالم کو مسحور یا مرعوب کرتے ہوئے ظلم و استبداد کے اوچھے حربوں سے کام لینا چاہا تو سوائے حسین بن علیؑ کے اور کون تھا جس نے بہانگِ دہل بے پناہ قوتِ ایمانی کے ساتھ اس قسم کی پیش قدمیوں کے خلاف نعرۂ حق بلند فرمایا اور جان و مال اور ناموس کی ہر ممکن قربانی سے دریغ نہ کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے لئے سینہ سپر بنا اور سچ ہے کہ اگر حسینؑ نہ ہوتا تو اسلام کا لہراتا ہوا سرسبز و شاداب باغ اموی دورِ خزاں سے صحیح وسالم ہرگز نہ بچ سکتا۔ اگر حسینؑ کی قربانی نہ ہوتی تو یقیناً شمع اسلام کی حیثیت ایک

چراغ سحری کی سی رہ گئی تھی۔ اگر حسینؑ کا عزم واستقلال اور ثبات قدم ایک مضبوط چٹان بن کر سامنے نہ آتا تو دمشق کی طرف سے اٹھتا ہوا ظلم وجور کا بے پناہ طوفانِ خرمنِ اسلام کو بہا کرلے گیا ہوتا۔ پس حسینؑ نے اپنے آہنی ارادوں سے یزیدی منصوبوں کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ جس طرح حسینؑ کے اس مبارک ومضبوط اقدام نے کعبہ کی لاج رکھی اسی طرح حسینؑ کی عظیم الشان قربانیوں نے مدینہ کی حرمت اور صاحب مدینہ کی تیئیس سالہ محنت کو بقاؤ دوام کی خلعت بھی بخش دی اور اسلام کی اس فتح مبین کا سہرا زمین کربلا ہی کے سر پر ہے۔ لہذا یہ زمین تا قیامِ قیامت مرجع ہدایت خلق ہے اور یہی چیز اس کے شرف پائیدار کا بلند مینار ہے۔

زمین کربلا کی خصوصیات

① شیخ جعفر شوستری اعلی اللہ مقامہ، نے زمین کربلا کی خصوصیات بہت کچھ ذکر فرمائی ہیں ان میں سے بعض کو اس مقام پر بطور اختصار ذکر کرنا مناسب ہے مروی ہے کہ کعبہ کی خلقت سے چوبیس ہزار سال قبل زمین کربلا کو خلق کیا گیا۔

سوال: قرآن مجید، پہلا گھر خانہ کعبہ کو بتلاتا ہے اور حدیث مذکور میں زمین کربلا کو خلقت میں مقدم کہا گیا ہے۔

جواب: قرآن مجید میں کعبہ کے روئے زمین پر پہلی عبادت گاہ بنائے جانے کا اعلان کیا گیا ہے کیونکہ یہودیوں نے تحویل قبلہ کے بعد مسلمانوں پر یہ اعتراض شروع کر دیا تھا کہ بیت المقدس روئے زمین پر پہلی عبادت گاہ ہے حتیٰ کہ حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ بھی یہی تھا تو خداوند کریم نے ان کی رد میں ارشاد فرمایا ہے: وہ غلط کہتے ہیں اور صحیح یہ ہے کہ لوگوں کے لئے زمین پر پہلی جائے عبادت جس خطۂ ارضیہ کو قرار دیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے یعنی خانہ کعبہ۔ پس قرآنِ مجید میں کعبہ کی خلقت کا کوئی

تذکرہ نہیں بلکہ صرف اس کے قبلہ ہونے کی سبقت کا اعلان ہے اور حدیث مذکور میں زمین کربلا کی خلقت کی تقدیم کا ذکر ہے۔ لہذا مضمونِ حدیث اور مفہوم آیت میں کوئی تعارض نہیں یعنی خلقت میں زمین کربلا کو زمین کعبہ پر تقدیم حاصل ہے اور قبلہ ہونے میں کعبہ کو بیت المقدس سے اوّل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گزشتہ بعض احادیث میں جہاں کعبہ کی پیدائشی سبقت بیان کی گئی ہے وہاں زمین کربلا کے علاوہ باقی زمینوں سے سبقت مراد ہے (واللہ اعلم)

۲ مروی ہے کہ زلزلۂ قیامت کا وقت آئے گا تو زمین کربلا کو اٹھا لیا جائے گا اور یہ خطہ جنت کے تمام خطوں سے افضل ہوگا اور جنت کے ریاض میں یہ زمین اس طرح چمکے گی جس طرح کوکب دری دوسرے ستاروں سے نمایاں طور پر اپنی چمک دمک کو ظاہر کرتا ہے حتی کہ اس کی چمک سے تمام اہل جنت کی آنکھیں خیرگی محسوس کریں گی اور اس کی آواز آئے گی کہ میں وہ پاک زمین ہوں جسے شہیدوں کے مدفن و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

۳ خاکِ شفا کی تسبیح سے استغفار کرنا ستر گنا زیادتی ثواب کا موجب ہے۔

۴ خاکِ کربلا یعنی خاک شفا کی تسبیح کا ہاتھ میں رکھنا بھی تسبیح پڑھنے کے ثواب کے برابر ہے۔

۵ خاکِ شفا پر سجدہ کرنے سے مقبولیت عبادت کی رکاوٹ کے ساتھ حجاب دُور ہو جاتے ہیں اور عبادت مقبول ہو جاتی ہے۔

۶ مٹی کا کھانا حرام ہے لیکن خاکِ شفا کا شفایابی کی نیت سے کھانا جائز ہے۔

۷ خاکِ شفا کا پاس رکھنا ہر قسم کے خطرات سے بچنے کا حرز اور تعویز ہے بشرطیکہ اسی نیت سے اپنے پاس رکھے۔

۸ اگر سامانِ تجارت میں خاکِ شفا کو رکھا جائے تو تجارت میں برکت نصیب ہو گی۔

۹ نوزائیدہ بچے کے حلق میں خاکِ شفا ڈالنا اس کی امن وسلامتی کا موجب ہے۔

۱۰ میت کے ساتھ قبر میں خاکِ شفا کا رکھنا عذابِ قبر سے امان کا موجب ہے۔

۱۱ میت کے حنوط کے ساتھ خاکِ شفا کی ملاوٹ مستحب ہے۔

۱۲ زمین کربلا میں دفن ہونے والا بغیر حساب جنت میں داخل ہوگا۔

۱۳ زمین پر اترنے والے فرشتے جب واپس جاتے ہیں تو حوریں ان سے خاکِ شفا کا تحفہ طلب کرتی ہیں۔

۱۴ تمام ملائکہ بطور تحفہ خاکِ شفا کو جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں لے جاتے رہے ہیں۔

۱۵ یہی زمین حضرت عیسیٰؑ کی ولادت گاہ ہے۔

۱۶ حضرت موسیٰؑ کو جس زمین پر شرف کلام حاصل ہوتا تھا وہ یہی زمین تھی۔

۱۷ آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک تمام انبیاء کا ورود اس مقدس زمین پر ہوا۔

۱۸ "اسی مقدس زمین میں واقعات کربلا سے قبل دو سو نبی، دو سو وصی اور دو سو سبطِ نبی دفن ہوئے جو درجۂ شہادت پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ (خصائص حسینیہ، تفسیر انوار النجف، جلد۴، پارہ۳، صفحہ۱۲)

ولادتِ علیؑ در کعبہ

کعبہ کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی جائے ولادت ہے اور اس شرف پر کعبہ کو بجا طور پر ناز ہے۔ کتب فریقین میں حضرت علیؑ کی کعبہ میں ولادت کی خصوصیات اور کعبہ کی حضرت علیؑ کے مولد ہونے کی

خصوصیت کو متفق طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ کفایۃ الطالب گنجی سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں ایک عابد تھا جسے مسرم کہتے تھے اور اس نے دوسو ستر برس خداوند کریم کی عبادت کی تھی اور کبھی اپنی کسی حاجت کا سوال نہ کیا تھا۔ حضرت ابو طالبؑ کو خدا نے اس کے پاس بھیج دیا۔ اس نے دیکھتے ہی اٹھ کر تعظیم کی سر کا بوسہ دیا اور اپنے سامنے جگہ دی پھر ان سے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ حضرت ابو طالبؑ نے جواب دیا کہ میں تہامہ (مکہ) کے رہنے والا ہوں۔ اس نے نسب دریافت کیا: آپ نے فرمایا کہ میں ہاشمی ہوں۔ وہ عابد سنتے ہی دوبارہ اُٹھا اور حضرت ابو طالبؑ کے سر کو بوسہ دیا اور کہا کہ مجھے خدا نے بطور الہام خبر دی ہے کہ خدا تجھے ایک فرزند عطا کرے گا جو ولی اللہ ہوگا۔ پس جس شب کو حضرت علیؑ کا تولد ہوا تو فضائے عالم آپ کو طلعتِ نورانی سے منور ہوئی۔ حضرت ابو طالب نے باہر نکل کر اعلان فرمایا دیا کہ بندگانِ خدا کعبہ میں ولی اللہ کو تولد ہو چکا ہے۔ صبح سویرے جب داخل کعبہ ہوئے تو یہ اشعار اپنی زبان پر جاری کیے۔

يَا رَبَّ هٰذَا الْغَسَقِ الدُّجِىِّ
وَالْقَمَرِ الْمُبَلَّجِ الْمُضِىِّ
بَيِّنْ لَنَا مِنْ اَمْرِكَ الْخَفِىِّ
مَاذَا تَرىٰ فِىْ اِسْمِ ذَاالصَّبِىِّ

"اے پھیلتی ہوئی تاریکی اور روشنی پھیلانے والے چاند کے پروردگار اپنے مخفی راز میں سے تو ہی بتا کہ تیرے نزدیک اس بچے کا کیا نام ہونا چاہیے۔"

پس ہاتف غیبی کی ندا کان میں پہنچی۔

يَا اَهْلَ بَيْتِ الْمُصْطَفَى النَّبِى
خُصِّصْتُمْ بِالْوَلَدِ الزَّكِى
اِنَّ اِسْمَهُ مِنْ شَامِخٍ عَلِيّ
عَلِىٌّ اشْتُقَّ مِنَ الْعَلِيّ

''اے مصطفیٰ نبی کے گھر والو! تمہیں یہ بچہ مبارک ہو علی اعلیٰ نے ان کا نام اپنے نام سے مشتق کر کے علی رکھا ہے۔''

۴ مستدرک حاکم سے مروی ہے:

تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَسَد وَلَدَتْ اَمِيْرَ الْمُوْمِنِيْنَ عَلِىَّ بْنَ اَبِىْ طَالِب كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ فِىْ جَوْفِ الْكَعْبَةِ

''احادیث میں یہ بات تواتر سے پہنچی ہے کہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہ جناب فاطمہ بنت اسد کے بطن مبارک سے کعبہ کے اندر ہی پیدا ہوئے۔''

۴ ابن صباغ مالکی فصول مہمہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام مکہ مشرفہ میں بیت اللہ کے اندر ۱۳ رجب بروز جمعہ ۳۰ عام الفیل ہجرت سے ۲۳ یا بقولے ۲۵ سال قبل اور بعثت سے ۱۲ سال یا بقولے ۱۰ سال پہلے پیدا ہوئے اور ان سے پہلے بیت اللہ میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ یہ وہ فضیلت ہے کہ اس میں آپ کا کوئی شریک نہیں اور ان کے اجلال، علو مرتبت اور اظہار کرامت کے لئے ہی خدا نے ان کو یہ شرف خصوصی مرحمت فرمایا اور نیز آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی ہیں۔

۴ بحار الانوار سے مروی ہے کہ سعید بن جبیر یزید بن قعنب سے روایت

کرتا ہے کہ میں اور عباس بن عبد المطلب بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے اچانک ہم نے والدہ امیر المومنین علیہ السلام حضرت فاطمہ بنتِ اسد کو آتے دیکھا اور آپ نو ماہ سے حاملہ تھیں آپ کو خاص تکلیف محسوس ہوئی جو عورتوں کی زائیدگی کے وقت ہوا کرتی ہے تو یہ دُعا زبان پر جاری کی اے پروردگار! میں تیرے اُوپر ایمان رکھتی ہوں نیز تیرے رسولوں اور تیری کتابوں کو مانتی ہوں اور اپنے جدِ بزرگوار حضرت خلیل علیہ السلام کی تصدیق کرتی ہوں جنہوں نے بیت اللہ کی بنیاد رکھی تھی پس تجھے اس گھر کی بنیاد رکھنے والے کے حق کی اور اس بچّہ کے حق جو میرے بطن میں ہے قسم دے کر سوال کرتی ہوں کہ اس بچّہ کی ولادت کا معاملہ میرے اُوپر آسان فرما۔ یزید بن قعنب کہتا ہے کہ ہم نے دیکھا دیوار کعبہ پشت کی طرف سے شق ہوئی اور جناب فاطمہ اندر داخل ہو کر ہماری نظروں سے غائب ہو گئیں اور دیوار پہلے کی طرح متصل ہو گئی۔ ہم نے سامنے سے آکر قفل کھولنا چاہا لیکن ہمیں ناکامی ہوئی پس ہم سمجھ گئے کہ یہ قدرتی راز ہے۔ اس کے بعد چوتھے روز جناب فاطمہ بنت اسد حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو ہاتھوں پر اٹھا کر باہر آئیں اور فخریہ یہ الفاظ زبان پر جاری کیے کہ مجھے گذشتہ تمام عورتوں سے فضیلت عطا کی گئی ہے کیونکہ آسیہ بنت مزاحم نے خفیہ طور پر ایک ایسی جگہ خُدا کی عبادت کی جہاں بغیر اضطرار کے کسی کی عبادت کو جائز نہیں قرار دیا جاتا اور حضرت مریم بنت عمرانؑ نے خشک کھجور کو حرکت دے کر تازہ پھل حاصل کیے اور نوش فرمائے اور میں بیت اللہ میں داخل ہو کر جنت کے میوہ جات کھاتی رہی ہوں۔ جب میں نے وہاں سے باہر آنے کا ارادہ کیا تو ہاتف غیبی کی جانب سے ندا پہنچی۔ اے فاطمہؑ! اس بچہ کا نام علیؑ رکھو، پس وہ علیؑ ہے اور خدائے علی واعلیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اس کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے اور میں نے خود ہی اس کو اپنے آداب تفویض کیے ہیں اور اس کو اپنے رموزِ علم

سے اطلاع بخشی ہے۔ وہ میرے گھر سے بتوں کو توڑ کر نکالے گا اور وہی اعلانیہ میرے گھر میں اذان دے گا اور میری تقدیس و تمجید بیان کرے گا پس اس کے حبداروں اور اطاعت گذاروں کے لئے طوبیٰ اور اس کے دشمنوں اور نافرمانوں کے لئے ویل ہے۔ مناسبت مقام اور تبرک کے لئے یہ روائتیں نقل کی گئی ہیں۔

کعبہ جائے امن ہے

کعبہ کی خصوصیات میں سے ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا جو بھی اس میں داخل ہوا وہ امن رہے گا۔ یہ خصوصیت صرف مکان کعبہ کی نہیں بلکہ حدود حرم کے اندر کا علاقہ سب کا سب اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی جاہلی عربوں کا یہ دستور تھا کہ اگر حرم کے اندر اپنے سگے باپ کے قاتل کو بھی پا لیتے تھے تو حرم کی حرمت کی پاسداری کرتے ہوئے اس سے ان حدود کے اندر انتقام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ تفسیر صافی میں بروایت علل حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ابوحنیفہ سے آیت کے اسی ٹکڑے کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ زمین کونسی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کعبہ تو آپ نے فرمایا کہ حجاج بن یوسف نے جب حملہ کیا تھا اور ابن زبیر کعبہ میں ہی قتل ہو گیا تھا تو اس کے لئے پھر جائے امن کیسے رہا؟ وہ جواب سے عاجز آ گیا۔ اس سوال و جواب کی قدرے تفصیل انوار النجف صفحہ ۸۰، ۸۱ پر موجود ہے۔ آخرکار اس نے آپ سے ہی اس کی تاویل پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جو ہمارے قائم علیہ السلام کی بیعت کر کے اس میں داخل ہوں گے اور ان کے ہاتھ پر رکھ کر ان کے صحابہ میں شامل ہوں گے اسی کتاب میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آیت مجیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کی جانب سے عائد کردہ جمیع احکام کا عارف و معترف ہو کر جو بھی اس میں داخل ہو گا وہ آخرت کے

دائمی عذاب سے نجات پائے گا۔

بروایتِ عیاشی آپ سے مروی ہے کہ لوگوں میں سے جو بھی حرم کو پناہ سمجھ کر اس میں داخل ہوگا وہ غضبِ خدا سے محفوظ ہوگا اور جانوروں اور پرندوں میں سے جو بھی اس میں داخل ہوگا اس کو اذیت نہیں دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ حرم کی حدود سے باہر چلا جائے۔

اس میں سب سے پہلے حضرت سید الشہداؑ کو کعبہ میں خوفزدہ کیا گیا جس کی بناء پر آپ نے احرام حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے اعمال بجالانے کے بعد احرام کھولا اور وہاں سے روانہ ہوگئے اور یہ اس لیے کہ کہیں ہماری وجہ سے حرم خدا کی ہتک نہ ہو اور اس کا مفصل تذکرہ کتب مصائب میں موجود ہے۔

تنبیہ: یہ روایات تاویل اور باطن کے لحاظ سے ہیں ورنہ ظاہر کے لحاظ سے ابتداء خلقت سے لے کر تا قیامِ قیامت کعبہ جائے امن ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ کعبہ میں پناہ حاصل کرنے والے کو خوفزدہ کرے۔ انسان تو بجائے خود کسی حیوان کو بھی حدودِ حرم کے اندر ستایا نہیں جاسکتا اور جو شخص اس حکم کی مخالفت کرے گا وہ حرم خدا کی توہین کرنے والا سمجھا جائے گا جس کے لئے وہ بارگاہ ربّ العزت میں بروز محشر جوابدہ ہوگا۔

حجِ کعبہ

لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ: تفسیر صافی میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہاں حج و عُمرہ دونوں مراد ہیں۔ اور استطاعت کے متعلق آپ سے مروی ہے کہ بدن تندرست ہو اور مالی طاقت موجود ہو تو وہ مستطیع گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ بدن تندرست، زادِ راہ موجود اور راستہ پُر امن ہو۔

بہر کیف فقہائے امامیہ کے نزدیک وجوب حج کے شرائط چند ہیں:

- کامل العقل ہو، لہٰذا نابالغ اور دیوانے پر حج واجب نہیں ہوا کرتی۔
- آزاد ہو، لہٰذا غلام پر حج واجب نہیں ہوتی۔
- زادوراہ موجود ہو یعنی مالی طاقت موجود ہو کہ اپنے راستہ کے آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ اپنی واپسی تک کا بال بچوں اور دیگر واجب النفقہ افراد کی ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہو۔ (تفسیر انوار النجف۔ جلد۳، پارہ۴، صفحہ ۱۶)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سورۃ آل عمران:۱۰۲)

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے اور تم پر موت نہ آنے پائے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔"

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورۃ آل عمران:۱۰۳)

"اور تمسک پکڑو اللہ کی رسی سے مل کر اور جدا جدا نہ ہو۔"

معرفت کی آخری منزل

معرفت کی آخری منزل کو دوسرے مقام پر اطمینانِ قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ پس معرفت کی منازل کے ساتھ ساتھ اسلام وتسلیم کے مراتب اور اطاعت تقویٰ کے مدارج میں ارتقاء ہوتا جاتا ہے۔ جب معرفت حق الیقین کے مرتبہ پر پہنچتی ہے تو تسلیم واطاعت میں کُنْ لِيْ اَكُنْ لَكَ کا منظر سامنے ہوتا ہے اور تقویٰ حَقَّ تُقَاتِهٖ کی منزل کو پہنچ جاتا ہے اور تمام انسانوں کو تقویٰ کی اسی آخری منزل تک پہنچنے کی دعوت دی گئی ہے لیکن چونکہ ہر انسان کے بس سے باہر ہے کہ اس مرتبہ پر فائز ہو کیونکہ اطاعت کی بعض منزلیں ایک عام انسان کے لئے ناشدنی اور غیر

ممکن معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اہل معرفت مقام سلوک میں ان کو اپنے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل چکے ہوتے ہیں لہذا دوسرے مقام پر خود ہی ارشاد فرمادیا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پ ۲۸ سورہ تغابن)

''یعنی تقویٰ اختیار کرو جس حد تک کرسکو۔''

میں نے ایک روایت میں دیکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک نماز گذار کے پاس سے گذر ہوا تو اس کی نماز ناقص دیکھ کر حیران ہوئے اور خداوند کریم کی بارگاہ میں اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا تو ارشاد ہوا: اے موسیٰ! تو اپنی معرفت کے ساتھ اس کی عبادت کا موازنہ نہ کر بلکہ اس کی عبادت کا موازنہ اس کی اپنی معرفت سے ہوگا اور تیری عبادت کا موازنہ تیری معرفت سے ہوگا۔ اگر تجھے میری معرفت اس طرح حاصل ہوتی جس طرح میں خود اپنی معرفت رکھتا ہوں تو تجھے اپنی عبادت اسی طرح حقیر معلوم ہوتی جس طرح اب اس عبادت گذار کی عبادت کو تو حقیر سمجھ رہا ہے۔

پس اطاعت وتقویٰ کی آخری منزل تک جانے کی دعوت ہر ایک کو ہے لیکن اس مرحلہ تک جانے والوں کے مراتب میں تفاوت ہے اور ہر شخص اپنی قوتِ معرفت اور طاقت ایمان ویقین کی مقدار کے ماتحت اس کی طرف اقدام کرتا ہے اور لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ بھی اسلام کی اسی آخری منزل تک پہنچنے کا پیغام ہے اور قطعاً یہاں اسلام کا پہلا مرتبہ مقصود ہے جو حضرت خلیل نے اپنے لئے طلب کیا تھا اور وہی حق تقویٰ کے مساوی ہے۔

تفسیر برہان میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس آیت پر سوائے اہلبیت رسولؐ کے اور کسی نے عمل نہیں کیا۔ ہم نے اس کا ذکر کیا اور کبھی اس کو فراموش نہیں کیا۔ ہم نے اس کا شکر کیا اور کبھی کفر نہ کیا اور ہم نے ہی اس کی اطاعت کی

اور کبھی گناہ نہ کیا اور یہ آیت اتری تو صحابہ نے عرض کی: یا رسولؐ اللہ! ہم میں تاب نہیں کہ حق تقویٰ کی منزل کو پہنچ سکیں۔ تب ارشاد ہوا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی تقویٰ کرو جس حد تک کر سکو اور معرفت جب حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچتی ہے تو کبھی عبادت سے سیری حاصل نہیں ہوتی۔ ادھر سے ارشاد ہوتا ہے: ''میرے حبیب! ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت میں پڑو (پ ۱۶) لیکن اس طرف سے جی نہیں بھرتا۔ عرض کرتے ہیں: مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ اور یہ ہے تقویٰ کی آخری منزل ادھر سے محبت و پیار کے لہجے میں عبادت کے گھٹانے کی فرمائش اور ادھر سے رنگ عبودیت میں عبادت کے بڑھانے کی خواہش اور کربلا والوں نے حق تقویٰ کا جو مظاہرہ کیا وہ ان کی منزل حق الیقین کا خوب ترجمان ہے۔ اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو اس مقام پر روشنی ڈالی جاتی۔ تاہم تاریخ کی اوراق گردانی کے بعد نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ کی تفسیر

● تفسیر برہان میں جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے کہ ایک دفعہ اہل یمن کا وفد خدمتِ اقدس جناب رسالتمآبؐ میں پہنچا تو آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا۔ یہ وہ قوم ہے جن کے دل نرم اور ایمان راسخ ہیں اور انہی سے منصور ہوگا جو ستر ہزار کی فوج لے کر میرے خلیفہ اور میرے وصی کے خلیفہ کی نصرت کرے گا اور ان کی تلواروں کے میان چرمی ہوں گے۔ انہوں نے عرض کی: حضور آپ کا وصی کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا وہ وہی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ

انہوں نے عرض کی: اس حبل سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا: خدا فرماتا ہے:

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

"اللہ کی طرف سے حبل قرآنِ مجید ہے اور لوگوں میں سے حبل میرا وصی ہے، پھر انہوں نے وصی کا مصداق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: وہ وہی ہے جس کو اللہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ ارشادِ قدرت ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ

(پ۲۴ زمر)

آپ نے فرمایا: اسی کو خدا نے سبیل بھی کہا ہے:

یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ

الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (پ ۱۹ الفرقان)
''جس دن ظالم حیرت وحسرت سے اپنے دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا۔ کاش میں نے رسولؐ اللہ کے ساتھ سبیل کو پکڑا ہوتا۔''

اس سے مراد میرا وصی ہے اور وہی میرے بعد مجھ تک پہنچانے کا راستہ ہے۔ انہوں نے آپ کو اپنی نبوت کا واسطہ دے کر پھر سوال کیا کہ وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: خدا نے اس کو غور کرنے والوں کے لئے آیت ونشانی قرار دیا ہے۔ لہٰذا تم اس مجمع کی صفوں میں غور سے نگاہ کرو۔ پس جس کی طرف تمہارا دل جھک جائے سمجھو کہ وہی ہے پس ان میں سے ابو عامر اشعری، ابو غرہ خولانی، ظبیان، عثمان بن قیس، غرقہ دوسی اور لاحق بن علاقہ نے کھڑے ہو کر تمام صفوں پر نگاہ دوڑائی۔ آخر کار حضرت امیر المومنین علیہ السلام پر ان کی نظرِ انتخاب نے قرار پکڑا۔ پس جناب رسالتمآبؐ نے ان کی تصدیق وتائید فرمائی اور ان کو نہایت وقیع لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا پھر فرمایا کہ تم نے اس کو کس طرح پہچان لیا ہے؟ عرض کرنے لگے: حضورؐ! ہم نے جب تمام صفوں کو چھانا تو ہماری نظریں سوائے علی ابن ابیطالبؑ کے کسی پر مطمئن نہ ہوئیں لیکن اس کو دیکھتے ہی آنکھیں سیر ہو گئیں، دل ٹھنڈا ہو گیا اور طبیعت میں سکون واطمینان آ گیا۔ پس ہم یہ سمجھے کہ یہ وہی ہوگا۔ پھر آپ نے ان کو دعا دی اور شہادت کی بشارت دی اور جنت کا مژدہ سنایا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ لوگ حضرت امیر علیہ السلام کے ہمرکاب ہو کر جنگِ صفین میں شہید ہو کر داخلِ جنت ہوئے۔

❷ حضرت علی ابن الحسینؑ سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت رسالتمآبؐ اپنے صحابہ کے ساتھ مسجد میں رونق افروز تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ابھی یہاں ایک شخص آئے گا جو اہل جنت سے ہوگا اور کام کی بات پوچھے گا پس فوراً ہی ایک لمبے قد والا

جوان جو اہل مصر سے مشابہت رکھتا تھا داخل مسجد ہوا۔ جناب رسالتمآبؐ پر سلام کر کے بیٹھ گیا پھر وَاعْتَصِمُوْ بِحَبْلِ اللّٰهِ پڑھ کر عرض کرنے لگا: حضورؐ فرمائے جبل اللہ سے کون مراد ہے؟ آپ نے تھوڑی دیر خاموشی سے سر جھکا کر بلند کیا اور علیؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ وہی ہے جس نے اس کے ساتھ تمسک پکڑا وہ دنیا و آخرت میں گمراہی سے محفوظ رہا۔ پس اس شخص نے فوراً اٹھ کر حضرت علیؑ کو گلے لگایا اور اِعْتَصَمْتُ بِحَبْلِ اللّٰهِ "یعنی میں جبل اللہ سے تمسک رکھتا ہوں" کہتے ہوئے چلا گیا۔ ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کی: یارسول اللہؐ! اگر اجازت ہو تو میں اس سے بخشش کی دعا کا سوال کروں۔ آپ نے اجازت دی پس وہ باہر آ کر اس سے ملا اور طلب بخشش کی، اپنے لئے خواہش ظاہر۔ اس نے جواب دیا کہ جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ میرا سوال و جواب تو نے سن لیا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: ہاں سنا ہے۔ پس اس نے جواب دیا کہ اگر تو اسی شخص سے تمسک پکڑے گا (یعنی علیؑ سے) تو تیرے لئے خدا کی بخشش ہے ورنہ نہیں۔

❸ بروایت امالی شیخ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ سے مراد ہم ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ الخ میں جبل اللہ سے مراد بھی ہم ہیں۔

❹ جناب رسالتمآبؐ نے مرض موت میں مہاجر و انصار کے مجمع میں ایک خطبہ پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے گروہ مہاجر و انصار اور جملہ حاضرین جو اس جگہ موجود ہیں خواہ جن ہوں یا انسان ان کا فرض ہے کہ غیر موجود لوگوں تک میری بات پہنچا دیں اور وہ یہ کہ میں تم میں اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں جس میں نور و ہدایت اور فرائض خداوندی کا بیان ہے وہ اللہ کی طرف سے اور میری اور میرے ولی کی طرف

سے تم پر حجت ہے اور میں تم میں علم اکبر، علم دین اور نور وشمع ہدایت علی بن ابیطالبؑ کو چھوڑے جا رہا ہوں اور یہ ہے حبل اللہ، اس کے بعد وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ کی آیت تا آخر تلاوت فرمائی اور فرمایا: اے لوگو! جو شخص علیؑ سے محبت وتولی رکھے گا اس نے اللہ کے عہد کو پورا کیا اور جس نے اس کے ساتھ بغض وعداوت کو برتا تو وہ بروز محشر اندھا و بہرہ محشور ہوگا اور اس کی کوئی شنید نہ ہوگی۔

● عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ ہم خدمت نبویؐ میں موجود تھے کہ ایک اعرابی نے پوچھا: حضورؐ! آپ فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ الخ ہمیں بتایئے تو سہی کہ وہ کون حبل اللہ ہے جس سے ہم کو تمسک کا حکم دیا جا رہا ہے آپؐ نے اپنا دستِ مبارک علیؑ کے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا: اس کے ساتھ تمسک پکڑو، کیونکہ یہی حبل اللہ ہے۔

● بروایت عیاشی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب حبل اللہ ہیں۔

● جابر نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی کہ آلِ محمدؐ ہی حبل اللہ ہیں جس سے تمسک کا حکم ہے۔

نیز حدیثِ ثقلین جو فریقین میں تواتر سے ثابت ہے بلکہ علمائے حدیث سے مروی ہے کہ یہ حدیث جناب رسالتمآبؐ سے پینتیس صحابہ نے روایت کی ہے اور اس کے بعض حوالہ جات بمعہ اصل عبارات مقدمہ تفسیر انوار النجف صفہ ۹۰ تا صفہ ۹۴ میں ہم نے نقل کر دیئے ہیں۔ لہذا یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تفرقۂ امت

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا:
حضرت موسیٰؑ کی امت کے اکہتر فرقے ہوئے جن میں سے ایک ناجی اور ستر ناری تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی امت کے بہتر فرقے ہوئے جن میں سے ایک ناجی اور اکہتر ناری تھے:

وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَتَفْتَرِقُ بَعْدِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَ سَبْعِیْنَ فِرْقَةً مِنْهَا نَاجِیَةٌ وَاثْنَتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِی النَّارِ

''اور میری امت کے تہتر ۷۳ فرقے ہوں گے ان میں صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا اور بہتر ناری ہوں گے۔''

اسی روایت کو ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور حاکم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ گو الفاظ جدا جدا ہیں لیکن مطلب ایک ہے (میزان)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے اکہتر فرقوں میں سے ایک ناجی تھا اور وہ یقیناً وہی تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کے وصی حضرت یوشعؑ کی پیروی میں رہا اور جو ان سے انحراف کر کے اپنی خواہشات کی طرف دوڑ کر الگ ہو گئے وہ ناری ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ کی امت کے بہتر فرقوں سے ناجی صرف وہی تھا جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے نامزد وصی حضرت شمعون کا پیروکار رہا پس جنہوں نے ان سے علیحدگی اختیار کر کے نئی جماعتوں کی تشکیل کی وہ گمراہ ہو کر ناری ہو گئے۔ اسی طرح حضرت رسالتمآبؐ کی امت کے تہتر فرقوں سے بھی ناجی فرقہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو حضرت رسالتمآبؐ کے بعد ان کے نامزد وصی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا پیروکار رہے گا اور قرآن مجید نے تفریق کی تردید کر کے صرف حبل اللہ سے تمسک پکڑنے کا حکم

دیا ہے، جس کا مصداق ازروئے حدیث صرف حضرت علی بن ابی طالب ہی ہے، اور ان کے بعد ان کی عترت طاہرہ ہے اور نیز حدیث ثقلین کے غیر مبہم الفاظ بھی اسی امر کی تائید کرتے ہیں۔ پس یقیناً امت محمدیہ کے تہتر فرقوں میں ناجی فرقہ صرف وہی ہے، جو حضرت علیؑ کا پیروکار ہو اور اس کے علاوہ جس قدر فرقے ہونگے ازروئے قرآن وحدیث وہ قطعاً ناجی نہیں ہو سکتے۔

(ہم تفسیر انوار النجف جلد دوم میں صفحہ ۱۹۶ تا صفحہ ۲۰۱ اس کی مزید وضاحت کر چکے ہیں)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ: بعض روایات میں اُمَّةٌ کی جگہ اَئِمَّةٌ ہے جیسا کہ مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام امت پر واجب ہے؟ آپ نے فرمایا! نہیں! پھر سوال کیا گیا کہ یہ کیسے؟ آپؑ نے فرمایا: یہ عہدہ اس شخص کا ہے جو صاحب طاقت ہو جس کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہو اور معروف اور منکر کا عالم بھی ہو ایسے شخص پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا جو کمزور ہو اور اسے خود بھی سمجھ نہ ہو کہ کہاں سے کہاں جارہا ہے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ

(سورہ آل عمران آیت ۱۰۷)

اَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ: بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد مطلق کافر ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد بدعت ایجاد کرنے والے اور خواہش پرست ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مرتد لوگ ہیں جو اسلام سے پھر گئے۔ جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ میں بروز محشر حوض کوثر پر کھڑا ہوں گا کہ بعض لوگوں کو دور کیا جائے گا۔ پس میں کہوں گا کہ یہ تو میرے صحابی ہیں۔ اس وقت جواب ملے گا کہ آپ کو

معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کونسی بدعات کی ہیں! یہ لوگ آپ کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ کتب صحاح اہل سنت سے بھی یہی مروی ہے جیسا کہ ہم نے مقدمہ تفسیر انوار النجف میں با حوالہ نقل کیا ہے۔ (ص ۱۵۳، صفحہ ۱۵۴)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ: تفسیر صافی میں قمی سے مروی ہے: ابوذرؓ کہتا ہے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میری امت بروز محشر پانچ علم کے گروہ میرے پاس پہنچے گی۔ پہلا علم میری امت کے گوسالہ کا ہوگا۔ میں ان سے ثقلین کے متعلق باز پرس کروں گا تو وہ کہیں گے کہ ثقل اکبر کی ہم نے تحریف کی تھی اور اس کو پشت کے پیچھے ڈال دیا تھا اور ثقل اصغر کو اپنی دشمنی و بغض کا نشانہ بنایا تھا اور اس پر ظلم کیا تھا پس میں کہوں گا کہ جاؤ جہنم روسیاہ اور پیاسے ہو کر پھر فرعون امت کا علم مجھ پر وارد ہوگا۔ ان سے بھی ہیں ثقلین کی بابت سوال کروں گا وہ کہیں گے کہ ثقل اکبر کو ہم نے بدل ڈالا تھا اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی مخالفت کی اور ثقل اصغر سے لڑائی اور دشمنی کی تھی۔ میں کہوں گا جاؤ روسیاہ اور پیاسے ہو کر۔ تیسرے نمبر پر میری امت کے سامری کا جھنڈا مجھ پر وارد ہوگا اور میں وہی سوال دہراؤں گا۔ وہ کہیں گے: ثقلِ اکبر کو چھوڑ دیا تھا اور اس کی نافرمانی کی تھی اور ثقلِ اصغر کو ذلیل و رسوا کیا تھا اور ان کو بھی میں کہوں گا کہ جاؤ جہنم روسیاہ ہو کر اور پیاسے ہو کر۔

پھر ذوالثدیہ کا جھنڈا امام خوارج کی ہمراہی میں مجھ پر وارد ہوگا اور ان سے بھی وہی سوال کروں گا تو وہ کہیں گے کہ ثقل اکبر کو ہم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سے بیزار ہو گئے تھے، اور ثقل اصغر سے لڑے تھے اور ان کو قتل کیا تھا پس ان کو بھی کہوں گا جاؤ جہنم روسیاہ ہو کر اور پیاسے ہو کر۔ سب سے آخر میں امام المتقین، سید الوصیین، یعنی حضرت علی علیہ السلام بن ابی طالب کا جھنڈا فضا میں لہراتا ہوا پہنچے گا اور میں وہی سوال

دہراؤں گا۔ تو یہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم نے ثقل اکبر کی اطاعت کی تھی اور ثقل اصغر سے تولا و محبت کرتے ہوئے ان کی نصرت کی تھی، یہاں تک کہ ہم نے اپنے خون کا آخری قطرہ ان کی نصرت میں قربان کر دیا تھا۔ پس میں کہوں گا حوض کوثر سے سیراب ہو کر نورانی وسفید چہروں کے ساتھ جنت خلد میں چلے جاؤ۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے نیکی کا امر کرے بعد برائی سے روکیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

(العمران آیت ۱۰۴)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

''ہو تم (محمدؐ و آل محمدؐ بہتر گروہ جو بھیجا گیا لوگوں (کی ہدایت کے لئے اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو ان کے لئے اچھا ہوتا ان میں سے بعض ایمان دار ہیں اور زیادہ فاسق ہیں (یہودی لوگ) ہر گز تمہیں ضرر نہ پہنچا سکیں گے سوائے (زبانی) تکلیف کے اور اگر تم سے (میں بھی) تو پشت دکھا کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی کوئی مدد نہ کی

جائے گی۔" (آل عمران آیت ۱۱۰)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تفسیر برہان اور تفسیر صافی میں قمی سے منقول ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام کے سامنے یہ آیت اس طرح پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا امت یہی ہے جس نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے دونوں فرزندوں کو بے جرم گناہ شہید کر ڈالا؟ قاری نے دریافت کیا: حضور! پھر یہ آیت کس طرح اتری ہے؟ آپؑ نے فرمایا خَيْرَ اَئِمَّةٍ کے لفظ سے نازل ہوئے ہے (یعنی تم بہترین امام وہادی ہو) چنانچہ بعد میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ایمان اللہ کی صفات سے ان کی مدح فرمائی ہے۔ تفسیر عیاشی سے حضرت علی علیہ السلام کی قرأت میں بھی خَيْرَ اَئِمَّةٍ منقول ہے۔ نیز حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت جناب رسالت مآبؐ اور اس کے اوصیاء طاہرین کے حق میں نازل ہوئی اور موجودہ قرأت کے اعتبار سے اگر لفظ امت بھی ہو تو اس سے عام امت ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ وہ امت مراد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں عرض کی تھی:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً

اور وہ صرف حضرت رسالت مآبؐ اور ان کی عترت طاہرہ ہیں اور غالباً روایات گزشتہ خَيْرَ اَئِمَّةٍ بطور تفسیر وتاویل کے کہا گیا ہے جیسا کہ پہلی روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا تعلق بیان اس کا شاہد ہے یعنی خَيْرَ اَئِمَّةٍ کا مصداق عام امت ہرگز نہیں ہوسکتی جنہوں نے آئمہ طاہرین کے بے گناہ خون میں اپنے ہاتھ رنگے بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرینہ سے یہاں خیر امۃ سے مراد خیر ائمۃ ہے اور امت وسطیٰ سے بھی یہی لوگ مراد ہیں۔ اس سے پہلے یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کے فریضہ کو انجام دینے والا ہو۔ پس اس جگہ خود ہی اس گروہ کی نشاندہی فرمادی اور بوقت نزول آیت باقی آئمہ طاہرینؑ کا موجود ہونا باعث حرج نہیں کیونکہ ان کا رئیس حضرت امیر المومنین علیہ السلام موجود تھا، اور قرآن چونکہ تا قیامت زندہ ہے لہذا اس کے مصداق کا تا قیامت باقی رہنا ضروری ہے۔ پس ہر زمانہ میں اس آیت کا مصداق باقی رہا اور اب حضرت محبؑ علیہ السلام اس کا مصداق موجود اور زندہ ہے یَحملُ اللّٰہُ فَرَجَہُ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۴، ص ۲۳ تا ۳۰)

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ

"اور جب صبح کو آپ گھر سے باہر نکل کر اعلان فرمارہے تھے مومنوں کے لئے ٹھکانے لڑائی کے اور خدا سننے اور جاننے والا ہے۔" (سورہ آل عمران آیت ۱۲۱)

جنگ احد

وَاِذۡ غَدَوۡتَ : حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ آیت جنگ احد کے متعلق ہے۔ حضرت نے صحابہ سے مشورہ لیا، جناب رسالت مآب صحابہ سے مشورہ لینے کے بعد گھر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر آئے اور فرمایا کسی نبی کے لئے درست نہیں کہ زرہ پہن کر لڑائی کئے بغیر اسے اتار دے۔ پس آپ سات سو مجاہدین کے ہمراہ روانہ ہوئے اور عبداللہ ابن ابی بمع اپنی جماعت کے نہ آیا بعض روایات میں ہے کہ آپ ایک ہزار کی جماعت کے ساتھ نکلے لیکن جب مدینہ اور احد کے درمیان ایک مقام پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی واپس پلٹ گیا اور اس کے ساتھ ایک

تہائی فوج بھی واپس ہو گئی۔ مسلمانوں کے دو گروہ بنو سلمہ قبیلہ خزرج سے اور بنو حارثہ قبیلہ اوس سے جو انصار میں سے تھے انہوں نے بھی عبداللہ بن ابی کی جماعت سے مل کر واپس ہونے کا ارادہ کیا لیکن توفیق خداوندی ان کے شامل حال ہوئی۔ پس وہ ثابت قدم رہ گئے، چنانچہ قرآن مجید کی آیت میں انہی کی طرف اشارہ ہے پس جناب رسالت مآبؐ اپنی فوج کے ساتھ کوہ احد کے دامن میں قیام پذیر ہوئے اور فوجی کیمپ کے لئے ایسی جگہ کو منتخب فرمایا جہاں پیچھے سے پہاڑ اور سامنے کی طرف لڑنے کا میدان تھا۔ پہاڑ میں ایک درہ تھا جہاں سے یہ امکان تھا کہ شاید دشمن اس درہ سے آ کر پیچھے سے حملہ کر دیں۔ وہاں عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ اگر دشمن (خدانخواستہ) غالب آ کر ہم کو مدینہ پہنچا دیں یا ہم غلبہ کی صورت میں دشمن کو مکہ پہنچا دیں۔ ہر دو صورت میں جب تک میرا حکم ثانی نہ پہنچے تم لوگ اس درہ پر ثابت قدم رہنا اور اس کو نہ چھوڑنا۔ اس طرف ابوسفیان نے خالد بن ولید کو دو سو سپاہیوں کے ساتھ کمین گاہ پر مقرر کیا کہ جب دونوں فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں تو تم اس درہ سے گزر کر پیچھے سے حملہ آور ہو جانا۔

حضرت رسالت مآبؐ نے فوج کا علم حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے حوالہ کیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ انصار نے ایک ہی حملہ میں کفار قریش کے دانت کھٹے کر دیئے پس ان میں بھاگڑ پڑ گئی تو ادھر صحابہ نے کفار کے اموال میں لوٹ شروع کر دی۔ خالد بن ولید نے درہ سے آنا چاہا لیکن عبداللہ بن جبیر اور اس کے ہمراہیوں نے اس کو پسپا کر دیا۔ جب عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے دیکھا کہ کفار بھاگ گئے ہیں اور صحابہ لوٹ کھسوٹ میں شروع ہیں تو انہوں نے عبداللہ بن جبیر سے لوٹ میں شرکت کے لئے اجازت چاہی۔ عبداللہ نے جناب رسالت مآب کا فرمان دھرا کر ان کو اس

ارادہ سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے نہ مانی اور ایک ایک دو دو ہو کر وہاں سے کھسکنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ عبداللہ بن جبیر کے پاس صرف بارہ آدمی رہ گئے۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳ پارہ ۴، ص ۳۷)

از مدون: جنگ احد کی فتح کی ہوئی جگہ جب شکست میں بدلنے لگی تو کافر پیچھے سے آئے اور بھاگنے والے کافر واپس مڑے دونوں طرف سے مشرک کافر لڑ رہے تھے اور مسلمان درمیان میں پھنس گئے۔ اس دوران بعض لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

صاحب تفسیر علامہ صاحب: متفق علیہ روایات کے ماتحت جناب رسالت مآبؐ کے پاس سوائے ابو دجانہ انصاری اور حضرت امیر علیہ السلام کے اور کوئی نہ رہا۔ (بزاان)

حضرت علی علیہ السلام کی یہ حالت تھی کہ جب بھی کوئی گروہ جناب رسالت مآبؐ پر حملہ آور ہوتا تھا تو حضرت علی علیہ السلام ان کو اپنی جرأت سے پسپا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تلوار شکستہ ہو گئی پس حضرت رسالت مآبؐ نے ان کو ذوالفقار عنایت فرمائی بعض روایات میں ہے کہ حضرت نے درخت خرما کی خشک شاخ توڑ کر دی جو تلوار آبدار بن گئی اور امام جعفر صادق علیہ السلام جبرائیل آسمان و زمین کے درمیان سنہری کرسی پر بیٹھ کر یہ کہہ رہے تھے:

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی

اور حضرت رسالت مآبؐ سے کہہ رہے تھے کہ حضور! ہمدردی اور وفاداری اسی کا نام ہے جو علی علیہ السلام سے ظاہر ہے۔ آپ نے فرمایا:

اِنَّهٗ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ

"یہ مجھ سے اور میں ان سے ہوں۔"

پس جبرائیلؑ نے جواب دیا کہ میں تم دونوں میں سے ہوں۔ اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام کے جسم مبارک میں باختلاف روایت ستر نوے زخم لگے جو سب کے سب سامنے کی طرف سے تھے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۴۰)

الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

''وہ جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور بدحالی میں اور ضبط کرتے ہیں غصہ کو اور درگزر کرتے ہیں لوگوں سے اور اللہ دوست رکھتا ہے۔ احسان کرنے والوں کو۔''

متقین کے اوصاف

- سخاوت
- غصہ کو ضبط کرنا
- درگزر

غصہ کو ضبط کرنا اور درگزر کرنا اور احسان کرنا

تفسیر برہان میں ارشاد مفید سے منقول ہے: رشتہ داروں میں سے ایک شخص نے حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ گستاخانہ لہجہ میں کلام کیا اور آپ چپکے سے سب کچھ سنتے رہے۔ وہ کہہ سنا کر چلا گیا۔ آپ اپنے ہم نشینوں سے مخاطب ہوئے کہ جو کچھ یہ شخص مجھے کہتا اور کوستا رہا تم نے سن تو لیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ہمراہ اس کے پاس چلو اور میرا جواب بھی سنو۔ انہوں نے عرض کی: حضور ہم تو چاہتے ہیں یہی کہ آپ اس کو کچھ کہیں۔ پس آپ نے نعلین سنبھالی اور روانہ ہوئے اور اسی آیتِ مجیدہ کی تلاوت زبان پر جاری فرمائی:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

روای کہتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے کہ آپ اس کے ساتھ سخت کلامی نہ کریں گے، جب وہاں پہنچے تو اس کو آواز دی اور فرمایا کہ اس کو کہو کہ علی بن حسین علیہ السلام تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے" پس وہ شخص سر جھکائے باہر آیا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ آپ مجھے اپنی باتوں کا بدلہ دینے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فرمایا: بھائی جان! ابھی ابھی جو کچھ تو نے مجھے کہا اگر مجھ میں وہ باتیں ہیں جو تو کہتا تھا تو میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں اور اگر تو نے ناحق الزام عائد کئے تھے تو خدا تجھے معاف کر دے۔ یہ سنتے ہی اس شخص نے حضورؑ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور عرض کرنے لگا حضور میں نے جو کچھ آپ کے حق میں کہا ہے۔ آپ اس سے پاک ہیں اور میں خود ہی ان کلمات کا سزاوار ہوں۔

نیز اسی کتاب میں، مجمع البیان اور تفسیر میزان میں در منشور سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نماز کی تیاری فرما رہے تھے اور کنیز آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہی تھی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھوں سے لوٹا گرا اور آپ کے سر مبارک پر چوٹ آ گئی۔ آپ نے اس کی طرف سر بلند کیا۔ فوراً اس کنیز نے زبان پر جاری کیا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ تو آپ نے جواب میں فرمایا: میں نے غصہ کو ضبط کر لیا، پھر عورت نے پڑھا وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ آپ نے فرمایا: میں نے تیری خطا بھی معاف کی دی۔ پس اس عورت نے تلاوت کیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو آپ نے فرمایا: جا میں نے تجھے خوشنودی خدا کے لئے آزاد کیا ہے۔

تفسیر برہان میں کافی سے مروی ہے اللہ کا جو بندہ اپنے غصہ کو ضبط کرے خدا اس کو دنیا و آخرت میں زیادتی عزت عطا فرماتا ہے۔ مجمع البیان میں جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے کہ جو شخص طاقت ہوتے ہوئے اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کو استعمال نہ کرے تو خدا بروز محشر اس کو اپنی رضا کی دولت سے مالا مال کرے گا اور

فرمایا کہ غصے کو ضبط کرنے والا اللہ کی راہ میں دشمن خدا سے جہاد کرنے والے کے برابر ہے۔ آپ نے فرمایا طاقتور وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور و بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں کر لے۔ عمدۃ البیان میں ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی گھونٹ اللہ کے نزدیک غصہ کے گھونٹ سے محبوب تر نہیں ہے اور جو شخص غصہ کو پی جائے خدا قیامت کے دن اس کے بدلہ میں اس کو حوار لعین عطا فرمائے گا۔

مجمع البیان میں حضرت رسالت مآب سے مروی ہے: جو شخص کسی کے جرم کو معاف کرے خدا اس کی عزت بڑھاتا ہے۔ انسان میں بعض اہل سنت سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اشراف عرب کی ایک جماعت کے ہمراہ دستر خوان پر کھانا تناول فرما رہے تھے کہ ان کا غلام گرم طعام کا ایک پیالہ لایا۔ جب امام کے قریب آیا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ پیالہ طعام سمیت امام حضرت مجتبیٰ کے سر اور منہ پر گر پڑا۔ حضرت نے جب اس کی طرف نگاہ کی تو اس نے اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ پڑھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے غصہ کو ضبط کر لیا ہے۔ اس نے وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے معاف کر دیا۔ پھر اس نے وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اور تیری کفالت بھی اپنے ذمہ میں لے لی ہے۔ اس قسم کی ایک روایت ابھی امام زین العابدین کی نقل ہو چکی ہے نیز امام حسین علیہ السلام کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ خانوادہ عصمت کے جس فرد پر نظر کریں گے، خلق رسالت کا نمونہ نظر آئے گا کیونکہ یہ سب کے سب محمد ہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۵۰ تا ۵۱)

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (آل عمران آیت ۱۴۰)

حضرت امیر علیہ السلام کو تیز تلوار اور نیزہ سے جنگ احد میں ساٹھ سے زیادہ زخم

لگے تھے حتیٰ کہ بعض روایات میں نوے تک بھی تعداد لکھی ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کو لائے۔ پس آپ دست شفا پھرتے جاتے تھے اور زخم مندمل ہوتے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی زخم تھا ہی نہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۵۶)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰى اعْتصابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

"نہیں ہیں (حضرت) محمدؐ مگر رسول بے شک بذریعہ قتل یا موت اس سے پہلے رسول گذر چکے ہیں پس اگر یہ فوت ہو جائیں یا قتل نہ ہو جائیں تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں اور جو بھی پھر گیا ایسے پاؤں پس ہرگز ضرر نہ دے گا اللہ کو کچھ بھی اور عنقریب بدلہ دے گا اللہ شکر گزاروں کو۔"

تفسیر صافی میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب لوگ جنگ احد میں بھاگے تو جناب رسالت مآبؐ نے آواز دی کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہوں، نہ مجھے قتل کیا گیا ہے اور نہ میں مرا ہوں تو فلاں وفلاں نے لوٹ کر دیکھا اور کہنے لگے اب ہم سے تمسخر کر رہا ہے ہمیں شکست ہو چکی ہے۔ صرف حضرت علی علیہ السلام اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ باقی رہ گئے۔ آپ نے ابو دجانہ سے فرمایا کہ جاؤ میں نے تم سے بھی اپنی بیعت اٹھالی ہے البتہ عَلِيٌّ فَهُوَ اَنَا وَاَنَا هُوَ یعنی وہ اور میں ایک چیز ہیں۔ تو ابو دجانہ نے عرض کی: حضور! کیا میری زوجہ یا فرزند مر رہا ہے یا میرا گھر اور مال تباہ ہو رہا ہے؟ میں کیوں جاؤں اور آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ بخدا میں تو

اپنی بیعت کو خیر باد ہرگز نہ کہوں گا۔ پس آپ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی، چنانچہ ایک طرف وہ لڑتا تھا اور دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام جہاد کرتے تھے۔ جب ابو دجانہ زخموں سے چور ہو کر گرا تو حضرت علی علیہ السلام اس کو اٹھا لائے تو اس نے بارگاہ رسالت مآبؐ میں عرض کی: قبلہ! کیا میں نے اپنی بیعت کی وفا کی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں تو نے وفا کی ہے۔ پس تنہا حضرت علی علیہ السلام مصروف جہاد ہوئے، یہاں تک کہ آپ کی تلوار تین مقامات سے ٹوٹ گئی۔ تو حضرت رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر تلوار کے ٹوٹنے کا ذکر کیا۔ آپ نے اب ذوالفقار عطا فرمائی۔ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ نے دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے قدموں سے خون بہہ رہا ہے۔ آپ نے رو کر ان کے حق میں دعا فرمائی۔ پس حضرت علی علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے تو عرض کی حضور! مجھے جہاد کرتے ہوئے ایک آواز سنائی دیتی ہے اور جب میں کسی پر حملہ کرتا ہوں تو میری تلوار لگنے سے قبل وہ گر جاتا ہے اور وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل ملائکہ کی صفوں کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جبرائیل کے وہ کلمات جو پہلے گزر چکے ہیں نقل کئے اور جب کفار واپس مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو جبرئیل نے بحکم خدا ان کا تعاقب کیا (اور یہی رعب تھا جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کفار کے کانوں میں جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پہنچتی تو وہ سمجھتے تھے کہ پیچھے سے اسلام کا لشکر آ رہا ہے پس وہ تیز رفتاری اختیار کر لیتے تھے اور اسی خوف وہراس کے عالم میں وہ داخل مکہ ہوئے۔

ادھر جنگ ختم ہوئی تو جناب رسالت مآبؐ نے مدینہ کا رخ کیا اور علم حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ تھا میں وہ آگے آگے چل رہے تھے جب ایک ٹیلے سے اترے تو لوگوں نے دیکھ لیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے آواز دی۔ اے لوگو! یہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم زندہ موجود ہیں۔ نہ قتل ہوئے اور نہ مرے ہیں۔ انصار کی عورتیں اپنے صحن خانہ اور گھروں کے دروازوں پر دیکھ رہی تھیں۔ پس مرد بھی جمع ہو گئے خوشامدیں کرتے اور توبہ کا اظہار کرتے تھے۔ انصار کی عورتوں نے حضورؐ کی موت کی خبر سن کر بال پریشان کر کے رخساروں اور پیشانیوں پر پیٹ لیا تھا اور گریبان چاک کر ڈالے تھے جب حضورؐ پر ان کی نگاہ پڑی تو خاموش ہو گئیں۔ آپ نے ان کو گھروں میں واپس جانے اور پردہ سنبھالنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ خدا نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ اور یہ آیت اُتری۔

دلیل ماتم

معارج النبوۃ رکن چہارم میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کی خبر مدینہ مشہور کر دی گئی تو جناب خاتون جنت سر پیٹتی ہوئیں اور روتی ہوئیں باہر آئیں اور یتیمی کے آثار ان کی حالت سے ظاہر تھے اور تمام زنان ہاشمیہ گریہ زاری کرتی ہوئیں اور سر پیٹتی اور نوحہ کرتی ہوئی باہر آئیں۔ ان کے رونے پیٹنے کی آواز فلک تک پہنچی۔ جناب بتولؑ معظمہ کا ماتمی جلوس کے ساتھ سر پیٹتے ہوئے اور نوحہ کرتے ہوئے جانا آئندہ کے لئے کھلا ثبوت ہے کہ دین کے تاجدار کے غم میں اس طرح ماتمی جلوس بدعت نہیں ہوا کرتے بلکہ اولادِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔ نیز جناب رسالت مآب کو اگر ناگوار ہوتا تو آپ منع ہی فرما دیتے، پس آپ کا منع نہ کرنا جوازِ عزاداری کی تائید مزید ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۵۹ تا ۶۱)

وَمَنْ یرد ثواب الدنیا نُؤْتِہٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِہٖ فِيْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران آیت ۱۴۵)

جنگِ احد میں حضرت علیؑ کا کردار

وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ: مجمع البیان میں بروایت ابان بن عثمان حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کو احد کے دن ساٹھ زخم لگے۔ حضرت رسالت مآبؐ نے ام سلیم اور ام عطیہ کو زخموں کی مرہم پٹی پر متعین فرمایا انہوں نے آخر خدمت نبویؐ میں عرض کی: حضورؐ جب ہم ایک جگہ کا علاج کرتی ہیں تو دوسرا زخم پھٹ جاتا ہے لہٰذا ہمیں اس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے پس آپ بنفس نفیس خود تشریف لائے اور دوسرے مسلمان بھی عیادت کی غرض سے حاضر ہوئے۔ زخم اس قدر کشادہ اور قریب قریب تھے کہ سب مل کر ایک ہی زخم بنا ہوا تھا۔ پس حضور! اپنے دستِ شفا کو اوپر پھیرنے لگے اور فرماتے جاتے تھے کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں یہ تکالیف و آلام برداشت کئے اس نے اپنا حق ادا کر دیا پس آپ جس زخم پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ زخم بالکل مندمل ہو جاتا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کی زبان پر جاری تھا اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ اِذَا لَمۡ اُوَلِّ الدُّبُرَ شکر ہے خدا کا کہ میں نے فرار نہیں کیا اور میدان کارزار سے کنارہ نہیں کیا، پس خداوند کریم نے قرآن میں دو جگہ حضرت علی علیہ السلام کی شکر گزاری کو سراہا۔ ایک اس سے پہلی آیت چنانچہ فرمایا: وَسَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ اور دوسری یہ آیت کہ فرماتا ہے: وَسَنَجۡزِی اللّٰہِ الشّٰکِرِیۡنَ اور تفسیر میزان میں ہے کہ صیغہ صفت کے ساتھ پورے قرآن مجید میں شاکر کا اطلاق کسی شخص پر نہیں ہوا۔ جس کی خدا نے مدح کی ہو۔ سوائے ان بزرگوار ہستیوں کے جو جنگ احد میں ثابت قدم رہے، اس لئے کہ یہ دونوں آیتیں باتفاق مفسرین جنگِ اُحد کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ بھی ارباب تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جنگ اُحد میں ثابت قدم رہے پس حضرت علی علیہ السلام ہی وہ ذات ہے جس میں شکر کی صفت پختگی و دوام اور ملکہ کی

حیثیت سے ہے۔ جس کو بالفاظ دیگر اخلاص کہا جاتا ہے جیسے کہ بیان ہو چکا ہے۔
(تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۶۲، پارہ ۴)

حضرت علیؑ کا امتیاز

تفسیر برہان میں اختصاصِ مفید سے ستر منقبت والی حدیث میں سے یہ حصہ منقول ہے کہ من جملہ مناقب علی کے جن میں آپ کو اختصاص حاصل ہے۔ ایک یہ ہے کہ آپ میں دھن اور استکانت نہیں تھی۔ چنانچہ جنگ اُحد میں آپ کو اسی (۸۰) ایسے زخم لگے تھے کہ دوائی ایک زخم پر ڈالی جاتی تھے تو وہ دوسرے زخم سے نکل آتی تھی۔ جب جناب رسالت مآبؐ عیادت کے لئے تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام چمڑے کے بستر پر پڑے تھے اور آپ کا جسم خون سے بالکل رنگین تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ کی راہ میں اس قدر تکلیف پہنچے تو سزاوار ہے کہ اللہ بھی اس کے ساتھ وہ کرے جو اس کی ذات کے شایان ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے چشم گریان سے عرض کی: میرے ماں باپ قربان ہوں آپ پر، میں اس بات پر اللہ کی حمد بجالاتا ہوں کہ میں نے آپ سے پشت نہیں پھیری اور فرار نہیں کیا، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں مجھے بتایئے کہ میں درجۂ شہادت سے محروم کیوں ہو گیا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: اس درجہ پر بھی آپ انشاء اللہ فائز ہوں گے۔ پس فرمایا کہ ابوسفیان کو پھر حمراء الاسد پر ہماری انتظار ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام نے نہایت اطمینان اور سکون سے عرض کی: حضورؐ! میرے والدین قربان ہوں۔ خدا کی قسم اگر میں چلنے کے قابل نہ ہوں گا اور دوسرے لوگ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے تو یہ منظور ہے اور آپ کو تنہا بھیج کر گھر میں رہنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ پس خدا نے یہ آیت بھیج دی کامن منی نبی بابت ہمہ آپ نے اپنے زخموں کی تکلیف کی، شکایت تک نہ کی یہاں تک کہ وہ دو عورتیں جو علاج اور

تیمارداری پر مامور تھیں ان سے رہا نہ گیا اور بول اٹھیں کہ حضورؐ ہمیں علی علیہ السلام کے زخم تشویشناک معلوم ہوتے ہیں اور ہمیں ڈر لگتا ہے کیونکہ ایک زخم میں جب ہم کپاس داخل کرتی ہیں تو وہ دوسرے زخم سے نکل آتی ہے۔ پھر بھی حضرت علی علیہ السلام درد کی شکایت منہ پر نہیں لائے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳ ص ۶۳)

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ

"تحقیق وہ لوگ جو بھاگ گئے تم میں سے جس دن فریقین میں لڑائی ہوئی صرف ان کو شیطان ہی نے پھسلایا تھا، بوجہ ان کے بعض کرتوتوں کے اور تحقیق معاف کر دیا اللہ نے ان سے کیونکہ اللہ بخشنے والا صاحب حلم ہے۔"

إِنَّ الَّذِينَ: بھاگنے والوں کے متعلق ہے کہ دنیاوی حرص اور غنیمت کے طمع اور رسول کی بدولت ہی ان پر شیطان نے قبضہ پالیا اور آخرکار میدانِ جہاد کو چھوڑ بھاگے۔

فلک النجات میں تاریخ خمیس (ص ۴۳۱) مطبوعہ مصر سے منقول ہے:

قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ لَمَّا صَرَفَ النَّاسُ يَوْمَ اُحُدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَاءَ۔

"حضرت ابوبکر فرماتے ہیں جب اُحد کے دن لوگ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ بھاگے تو میں سب سے پہلا واپس آنے والا تھا۔"

اور ازالۃ الخفاء ص ۱۶۸ سے منقول ہے:

عَنْ كُلَيْبٍ قَالَ خَطَبَنَا عُمَرُ فَكَانَ يَقْرَءُ عَلَى الْمِنْبَرِ اٰلِ عِمْرَانَ ثُمَّ قَالَ تَفَرَّقْنَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ يَوْمَ اُحُدٍ فَصَعِدْتُ الْجَبَلَ

"کلیب راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر ایک مرتبہ خطبہ میں سورہ آل عمران پڑھ رہے تھے تو فرمایا کہ اُحد کے دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ گئے تھے اور میں پہاڑ پر چڑھ گیا تھا۔"

اور مدارج النبوۃ ص ۱۶۷ سے منقول ہے کہ جب مسلمان رسولؐ کو تنہا چھوڑ کر بھاگے تو حضورؐ کو غصہ آیا حتی کہ پیشانی نورانی سے عرق کے قطرات مروارید کے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ علی علیہ السلام پہلو میں کھڑے ہیں۔ فرمایا: یا علی تو ان لوگوں کے ساتھ نہ بھاگا؟ عرض کی لَا اَکْفُرُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ میں ایمان لانے کے بعد کفر نہیں کر سکتا، گویا اس روایت کی رو سے حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک فرار کرنے والے کافر ہو گئے تھے۔

نیز تفسیر درمنثور سیوطی سے بروایت ابن جریر کلیب سے منقول ہے کہ حضرت عمر نے جمعہ کے خطبہ میں یہی آیت یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ تلاوت فرمائی تو کہنے لگے اُحد کے دن جب ہم بھاگے تھے تو میں پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور میں پہاڑی بکرے کی طرح پہاڑ پر کود رہا تھا لفظ یہ ہیں وَقَدْ رَأَیْتُنِیْ اَنْزُوْ کَاَنِّیْ اَرْوِیَہ اس وقت لوگ کہہ رہے تھے کہ محمدؐ قتل ہو گیا ہے تو میں نے کہا خبردار میرے سامنے کوئی محمدؐ کے قتل کا نام نہ لے ورنہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۷۳ تا ۷۴)

مطبوعہ مصر میں ہے کہ جب لوگ اُحد کے دن بھاگے تو کچھ واپس مدینہ میں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سعد بن عثمان نے مدینہ میں پہنچ کر خبر دی کہ جناب رسالت مآبؐ ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد باقی لوگوں نے پہنچنا شروع کر دیا۔ جب وہ اپنی عورتوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ آئے ہو، حتی کہ وہ ان کے منہ پر خاک ڈالتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم چرخہ لے کر گھر

بیٹھے رہو۔ قفال کہتا ہے جہاں تک اخبار سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ بھاگے جن میں سے بعض مدینہ آ گئے اور بعض ادھر ادھر چلے گئے اور اکثر لوگ پہاڑ کی طرف چلے گئے اور وہاں جمع ہو گئے اور بھاگنے والوں میں سے حضرت عمر بھی تھے۔ لیکن وہ پہلے بھاگنے والے نہیں اور اتنے دور بھی نہیں گئے تھے بلکہ وہیں پہاڑ پر چڑھ گئے تھے اور حضرت عثمان بھی بعض انصار کے ہمراہ بھاگے لیکن یہ بہت دور نکل گئے تھے۔ اور تین روز کے بعد واپس ہوئے تھے۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا: آپ تو بہت دور نکل گئے تھے؟ اختصار کے پیش نظر اصل عبارت عربی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۴، ص ۷۰)

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ

''اور اگر تم قتل ہو جاؤ راہ خدا میں یا مر جاؤ تو البتہ بخشش اللہ کی اور رحمت بہتر ہے اس (مال) سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔'' (آل عمران آیت ۱۵۷)

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تفسیر برہان میں کتب معتبرہ سے بطرق متعددہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جابر نے آپ سے اسی آیت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: کیا تم سبیل اللہ کو جانتے ہو؟ اس نے عرض کی: حضور! جب تک آپ کی زبان سے نہ سن لوں مجھے بذات خود کوئی علم نہیں۔ پس آپ نے فرمایا: علی علیہ السلام اور اس کی ذریت سبیل اللہ اور جو شخص علی علیہ السلام کی ولایت میں قتل کیا جائے اس کی موت فی سبیل اللہ واقع ہوتی ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۴، ص ۷۳)

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ کَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ○ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ○

"کیا جو شخص پیچھے چلے رضائے خدا کے مثل اس کے ہے جو پلٹتا ہو ساتھ
ناراضگی خدا کے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو اور وہ بری بازگشت ہے یہ
(لوگ مختلف) درجے رکھتے ہیں اللہ کے نزدیک اور اللہ آگاہ ہے اس
چیز سے جو وہ کرتے ہیں۔"

اَنسٌ وَّلَا جَانٌّ: (اس دن کسی جن وانسان سے اس کا گناہ پوچھا نہ جائے گا) علامتوں سے ہی معلوم ہو جائے گا اور ظلم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اپنی نیکیوں سے بدلہ کم نہ ملے گا، بلکہ ہر نیکی کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کو اپنی برائیوں سے سزا زیادہ نہیں نہ ملے گی۔ پس بعض نیکیوں کی جزا کو دگنا یا دس گنا کرنا یا بعض برائیوں کی سزا کا معاف کرنا منافی عدل نہ ہوگا بلکہ عین اس کا فضل وکرم ہوگا۔ حدیث نبوی میں ہے کہ جو شخص تادم مرگ تین چیزوں سے پاک رہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ وہ تین یہ ہیں:

◇ تکبر ◇ خیانت ◇ قرضہ (تفسیر رازی)

اَفَمَنِ اتَّبَعَ: تفسیر برہان میں کافی سے مروی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے عمارؓ سے فرمایا کہ اس سے مراد آئمہ ہیں اور مومنین کے لئے درجات ہیں۔ یعنی ہماری ولایت کی بدولت ان کے اعمال میں زیادتی اور درجات میں بلندی ہوتی ہے اور کَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے علی بن ابی طالب علیہ السلام اور باقی آئمہ طاہرین علیہم السلام کے حق کا انکار کیا جس کی وجہ سے وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔

اَقُوْلُ: آیت مجیدہ کے الفاظ میں عموم ہے اور معصوم نے تاویل کے طور پر اس کے بعض افراد کی ایک واضح نشانی بیان فرمادی ہے۔

هُمْ دَرَجٰتٌ: امام جعفر صادق علیہ السلام کی تفسیر کے ماتحت ھُمْ کا مرجع مَنِ

اتَّبَعَ ہے اور عموی معنی کے اعتبار سے ضمیر کے مرجع میں بھی تعمیم ہوگی اور درجات سے مراد تھا جان درجات ہیں یعنی اس کا مضاف ذو محذوف ہے پس اس کے معنی میں (دو) قول ہیں۔

① اللہ کے برگزیدہ لوگ اور اللہ کے مبغوض لوگ مختلف درجات رکھتے ہیں یعنی قسم اول کے لئے جنت اور اس کی نعمتیں ہوں گی اور قسم ثانی کے لئے عذاب جہنم اور ذلت ہوگی۔

② جنتیوں اور دوزخیوں میں سے ہر ایک کے مراتب الگ ہوں گے، کیونکہ جنت کے طبقات جدا جدا ہیں چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اہل جنت اعلیٰ علیین کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح زمین والے آسمانی ستاروں کو دیکھتے ہیں۔
(مجمع تفسیر انوار النجف جلد۳، پارہ۴، ص۷۷)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

"اور نہ خیال کرو جو لوگ قتل کیے گئے راہ خدا میں مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق کھاتے ہیں۔" (آل عمران آیت ۱۶۹)

ثوابِ شہداء

تفسیر مجمع البیان میں امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک روز حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے خطبہ میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے رہے تھے کہ ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر جہاد کا ثواب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: غزوہ ذات سلاسل سے واپسی پر میں جب جناب رسالت مآبؐ کے پیچھے ناقہ غضباء پر سوار تھا اور میں نے آپ سے یہی سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا جب مجاہد تیاری کرتا ہے تو خدا جہنم

سے اس کی آزادی فرض کر دیتا ہے اور ملائکہ پر مباہات فرماتا ہے۔ جب وہ اپنی عیال سے وداع کرتا ہے تو گھر اور اس کی دیواریں اس کے لئے گریہ کرتی ہیں اور وہ اپنے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے خدا چالیس فرشتوں کو موکل کرتا ہے۔ اس کی ہر نیکی دگنی شمار ہوتی ہے۔ اس کی ہر دن کی عبادت ایسے ایک ہزار عابد کی عبادت کے برابر ہوتی ہے جنہوں نے ہزار ہزار سال عبادت میں گزارے ہوں۔ جن کا ایک دن پوری دنیا کی زندگی کے برابر ہو۔ جب وہ دشمنوں کے مقابل ہوتے ہیں تو ان کے ثواب کو کوئی جان ہی نہیں سکتا اور مصروف جہاد ہوں تو ملائکہ ان کے لئے دست بدعا رہتے ہیں اور ایک منادی ندا کرتا ہے کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے پس نیزہ و تلوار کا زخم ان کو موسم گرما کے ٹھنڈے پانی سے بھی محبوب تر ہوتا ہے اور جب پشت زین سے زمین پر آئیں تو ان کا سر حور عین کے دامن میں ہوتا ہے جوان کو جنت کے انعامات کی بشارت سناتی ہیں۔ زمین ان کو مرحبا کہتی ہے اور نعمات خداوندی کا ثمرہ سناتی ہے اور آواز قدرت آتی ہے کہ اس کے پس ماندوں کا میں کفیل ہوں جو ان کو راضی کرے گا اس نے مجھے راضی کیا جو ان کو ناراض کرے گا اس نے مجھے ناراض کیا۔ ان کے ارواح سیر جنت کرتے ہیں اور میوہ ہائے جنت کھاتے ہیں۔ ہر شہید کو فردوس بریں میں سے ستر محل عطا ہوتے ہیں۔ جن کی وسعت یمن و شام کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہوتی ہے اور ان کا نور مشرق و مغرب پر حاوی ہوتا ہے۔ ہر محل کے ستر دروازے کہ ہر ایک میں ستر تختے سنہری ہوتے ہیں اور ہر دروازے پر ساٹھ ساٹھ پردے ہوتے ہیں۔ نیز ہر محل میں ستر خیمے اور ہر خیمہ میں ستر تخت سونے کے جن کے پائے موتی و زبرجد کے ہوتے ہیں اور ہر تخت پر چالیس فرش کہ ہر ایک کی موٹائی چالیس ہاتھ ہوتی ہے اور ہر فرش پر ایک حور عین جلوہ گر ہوتی ہے جس کے ستر ہزار خادم

اور ستر ہزار کنیزیں ہوتی ہیں۔ جن کے چہرے نورانی اور زیور طلائی ہوتے ہیں، اور سر پر موتیوں کے تاج ہوتے ہیں ہر ایک کے ہاتھ میں ابریق و جام ہوتا ہے۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ان کے راستہ میں بروز محشر نبی آئیں گے تو ان کی شان و عظمت دیکھ کر وہ بھی پیادہ ہو جائیں گے۔ پس جب اپنے مسکن پر پہنچیں گے تو ان میں سے ہر ایک اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں میں سے ستر ستر ہزار کی شفاعت کر سکیں گے۔ پس وہ دستر خوان کرامت پر میرے اور ابراہیم علیہ السلام کے ساتھی ہوں گے۔ اسی طرح شہداء کے ثواب کے متعلق بہت کچھ احادیث وارد ہیں اور اس قسم کی احادیث کی تہ تک پہنچنا ہمارے ناقص عقول کے لئے مشکل ہے ہاں خلاصہ کے طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ جن لوگوں نے دین حق کی نصرت میں اپنی جان تک قربان کر دی وہ اللہ کے نزدیک ایسے انعامات و اکرامات کی سزاوار ہیں جن کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ جب عام شہدوں کی یہ شان ہے تو جو تمام شہیدوں کا سردار ہو گا اس کے مرتبہ کی عظمت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ بے شک ان کے لئے جوانان جنت کی سرداری زیبا ہے۔

الحسن والحسین سید اشباب اهل الجنة۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۸۳)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

"اور یہ بھی نہیں کہ اللہ تمہیں مطلع کرے غیب پر البتہ اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے

رسولوں پر۔'' (آل عمران آیت ۱۷۱)

مسئلہ علم غیب

وَمَا كَانَ اللّٰهُ: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مومن ومنافق کی تمیز کے لئے خدا مومنوں کو لوگوں کے دلی حالات کا علم کیوں نہیں دے دیتا تاکہ وہ اس علم کے ذریعہ سے کھوٹے کی خود پہچان کر لیتے اور جنگ وجدال کی جان لیوا مصیبتوں سے ان کی گلوخلاصی ہو جاتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امتحان وآزمائش سے جس طرح مومن ومنافق کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح صبر وثبات سے مومنوں کے درجات میں اضافہ ہوتا ہے اور ثانیاً مصلحت خداوندی یہ ہے کہ انجام کا علم اس نے لوگوں سے پوشیدہ کر رکھا ہے اور نظام عالم کی بہتری اسی میں ہے چنانچہ اس آیت مجیدہ میں ارشاد ہے کہ خدا ایسا نہیں کرتا کہ تمہیں علم غیب عطا کر دے۔ وہ صرف اسی کی اپنی ذات کے شایانِ شان ہے البتہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس کو غیب کی باتوں سے مطلع فرماتا ہے اور اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ رسول اپنی امت کو علوم غیبیہ کی اطلاع دیتے رہیں بلکہ امت پر فرض ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات پر ایمان لائیں اور ان کے ہر فرمان کو دل میں جگہ دے کر اطاعت شعاری کی کوشش کریں۔ پس امت کو خدا اور رسولؐ کے کسی فیصلہ پر بھی کیوں کہنے کی اجازت نہیں، کیونکہ ہر حکم کی مصلحت بتانا ان کے عہدہ میں نہیں ہے۔

مطلب کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ طبقات موجودات میں سے حیوان کو نبات وجماد پر فوقیت ہے، کیونکہ اس میں ایک حس موجود ہے جس سے وہ تہی دامن ہیں اور انسان کو عام حیوان سے برتری حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسا جوہر موجود ہے جس سے وہ خالی ہے۔ پس روح نباتی سے وہ شعور غائب ہے جس کو روح حیوان کے

اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اگر روح نبات کے مقابلہ میں شعور حیوانی کو پھیلایا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ نبات کے مقابلہ میں حیوان کے پاس علم غیب کا ایک بے پناہ ذخیرہ موجود ہے، جسے روح نباتی اپنے تصور میں بھی نہیں لاسکتا۔ اسی طرح روح حیوانی سے ایک شعور غائب ہے۔ جس کو روح انسانی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور اگر روح حیوانی کے سامنے شعور انسانی کو بسط دیا جائے اور علوم وفنون میں اس کی دسترس ومہارت اور عقلی دنیا میں اس کی عظیم الشان فتوحات اور تسخیر موجودات کے لئے اس کے مناسب موزوں اور برمحل اقدامات اور بظاہر ناشدنی امور پر اس کا ہمہ گیر تسلط وغیرہ کو سامنے لایا جائے تو ظاہر ہے کہ روح حیوانی کے مقابلہ میں انسان کلی طور پر علم غیب کا مالک نظر آتا ہے اور اس کی ان غیبی فتوحات کا روح حیوانی تصور تک نہیں کرسکتا۔

اب آگے بڑھئیے انبیاء میں روح القدس اور شعور قدسی کا جو جوہر موجود ہے اس سے یقیناً عام انسان کوتاہ دست ہے۔ منازل ارتقاء کی ترتیب سے روح نبات، روح حیوان اور روح انسان میں ان کے مختص شعور کے لحاظ سے فرق کی جو پوزیشن ہے اسی لحاظ سے شعور انسانی اور شعور قدسی نبوتی میں فرق کا اندازہ لگائیے پس ماننا پڑے گا کہ ان کا شعور اپنے مقام پر اگر پھیلے تو انسان کے مقابلہ میں ان کی علمی وسعتوں کا کیا مقام ہوگا؟ انسان یہی سمجھے گا کہ ان کے پاس علوم غیبیہ کے ذخائر موجود ہیں جو میرے تصور سے بالاتر ہیں۔

انبیاء میں بھی اپنے مقام پر فرق موجود ہے۔ کوئی نبی ایک قوم کے لئے، کوئی قبیلہ کے لئے، بعض صرف کنبہ والوں کے لئے، بعض تھوڑے عرصہ کے لئے اور بعض زیادہ مدت کے لئے بہرکیف ہر ایک کی پوزیشن الگ الگ ہے۔ بعض صرف نبی ہیں اور بعض نبی بھی ہیں اور رسول بھی ان میں سے تھوڑے اولوالعزم ہیں اور زیادہ غیر

اولوالعزم۔ پس جس نبی کا دائرہ نبوت جس حد تک ہے وہ نبی اس حد تک اپنی تمام امت کے افراد کے مقابلہ میں شعور کلی کا حاصل ہوتا ہے اور امت کے افراد کا شعور مجموعی اس نبی کے شعور قدسی کے مقابلہ میں ہیچ ہوتا ہے حضرت رسالت مآبؐ چونکہ عالمی رسولؐ ہیں لہٰذا ان کا روح قدسی نبوتی اپنے قدسی شعور کے لحاظ سے عالمین پر حاوی ہونا چاہیے اور تمام موجودات خواہ انسان ہوں یا جن و ملک اول خلقت سے لے کر آخر خلقت تک ان کے انفرادی و اجتماعی شعور کے مقابلہ میں ان کا شعور قدسی اور ان کے علوم و معارف محیط حیثیت کے حامل ہوں گے اور ان کے پھیلاؤ کی حدود امکانی کمالات کے آخری نقطہ تک ہوں گی۔ جن کا تصور تک عام انسانی عقول نہیں کر سکتے پس ان کی علمی وسعتوں کا احاطہ سوائے ذات واجب الوجود کے اور کسی کے بس کا روگ نہیں، لہٰذا عام انسانی شعور کے مقابلہ میں چونکہ ان کا قدسی نبوتی شعور ہمہ گیر ہے جس کی بناء پر عام انسان اسے علوم غیبیہ کا عالم کہہ سکتا ہے، جس طرح عام حیوان کے مقابلہ میں انسان عالم الغیب اور روح نباتاتی کے مقابلہ میں عام حیوان ادراکات غیبیہ کے حامل ہیں۔

ماتحت کے لئے جو مسائل لاینحل ہوا کرتے ہیں وہ مافوق کے لئے اپنے ذاتی جوہر کے لحاظ سے درجۂ اہمیت سے ساقط ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اس کے وجود کے لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً نبات کے لئے شعور حیوانی کے ادراکات اگرچہ ایک عقدہ لاینحل ہیں لیکن وہ روح حیوانی کے لئے جزو زندگی کے حیثیت سے ہیں جس کی اہمیت ان کے درجہ اعتبار سے ساقط ہے چہ جائیکہ ان کا مافوق ان کی اہمیت سے انکار کرے اور اسی طرح روح حیوانی کے لئے وہ غیر ممکن افکار و مسائل جن پر انسان حاوی ہے وہ حیوانی شعور سے بالاتر ہیں لیکن وہ عقول انسانیہ کی ذاتی استعداد کے نتائج ہیں جو نہ ان کے لئے چنداں اہم اور نہ معرض تعجب ہیں البتہ جن نئی ایجادات پر انسان محو حیرت ہو کر

انگشت بدنداں نظر آتا ہے وہ صرف اس لئے کہ عقول انسانیہ نے اس طرف اس سے پہلے اقدام نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کل کی ایجاد آج باعث تعجب نہیں کیونکہ ذہن اس سے مانوس ہو چکا ہے اور اسے اپنے احاطہ قدرت میں داخل سمجھ چکا ہے حالانکہ کل وہ بھی تعجب کا باعث تھی پرسوں کے مقابلہ میں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ہر آئندہ کی ایجاد گزشتہ کمالات کو عادی کرتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور انسان اسے شعور انسانی کا عام کرشمہ سمجھتا جا رہا ہے اب جہاں یہ انسانی کمال آخری حد کو پہنچے گا وہاں سے نبوتی کمال کی حدود شروع ہوں گی۔ پس جس مسئلہ کو انسان لاینحل کہے گا اور عام عقول سے اس کی فتح ناممکن ہوگی وہ روح نبوتی کے شعور قدسی کے لئے اپنی خداداد استعداد کے ماتحت اس کا عام فعل ہوگا جسے انسان غیب سے تعبیر کرے گا لیکن ذات اقدس الٰہیہ جو ہر شے پر محیط ہے اس کے سامنے روح نبوتی اور اس کے شعور قدسی کی تمام وسعتیں اسی طرح ہیچ ہیں جس طرح نبی کے لئے عام انسانی کمال اور انسان کے لئے عام حیوانی کمال۔ بلکہ مخلوق اور خالق کے درمیان کوئی نسبت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔

اب آسانی سے سمجھ میں آسکے گا کہ خدا کسی کو غیب پر مطلع نہیں فرماتا، مگر جس کو منتخب کرے اپنے رسولوں میں سے۔ یعنی ان کو ان غیبی چیزوں پر اطلاع دیتا ہے جو عام انسانوں کے افہام سے بالاتر ہوں اور وہ غیوب ہیں جو روح نبوتی کے حدود کے اندر ہیں اور شعور انسانی کی حدود سے باہر اور جس مقام پر فرمایا! کہ سوائے میرے اور کوئی غیب نہیں جانتا، بلکہ علم غیب صرف میرا ہی خاصہ ہے۔ اس سے مراد وہ غیوب ہیں جو شعور نبوتی کی حدود سے بالاتر اور ذات اقدس الٰہیہ کی شایان شان ہیں اور وہ ہر شے پر محیط ہے اور اس کی وسعتیں غیر محدود ہیں۔ اس کا احاطہ نہ انسان کر سکتا ہے نہ جن و ملک اور نہ نبی و مرسل بلکہ کسی سے اس کے تصور کا بھی امکان نہیں۔ پس انسان اپنی نار

سا عقل کے فیصلہ سے کہہ بیٹھتا ہے کہ نبی کلی غیب کا علم رکھتا ہے ورنہ علوم الہیہ کے مقابلہ میں ان کے علوم ایک جزوی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے علوم کو اس ذات واجب الوجود کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی۔

دور حاضر میں حضرت رسالت مآبؐ کے علم کلی و جزوی کا مسئلہ عام ہے جس کو حقیقت ناشناس لوگوں نے اچھال رکھا ہے اور اپنے تئیں عالم کہلانے والوں نے اسی میں اپنا علمی کمال سمجھا ہے تا کہ عوام سے داد و تحسین حاصل کر کے اپنے اقتدار نا پائیدار کو فروغ دیں حالانکہ ایسے لوگ علوم حقیقیہ اور معارف ربانیہ سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور بڑی دریدہ دہنی سے عام جاہل طبقہ کو جن کا جہل جہل بسیط ہوتا ہے عوام کالانعام سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے جہل مرکب کو کلاہ و دستار یا جبہ وقبا کے نیچے مخفی کر کے عالم بلکہ علامہ کہلواتے پھرتے ہیں حالانکہ کالانعام کی لفظ جس طرح ان کو زیب دیتی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

میں نے اس مسئلہ کو اپنی حد تک آسان کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ نبی کے علوم ہماری نارسا عقول کے مقابلہ میں کلی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام انسان عقول نہ ان کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی حدود کا تصور کر سکتے ہیں لیکن خداوند کریم کے محیط علم کے مقابلہ میں ان کی حیثیت بالکل جزوی ہے۔ اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے ان کو کس قدر دیا اور کیونکر دیا اور اس کا فیصلہ ہماری عقول سے بالاتر ہے۔ ہمارا کام ہے ان پر ایمان لانا تسلیم کرنا اور اطاعت کرنا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۴، ص ۸۷)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ

الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ
وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ
اَشْرَکُوْا اَذًی کَثِیْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ

''ہر نفس چکھنے والا ہے ذائقہ موت کا اور تحقیق تمہیں پورا اجر دیا جائے گا بروز قیامت پس جو بچایا گیا نار سے اور داخل کیا گیا جنت میں پس وہ کامیاب ہوا اور نہیں زندگانی دنیا مگر سامان دھوکے کا البتہ تم ضرور آزمائے جاؤ گے اپنے والوں اور اپنے نفسوں میں اور ضرور سنو گے ان سے جنہیں کتاب دی گئی تم سے پہلے اور ان سے جو مشرک ہیں اذیت بہت اور اگر صبر وتقویٰ اختیار کرو گے۔''

کے زمانہ کے یہودیوں کو انبیاء ماسلف کے قتل کا مجرم قرار دیا گیا ہے حالانکہ قتل کرنے والوں اور ان کے درمیان پانچ سو سال کی مدت کا فاصلہ تھا یہ چونکہ ان کے فعل پر راضی تھے، لہٰذا خدا نے ان کو بھی انبیاء کا قاتل فرمایا۔

فَمَنْ زُحْزِحَ: تفسیر برہان بروایت تفسیر قمی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قیامت کے دن جناب رسالت مآبؐ کو گلابی حلہ پہنایا جائے گا اور آپ عرش کی دائیں جانب قیام فرمائیں گے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کو سفید حلہ پہنایا جائے گا اور وہ عرش کے بائیں جانب کھڑے کئے جائیں گے پھر حضرت علی علیہ السلام کو گلابی حلہ پہنا کر جناب رسالت مآبؐ کے دائیں طرف جگہ دی جائے گی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو سفید حلہ پہنا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بائیں جانب کھڑے کیا جائے گا پھر حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو گلابی حلہ میں حضرت علی علیہ السلام کے دائیں طرف جگہ ملے گی۔ اس کے بعد حضرت حسین علیہ السلام اور ان کے بعد یکے بعد

دیگرے آئمہ طاہرین علیہم السلام کو گلابی حلہ ہائے بہشت پہنائے جائیں گے۔ وہ سب بالترتیب ایک دوسرے کے دائیں جانب قیام فرما ہوں گے اور ان کے سامنے ان کے شیعوں کو کھڑا کیا جائے گا پھر جناب فاطمہؑ اور اس کی ذریت اور شیعہ عورتیں آئیں گی پس یہ سب داخل جنت ہوں گے بلا حساب بطنان عرش سے جناب رب العزت کی طرف سے ندا آئے گی اے محمدؐ تیرا بہترین باپ ہے ابراہیم علیہ السلام اور بہترین بھائی ہے علی بن ابی طالبؑ اور بہترین سبط ہیں حسن و حسین علیہما السلام اور بہترین جنین ہے محسنؑ اور بہترین آئمہ ہیں تیری ذریت اور ان کا نام لیا جائے گا۔ اور بہترین شیعہ ہیں تیرے شیعہ آگاہ رہو یہی ہیں کامیاب ہونے والے اور اس آیت کا یہی مطلب۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۹۲)

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ

(آل عمران آیت ۱۹۳)

"اے رب ہمارا تحقیق ہم نے سنا ایک بلانے والا جو بلاتا ہے ایمان کی طرف لاؤ اپنے رب پر پس ہم ایمان لائے اے رب پس بخش دے ہمارے گناہ اور دور کر ہم سے ہماری برائیاں اور ہمیں لے لے ساتھ نیکوں کے۔"

رَبَّنَا إِنَّنَا: امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ منادی سننے والے حضرت علی علیہ السلام تھے۔ (البرہان)

ان آیات کے نزول کے متعلق مروی ہے کہ جب حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے بعد آپ کو ہجرت کا حکم ہوا تو آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بستر پر سلایا اور

فرمایا کہ پردہ داروں کو لے آنا۔ صبح کو جب قریش ناکام واپس گئے تو حضرت علی علیہ السلام پردہ داروں کو لے کر روانہ ہوئے۔ جب ابوسفیان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے ایک حبشی غلام کو عقب میں روانہ کیا تاکہ حضرت علی علیہ السلام کو مستورات کے ہمراہ لے جانے سے روک لے چنانچہ جب یہ حبشی غلام پہنچا تو آپ نے اس کو ہٹ جانے کو کہا لیکن باز نہ آیا۔ پس آپ نے ایک جنبش یداللّٰہی سے اسے واصل جہنم کردیا، اس کے بعد ابوسفیان خود آیا اور اس نے اپنے غلام کو مقتول پایا پھر حضرت حضرت علی علیہ السلام کو مستورات کو لے جانے سے روکا حضرت علی علیہ السلام اور ان کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی۔ آخرکار ابوسفیان ناکام واپس چلا گیا اور حضرت علی علیہ السلام اور ان کے ہمرائیوں نے چونکہ جنگ وجدل کی وجہ سے تھک چکے تھے لہٰذا ایک مقام پر قیام کیا اور تمام رات اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ کوئی کھڑے ہوکر کوئی بیٹھ کر اور کوئی پہلو کے بل لیٹ کر حمد وشکر خداوندی بجالاتے رہے آخر حضرت علیؑ کے ہمراہ عورتوں میں سے جناب فاطمۃ الزہراؑ، فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر بعد میں ام سلمہ بھی پہنچ گئی تھیں سب حریت سے داخل مدینہ ہوئے اور ان کے پہنچنے پر جبرائیل یہ آیات لے کر نازل ہوا اور حضورؐ نے پڑھ کر سنائیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۹۹)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران آیت ۲۰۰)

"اے ایمان والو! صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور ثابت قدم رہو اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔"

ایک دوسری روایت میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ مصائب میں صبر کرو، اور زمان تقیہ میں ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور جن کی اقتداء کرتے ہو

ان کے لئے ثابت قدم رہو۔

مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابن عباس نے اس آیتِ مجیدہ کی تفسیر طلب کرنے کی لئے ایک شخص کو امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب سائل نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے باپ اور ہمارے حق میں نازل ہوئی ہے اور وہ رباط جس کا آیت مجیدہ میں حکم ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ہاں ہماری نسل سے مرابط کرنے والے ہوں گے واپس جا کر ابن عباس کو کہنا کہ تیری نسل سے ایک ذریت نکلے گی جو آتش جہنم کے لئے پیدا ہوگی۔ وہ اللہ کے دین سے لوگوں کی جماعت کو خارج کریں گے اور آل محمدؐ کے بچوں کے خون سے زمین کو رنگین کریں گے اور ایمان والوں سے لڑیں گے۔

رَابِطُوْا: رباط کا اصل مفہوم تو ہے کہ اسلامی سرحدوں پر حفاظت کے لئے مجاہد بن کر ڈٹے رہنا اور ان سرحدوں پر ثابت رہنے والوں کو مرابط کہا جاتا ہے لیکن تفسیرِ معصومین علیہم السلام میں اس جگہ رابطوا کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے امام وقت کی نصرت کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھو اور ان کی تمام احکام میں اطاعت کرو اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ چنانچہ چند احادیث بیان کی جا چکی ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فرامین ہیں جو خانوادہ عصمت سے اس بارہ میں وارد ہوئے ہیں۔

امام علی زین العابدین علیہ السلام نے تاویل کے طور پر ایک فرد بیان فرما دیا جو اس آیت کا اپنے زمانہ میں مصداق حقیقی تھا، ورنہ یہ آیت بلکہ قرآنِ مجید کی تمام آیتیں قیامت تک کے لئے ہیں اور قیامت تک ان کے مصداق آتے رہیں گے جیسا کہ ہم نے مقدمہ تفسیر میں اس کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔

مجمع البیان میں مرابط سے مراد بعض اقوال کی رو سے نمازوں کی یکے بعد

دیگرے انتظار اور اُن کی پابندی لی گئی ہے، چنانچہ جناب رسالت مآبؐ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ سے افضل اعمال کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وضو کا مل کرنا۔ نماز جماعت کی طرف قدم بڑھانا اور نمازوں کی یکے بعد دیگرے انتظار کرنا اور یہی مرابطہ ہے۔

آج بحمد اللہ بروز اتوار ساڑھے تین بجے بعد دوپہر ۱۷ جمادی الثانیہ ۸۱ھ مطابق ۲۶ نومبر سورہ آل عمران کی تفسیر سے فارغ ہوا اور خداوند کریم سے دست بدعا ہوں کہ بحق محمد وآل محمد وآلہ الطاہرین مجھے پورے قرآن کی تفسیر پر موفق فرمائے اور اس سلسلہ میں حائل شدہ جمیع جانی و مالی رکاوٹوں کو دور کرے اور وہ دعاؤں کو قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اس کے بعد سورہ نساء کی تفسیر شروع ہوگی۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْنُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

(اختتام اقتباسات سورہ العمران تفسیر انوار النجف جلد ۴، ص ۱۰۲)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

''وصیت کرتا ہے تو خدا تمہاری اولاد کے بارے میں کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔'' (النساء آیت ۱۱)

لطیفہ

بعض کتب مناقب میں ہے کہ ایک دفعہ دو عورتوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ایک کی لڑکی اور دوسری کا لڑکا تھا لیکن ان میں سے ہر ایک لڑکے کی دعویدار تھی۔ زمانہ تھا دوسری خلافت کا جب فیصلہ نہ ہو سکا تو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت

بابرکت میں یہ مقدمہ پیش کیا گیا۔ آپ نے ایک حجم کی دو شیشیاں منگوالیں اور حکم دیا کہ ایک ایک شیشی ان عورتوں کو دی جائے تاکہ اپنے اپنے دودھ سے اسے پر کریں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا پس آپ نے دونوں کو وزن کرنے کا حکم دیا تو ایک کا وزن کم اور دوسری کا زیادہ نکلا۔ پس آپ نے حکم دیا کہ لڑکا اس عورت کا ہے جس کا دودھ وزنی ہے اور لڑکی دوسری کی ہے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی صحابہ ششدر ہو گئے اور آپ سے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا میں نے یہ فیصلہ قرآنِ مجید سے کیا ہے چنانچہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ جس خدا نے وراثت میں مرد کو عورت سے حق زیادہ کرامت فرمایا ہے۔ اس نے خوراک میں بھی مرد و عورت کے حصہ میں فرق مقرر کیا ہے۔ پس صحابہ آپ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے واپس چلے گئے اور دونوں عورتیں اپنے اپنے بچے لے کر رخصت ہو گئیں، لیکن قرآنِ مجید کی ان باریکیوں کو راسخین فی العلم کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا جبھی تو جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا: عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ اور تمام امت کو ان دونوں سے تمسک پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۱۲۳)

خاتونِ جنت کے مقدمہ وراثت کے متعلق فخر الدین رازی کا فیصلہ

تفسیر کبیر جلد ۳، ص ۱۵۶ مطبوعہ مصر میں فرماتے ہیں: آیت يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ کی تفسیر میں کہ یہ آیت عام نہیں رہی بلکہ خاص ہے اس حکم سے کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت نہیں ہوا کرتی اور شیعہ اس تخصیص کے خلاف ہیں۔ مروی ہے کہ جناب فاطمہ علیہا السلام نے جب وراثت کا دعویٰ دائر کیا تھا تو جواب میں انہوں نے مقابلہ کی یہ حدیث پڑھی تھی:

نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوَرِّثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ

''یعنی ہم گروہ انبیاء کا وارث کوئی نہیں ہوتا بلکہ ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔''

بی بی نے ان کی رد اور اپنے دعوئی کے اثبات میں یہ آیت مجیدہ تلاوت فرمائی:

لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ اور اس آیت کے عموم کو انہوں نے اپنے دعوئی کی دلیل قرار دیا تھا اور گویا بی بی یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ عموم قرآن کو خبر واحد سے تخصیص نہیں دی جاسکتی اور شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ بالفرض اگر عموم قرآن کو خبر واحد سے تخصیص دینا جائز ہو بھی تاہم اس جگہ نہیں ہوسکتی جس کی کئی وجوہات ہیں۔

① خداوند کریم نے ذکریا علیہ السلام کے قول کو نقل فرمایا ہے:

یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ

یعنی اپنے لئے فرزند کی دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا اور آل یعقوب کا وارث ہوگا۔ نیز فرماتا ہے: وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا، اور ان آیتوں میں علم اور دین کی وراثت یقیناً مراد نہیں، کیونکہ علم اور دین وراثت میں کسی کو منتقل نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ کسی چیز اور وراثت میں منتقل ہونے والی چیز مال ہی ہے پس معلوم ہوا کہ وہ پیش کردہ حدیث غلط ہے، کیونکہ خلاف قرآن ہے۔

② وراثت نبوی کا تعلق حضرت عباس جو آپ کے چچا تھے اور حضرت علی جو چچا زاد اور داماد تھے اور حضرت فاطمہؓ جو دختر تھی ان سے تھا اور یہ لوگ عالم بھی تھے اور زاہد بھی تو اگر آپ نے یہ فرمانا تھا تو ان لوگوں کو فرماتے جن کو اس چیز سے واسطہ تھا۔ ایک ایسے شخص کو فرمانا جو درمیان میں کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو ایک بے معنی سی بات ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت رسالت مآب کی وراثت سے ناقل حدیث کو کوئی تعلق و واسطہ نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث اعتبار سے ساقط ہے۔

⑦ اگر بالفرض حدیث کو درست تسلیم کیا بھی جائے تو ممکن ہے مَا تَرَکْنَا لَانُوْرَثُ کا مفعول ہو یعنی ہم گروہ انبیاء جس چیز کو بطور صدقہ چھوڑ جائیں اس کا کوئی وارث نہیں ہو سکتا، لہٰذا سارے مال کی وراثت کی نفی نہ ہوگی۔

اس تمام مطلب کو ذکر کرنے کے بعد جواب میں صرف ایک جملہ پیش فرماتے ہیں کہ اس مناظرہ کے بعد جناب فاطمہؑ ابوبکر پر راضی ہوگئی تھیں اور اجماع قائم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ابوبکر نے کیا تھا وہ درست تھا۔ لہٰذا یہ اعتراضات ساقط ہیں۔

انصاف کا خون دیکھئے۔ روایت تسلیم ہے اور بی بی پاک کا احتجاج بھی تسلیم ہے نیز بی بی پاک کے استدلال پر بھی نکتہ چینی نہیں اس کے بعد نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ والی فرضی حدیث پر شیعوں کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات بھی تسلیم ہیں لیکن کس قدر جرأت و جسارت سے کہہ دیا کہ بی بی راضی ہوگئی میں پوچھتا ہوں کہ بی بی اس کے غلط فیصلہ پر کیسے راضی ہوگئی جب کہ اس کی مرضی حدیث کو غلط ثابت کرنے کے لئے آپ آیت قرآنی پیش فرما چکی تھیں جس کے جواب سے وہ عاجز تھے۔ اس کے بعد رضا کا محل کونسا باقی رہتا ہے جب کہ آپ کا لقب صدیقہ مسلم بین الفریقین ہے۔ کیا حضرت ابوبکر نے بی بی کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر کے معافی طلب کی تھی اور حقوق الناس میں معافی مانگنے کی صورت یہ ہے کہ گزشتہ اپنے فعل سے معذرت اور اپنے پاس باقی ماندہ حقوق مالیہ کی واپس ادائیگی۔ کیا بی بی کو حق وراثت دے کر سابق غلطی سے معذرت طلب کی گئی تھی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو بی بی کی رضامندی کیسے؟ یعنی رضامندی کی دو صورتیں ہیں یا اس کے فیصلہ پر رضامندی اور یا اس کے جرم کی معافی فیصلہ پر رضامندی ناممکن ہے، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ بی بی نے قرآن مجید کے فیصلہ کے خلاف رضامندی کا اظہار کیا جو ان کی عصمت کے منافی ہے اور ان کے جرم کی معافی

کی صورت اس لئے نہیں کہ انہوں نے نہ اس جرم کا اقرار کیا اور نہ مال مطلوبہ واپس دے کر معذرت پیش کی۔ جس طرح بی بی پاک استدلال کا مدعیٰ علیہم کے پاس جواب نہ تھا اسی طرح بی بی پاک کے مقدمہ کے وکلاء علمائے شیعہ رضوان اللہ علیہم کے استدلالات کا جواب مدعیٰ علیہ کے وکیل نام نہاد علامہ رازی کے پاس بھی نہیں تھا لیکن بی بی پاک کے دعووں کی اہمیت کو کم کرنے اور مدعیٰ علیہ کی لاج رکھنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ کہہ دیا بس وہ راضی ہو گئیں۔

اب ذرا خاتون جنت کی رضا مندی ملاحظہ فرمایئے۔ صحیح بخاری کتاب الخمس اور باب غزوۂ خیبر میں ہے۔ جب بی بی نے اپنا حق طلب کیا اور اس کے مقابلہ میں وہ مفروضہ حدیث پڑھی گئی اور بی بی کو خالی پلٹایا گیا تو بی بی غضبناک واپس پلٹی اور پھر مرتے دم تک حضرت ابوبکر سے بائیکاٹ کئے رہیں اور باپ کے بعد کل چھ ماہ زندہ رہیں۔ باب غزوۂ خیبر میں یہ لفظ زیادہ ہیں کہ جب بی بی کا انتقال ہوا تو حضرت علی علیہ السلام نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابوبکر کو جنازہ و دفن میں شرکت کی اطلاع تک نہ دی؟ تفصیلی بحث تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ میں یا ۱۵۱ص ۱۵۴ پر ملاحظہ فرمایئے۔

نیز ابن قتیبہ دینوری اپنی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے ساتھ مل کر بی بی پاک کے پاس برائے معذرت پہنچے تو بی بی نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا اور جب انہوں نے سلام کہا تو بی بی نے ان کو سلام کا جواب تک نہ دیا (حالانکہ رد سلام واجب ہوا کرتا ہے گویا بی بی ان کو اس کے قابل نہ سمجھتی تھی) اس کے بعد بی بی نے اپنی وراثت کے مقدمہ کو دہرایا اور فرمایا کیا اسلام کی روسے تیرے قریبی تیرے وارث ہوں اور ہم اپنے باپ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وارث

نہ ہوں؟ لیکن پھر ہی مفروضہ حدیث دہرائی گئی اور بی بی پاک نے ناراضگی کی اور باتیں بھی کہیں اور آخرت میں فرمایا کہ میں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو گواہ کر کے کہہ رہی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا ہے اور تم نے مجھے راضی نہیں کیا۔ اور اپنے بابا کے پاس پہنچ کر تم دونوں کی شکایت کروں گی اور نیز فرمایا ہر نماز میں میں تمہارے لیے بد دعا کروں گی۔ یہ پوری روایت تفسیر کی پہلی جلد یعنی مقدمہ تفسیر میں (ص ۱۷۳۔۱۷۶) پر درج ہے۔

اور اسی مطلب کی تائید کرنے والی ایک روایت اسی مضمون کی صحیح مسلم میں بھی موجود ہے کہ یہ معذرت خواہی کے لئے گئے اور بی بی نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ ہر نماز میں یا ہر نماز کے بعد تمہارے لئے بد دعا کرتی رہوں گی۔

کاش! دامنِ خلافت کو بچانے اور بی بی کے دعویٰ کی اہمیت کو ساقط کرنے سے قبل تاریخی واقعات کا جائزہ لے لیا ہوتا اور نہیں تو کم از کم صحاح ستہ کا مطالعہ کر لیا ہوتا تا کہ بی بی پاک کی رضامندی کا فیصلہ ہو جاتا۔ ہاں کیوں نہیں مصنف کو اس قسم کی باتیں بھولی ہوئی نہیں ہوتیں۔ خصوصاً اس قسم کے مختلف فیہ مسائل زیر نگاہ ہوتے ہیں جبھی تو آیت وراثت کی تفسیر میں بی بی پاک کی وراثت کے مقدمہ کو ذکر کر ہی دیا اور اپنی پارٹی کے حق میں فیصلہ سنا کر خاموش ہو گیا۔ ضرور بخاری و مسلم کے یہ مقامات بار بار پڑھے ہوں گے اور اس موقعہ پر تو گہری نظر سے ان کا مطالعہ کیا ہو گا اور صفحات تاریخ بھی پلٹے ہوں گے کہ کہیں یہ مل جائے کہ بی بی راضی ہو گئی لیکن کہیں ہوتا تو ملتا اور بی بی کی رضامندی کی صورت بھی ہو سکتی تو کوئی لکھتا کیونکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ بی بی کی رضامندی محالات میں سے ہے، اس لئے کہ غلط فیصلہ پر رضامندی شانِ عصمت وطہارت اور صداقت کے منافی ہے اور مجرم پر رضامندی بعید از عقل ہے، کیونکہ نہ اس نے حق دیا

اور نہ معافی ہوئی لیکن اس نام نہاد علامہ بلکہ امام بے چارے کے پاس اور تو کوئی حیلہ نہ تھا پس لکھ دیا کہ وہ راضی ہو گئی تھیں، لیکن یہ کھٹک دل میں باقی رہی کہ یہ جواب کافی نہیں۔ اس کو تاریخ وحدیث بلکہ عقل ونقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو دل میں سوچا کہ اس سے سرکا جاؤں۔ پس فوراً دوسری بات کہہ دی کہ چونکہ اجماع امت قائم ہے کہ جو کچھ خلیفہ نے کیا ہے وہ درست ہے لہٰذا اعتراف سب بے کار ہیں۔

ہاں! ایسے ہی لوگ تو امام کہلاتے ہیں جن کے نظریہ جات اس قسم کے ہوں کہ حاکم وقت کا فیصلہ قرآن کے خلاف ہو، عقل کے منافی ہو اور حقدار کا حق تلف ہوتا رہے اور وہ بیچارہ چیختا چلاتا رہے لیکن اکثریت اس کے حکم کے سامنے دب کر خاموشی اختیار کرلے یا اس کی کسی مصلحت کی بنا پر ہاں میں ہاں ملادے اور پھر کوئی مولوی اور خصوصاً علامہ کہہ دے کہ وہ حقدار پہلے چیختا چلاتا رہا اور بعد میں وہ خاموش اور راضی ہو گیا تھا یا یہ کہہ دے کہ خواہ وہ کتنا ہی فریاد کرتا رہے اور روتا رہے لیکن حاکم وقت کا جو فیصلہ ہو چکا ہے خلاف قرآن ہو تو ہو عقل نہ مانے تو نہ مانے لیکن چونکہ عوام نے تسلیم کر لیا ہے اور اجماع ہو چکا ہے تو پس صحیح ہے۔ اب عوام کیوں نہ کہیں اسے علامہ اور کیوں نہ امامت کا لقب؟؟

یہاں پر ایک حدیث مجھے یاد آتی ہے کہ بہترین جہاد کلمہ حق ہے جو سلطان جابر کے سامنے کہا جائے اور اسی حدیث کو تقیہ کے بطلان کی دلیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن جب وہ کلمہ حق اہل بیت عصمت کے کسی دعویٰ کی دلیل بنتا ہو تو اس وقت یہ جہاد ساقط ہے بلکہ حاکم وقت کی ہاں میں ہاں ملانا ہی ایمان ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مدعی کی دلیل بھی ناقابل تردید ہے اور ماننا بھی نہیں کیونکہ سارے لوگ راضی ہو چکے ہیں۔ پس اکثریت کی ہاں میں ہاں ملانی ہی ہے یہ ہے تحقیق اور بالغ النظری کی شان۔

ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں کہ آیا حضرت علی علیہ السلام امت کا فرد نہیں تھا؟ کیا جناب بتول معظمہ امت کی فرد نہیں تھیں؟ کیا حضرت سلیمانؓ، مقدادؓ اور ابوذرؓ وغیرہ امت کے افراد نہیں تھے؟ کیا مدینہ میں یہ لوگ موجود نہیں تھے؟ کیا یہ لوگ اس فیصلہ پر راضی تھے؟ جب ایسا نہیں تو عوام کو دھوکا دینے کے لئے یہ بہانہ کیوں؟

ہاں اس دھاندلی کا پتہ اس وقت چلے گا جب ایک طرف میدانِ محشر میں جناب بتول معظمہؑ اپنا دعویٰ دائر کریں گی اور دوسری طرف مدعیٰ علیہم ہوں گے۔ اگر اس وقت تم نے یہ کہا کہ بی بی راضی ہو گئی تھی تو ضرور جناب بتول معظمہؑ حضرت محسن کو پیش فرماویں گی اور وہ دروازہ خود گواہی دے گا جس پر لکڑیاں جمع کی گئی تھیں۔ نیز قرآن کی میراث والی آیات پکار پکار کر خاتون کی صداقت کی گواہی دیں گی۔ یقیناً جب اس میدان میں اس مفسر قرآن کو جواب دہی کے لئے کھڑا کیا گیا تو سمجھ آ جائے گی کہ اکثریت کی ہاؤ ہو سے دب کر دلیل کا ساتھ چھوڑنا کیسا ہوا کرتا ہے۔

ہاں بی بی تیرا دعویٰ سچا تھا اور تو حق پر تھی۔ جن لوگوں نے تیرا حق چھینا یا تیرے حق پر پردہ ڈالا وہ واقعی قیامت کے روز تیرے جوابدہ ہوں گے اور ہم دنیا و آخرت میں ان سے بری ہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۱۳۸)

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

"اور (شادی شدہ عورتیں) مگر وہ جن کے مالک ہوں تمہارے ہاتھ یہ

فرض اللہ کا ہے تم پر اور حلال کی گئیں تمہارے لئے وہ جو ان کے علاوہ
ہیں کہ طلب کرو بذریعہ اپنے مال کے شادی کے لئے نہ زنا کے لئے پس
جو متعہ کرو بذریعہ مال کے عورتوں سے تو دوان کو ان کے اجر (حق مہر)
فرضی طور پر اور نہیں گناہ تم پر اس میں جو باہمی رضامندی سے طے کرلو
بعد میں مقرر شدہ کے تحقیق اللہ علیم حکیم ہے۔" (النساء آیت ۲۴)

وَالْمُحْصَنٰتُ: اس کا عطف پیچھے ہے یعنی جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شادی شدہ یعنی منکوحہ عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ پہلا شوہر اسے اپنی قید نکاح سے آزاد نہ کردے اور اس کی عدت نہ گزر جائے یا پہلے کی موت کے بعد اس کی عدت نہ گزر جائے۔ اگر کوئی شخص منکوحہ عورت سے زنا کا مرتکب ہو جائے تو وہ عورت اپنے شوہر سے آزاد ہونے کے بعد بھی اس کے نکاح میں نہیں آسکتی اور اس پر حرام موبد ہو جاتی ہے، بلکہ عدت کے اندر زنا کرنے سے بھی وہ حرام ہو جاتی ہے۔

نکاح متعہ

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ: ابن عباس سے منقول ہے کہ اس جگہ استمتاع سے مراد نکاح متعہ ہے اور وہ نکاح جو مہر معلوم کے ساتھ مدت معلومہ تک کے لئے کیا جائے۔ آیت مجیدہ میں اس جگہ نکاح متعہ کا مراد ہونا مسلمات میں سے ہے، کیونکہ یہ سورہ مدینہ ہے اور اس دور میں مسلمانوں میں متعہ کا عام رواج تھا اور عامی وخاصی تمام روایات اس کو متفق طور پر تسلیم کرتی ہیں۔ چنانچہ فخر الدین رازی نے بھی تفسیر کبیر جلد ثالث مطبوعہ (ص ۱۹۶)) پر تسلیم کیا ہے کہ واقعی یہ آیت نکاح متعہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اس سے ہمارا کوئی انکار نہیں۔ البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو چکا ہے

اور اس کے نسخ کے قائل بعض کہتے ہیں کہ دوسری آیت قرآنیہ اس کی ناسخ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ احادیث نبویہ اس کی ناسخ ہیں۔ جو لوگ آیات قرآنیہ کو ناسخ قرار دیتے ہیں ان میں باہمی زبردست اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ آیت طلاق اس کی ناسخ ہے کیونکہ بالعموم عورتوں کی علیحدگی کی صورت طلاق ہوتی ہے اور نکاح متعہ میں طلاق نہیں پس منسوخ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آیتِ میراث اس کی ناسخ ہے کیونکہ زوجہ مرد کی وارث قرار دی گئی ہے اور متعہ میں ایسا نہیں ہوتا پس منسوخ ہے اور بعض آیت عدد سے جس میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ چار عورتوں تک نکاح کی اجازت ہے اور متعہ اس سے خارج ہے وغیرہ لیکن تامل وغور کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں سے کوئی بھی نکاح متعہ کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتی۔ قطع نظر اس سے کہ قائلین نسخ خود ایک دوسرے سے اتفاق نہیں رکھتے کہ کس آیت کو ناسخ قرار دیا جائے۔ اسی طرح سنت سے نسخ کے قائل بھی متفق نہیں ہیں بلکہ بعض کہتے ہیں فتح خیبر کے سال اور بعض کہتے ہیں فتح مکہ کے وقت اور بعض حجۃ الوداع کے موقعہ پر نکاح متعہ کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں اور علاوہ بریں خبر واحد حکم قرآنی کی ناسخ نہیں ہو سکتی بلکہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ اخبار کو قرآن کے سامنے رکھا جائے جو کتاب اللہ کے موافق ہو وہ قابل عمل ہے ورنہ مردود تو دریں حالات کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے اخبار کو ایسے حکم قرآن کا ناسخ قرار دیا جائے جو ایک عرصہ دراز تک معمول رہا ہو، اور تواتر سے اس پر عمل ثابت ہو۔

چنانچہ علامہ فخر الدین رازی اس مقام پر قائلین متعہ کے استدلال کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اس میں شک نہیں کہ متعہ اسلام میں جائز تھا البتہ اس کے منسوخ ہونے میں شک ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کا نسخ تواتر سے ثابت ہے یا خبر واحد سے۔ اگر

تواتر سے ثابت ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام اور ابن عباس جیسے بزرگوار کیسے اس سے بے خبر رہتے؟ اور اگر خبر واحد سے نسخ مانا جائے تو غلط ہے کیونکہ حکم متعہ کا ثبوت قطعی ہے اور خبر واحد ظنی ہوا کرتی ہے اور قطعی کے ذریعہ سے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

نیز جن روایات میں ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے یوم خیبر متعہ کی حرمت کا حکم دیا تھا وہ اس لئے ناسخ نہیں بن سکتی کہ اکثر روایات میں یہ ہے کہ حضورؐ نے حجتہ الوداع یا فتح مکہ کے وقت متعہ کی حلیت کا فرمان صادر کیا تھا۔

نیز حضرت عمر کا کہنا ہے کہ دو متعے جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں جائز تھے اور میں ان کو حرام قرار دیتا ہوں۔ ایک متعہ حج اور دوسرا متعہ نساء۔ گویا ان کا صاف اقرار ہے کہ رسالت مآبؐ کے زمانہ میں یہ حلال تھا اور منسوخ نہ تھا اور میں ہی اس کو منسوخ کر رہا ہوں اور عمران بن حصین نے یہی دلیل پیش کی تھی جب اس پر متعہ کے متعلق اعتراف کیا گیا تھا کہ حضرت رسالت مآبؐ نے ہمیں متعہ کا حکم دیا تھا اور ہم کرتے رہے اور آخر تک آپ نے منع نہ فرمایا۔ پھر ایک شخص نے اپنی مرضی سے جو چاہا کر دیا یعنی حضرت عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ (ملخصا)

علامہ رازی نے ان روایات اور اعتراض کو بلا جواب چھوڑ دیا۔ گویا دبی زبان سے دلائل جواز متعہ کو تسلیم کر لیا لیکن آخر میں یہ کہہ دیا کہ چونکہ حضرت عمر نے صحابہ کے سامنے متعہ کی حرمت کا اعلان کیا۔ اگر یہ منسوخ نہ ہو چکا ہوتا تو صحابہ پر اس سے جہاد کرنا واجب تھا۔ چونکہ انہوں نے چپ اختیار کر لی لہٰذا حضرت عمر کا کہنا درست ہے۔ اور یہ اس سے کاشف ہے کہ حضورؐ نے ضرور منع کیا ہوگا۔ (ملخصا)

تفسیر میزان میں کنز العمال سے منقول ہے کہ ایک شخص شام سے مدینہ میں وارد ہوا اور ایک عورت سے متعہ کر کے کچھ مدت مقیم رہا۔ بعد میں حضرت عمر کو اطلاع ہوئی تو

اس کو بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا تو نے ایسا کیا ہے؟ اس نے کہا ہاں! سوال کیا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں کیا ہے اور کرتے رہے ہیں اور حضورؐ نے تادم وفات منع نہیں فرمایا۔ پھر حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی کرتے رہے ہیں اور آپ کے دور خلافت میں بھی آج تک ہوتا رہا ہے اور آپ نے منع نہیں کیا۔ حضرت عمر نے قسم کھا کر فرمایا کہ اگر اس سے پہلے میں منع کر چکا ہوتا تو ضرور تجھے سنگسار کرتا۔ نیز حرمت متعہ کو جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں اولیات عمر میں سے لکھا ہے اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حرام تھا ورنہ متعہ کی حرمت اولیات عمر سے کیوں کر بن سکتی۔

صحیح مسلم اور مسند احمد سے بروایت عطا منقول ہے کہ جابر بن عبداللہ عمرہ کے لئے آیا تو ہم اس کے پاس جمع ہو گئے پس لوگوں نے مختلف موضوعات پر کلام کرنے کے بعد متعہ کی بحث کو چھیڑا تو جابر نے جواب دیا کہ ہم جناب رسالت مآبؐ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانہ میں خود کرتے رہے ہیں ایک اور روایت میں جابر سے مروی ہے کہ ہم نے رسالت مآبؐ کے زمانہ اور حضرت ابوبکر کے زمانہ اور حضرت عمر کے نصف دور خلافت تک متعہ کیا ہے اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منع کیا ہے۔

محاضرات راغب سے منقول ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ متعہ کے جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے تو عبداللہ بن زبیر نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس بارے میں طعن کیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اپنی ماں سے دریافت کرو چنانچہ جب اس نے اپنی ماں سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے تجھے متعہ سے جنا تھا (عبداللہ بن زبیر کی والدہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی تھی اور

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن تھی اور اس کا حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو عشرۂ مبشرہ میں سے شمار ہوتا ہے) سے متعہ تھا اور اسی سے حضرت عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔

نیز صحیح ترمذی میں بھی ہے۔ ایک شخص نے ابن عمر سے متعہ کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواز کا فتویٰ دیا۔ سائل نے کہا کہ تیرا باپ تو حرمت کا حکم دیتا ہے۔ اس کے جواب میں ابن عمر نے کہا کہ جس چیز کو جناب رسالت مآبؐ نے سنت قرار دیا ہو اگر میرا باپ اس سے روکے تو کیا تم سنت رسولؐ پر عمل کرو گے یا میرے باپ کا کہا مانو گے؟

پس روایات صاف بتلاتی ہیں کہ نکاح متعہ نہ کتاب سے منسوخ ہے نہ سنت سے بلکہ حضرت عمر ہی نے اس کو منع قرار دیا تھا اور متعہ کرنے والوں کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی۔

تفسیر میزان میں مستدرک حاکم سے مروی ہے کہ ابونضرہ کہتا ہے۔ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے آیت متعہ تلاوت کی تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی

راوی کہتا ہے ہم تو ایسا نہیں پڑھا کرتے تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا خدا کی قسم اسی طرح نازل ہوئی ہے غالباً مقصد یہ ہے کہ جناب رسالت مآب کے زمانہ میں اس آیت کو اس تفسیر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور جبرئیلؑ اس کا یہی مطلب لے کر آیا تھا بہر کیف منصف مزاج انسان کے لئے تو ان روایات کو دیکھنے کے بعد کوئی شک وشبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ متعہ جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں جائز اور مروج تھا

اور قطعاً منسوخ نہیں ہوا تھا لہٰذا آپ کے بعد کسی آپ کے جانشین کو حق نہیں پہنچتا کہ شریعت مقدسہ کے کسی حکم میں ترمیم یا تنسیخ کرے اور اسی بناء پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ عمر نے متعہ کو حرام نہ کیا ہوتا تو کوئی بدنصیب ہی زنا کا مرتکب ہوتا۔ اس روایت کو تفسیر کبیر میں محمد بن جریر طبری کی تفسیر سے نقل کیا گیا ہے۔

متعہ کے جواز بلکہ سنت ہونے کے متعلق اہل بیت اطہار علیہم السلام سے احادیث بحد تواتر موجود ہیں اور شہید ثانی اعلیٰ اللہ مقامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ تقیہ کے پیش نظر ہماری احادیث میں بسا اوقات اختلاف رونما ہو جایا کرتا ہے لیکن متعہ کا حکم اگرچہ باقی فرق اسلامیہ میں سے شیعہ کا امتیازی فتویٰ ہے لہٰذا اس بارے میں احادیث میں اختلاف کا ہونا بعید نہ تھا۔ بایں ہمہ ایک حدیث بھی ائمہ طاہرین علیہم السلام سے ایسی منقول نہیں جس میں متعہ کی حرمت کا فتویٰ دیا گیا ہو۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ: بروایت تفسیر عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر متعہ کی میعاد ختم ہو جائے اور زن و مرد اس کو بڑھانا چاہیں تو مرد مہر کو بڑھا دے اور عورت مدت کی زیادتی کی اجازت دے پس مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ کا مطلب یہ ہے کہ مدت ختم ہو جانے کے بعد ہر دو کی رضا مندی سے مہر اور مدت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ البتہ متعہ کی حرمت کا فتویٰ دینے والے ایک عذر پیش کرتے ہیں کہ جس وقت جناب رسالتمآبؐ نے متعہ کی اجازت دی تھی اس وقت ضرورت لاحق تھی یعنی صحابہ گھروں سے دور ہونے کی وجہ سے مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ پس اس ضرورت کو رفع کرنے کے لئے یہ حکم عارضی طور پر دیا گیا اور بعد میں منع کیا گیا۔ اس کا جواب تفسیر میزان نے یہ دیا ہے کہ اگر متعہ کو زنا سے تعبیر کیا جائے تو کیا ایسی صورت میں زنا کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ اور نیز کیا جناب رسالتمآبؐ کے

دور کے بعد وہ ضرورت برطرف ہوگئی تھی جب کہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کی فوجیں مشرق سے مغرب تک جایا کرتی تھیں اور کافی عرصہ کے لئے مجاہدوں کو گھروں سے غائب رہنا پڑتا تھا، نیز حضرت عمر کی ابتدائی خلافت اور اس کے آخری حصہ میں ضرورت کس طرح تبدیل ہوگئی۔

اور پھر زمان حاضر میں ضرورت کا جائزہ لیجئے جب کہ جذبات شہوانیہ کے مظاہرے ناموس انسانیت کو داغدار کر رہے ہیں اور دن بدن روز افزوں ترقی پر ہیں یہاں تک کہ نوجوان طبقہ میں بدکاری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہ زنا اور لواطہ کیوں ہمہ گیر ہو ہے؟ وجہ یہ ہے کہ زیادہ شادیاں کرنا بعض ملکوں میں تو قانوناً ممنوع ہیں اور جہاں ممنوع نہیں وہاں نکاح دائمی کے اخراجات کے بوجھ برداشت کرنے کی طاقت کم ہے یا ایسی رکاوٹیں موجود ہوتی ہیں مثلاً تحصیل علم یا ملازمتیں وغیرہ کہ انسان شادی نہیں کرسکتا۔ پس جذبات کے مقابلہ سے عاجز ہوکر زنا کاری اور واطہ کاری کو ہی باعث تسکین سمجھ لیا جاتا ہے۔

ان ضروریات کے پیش نظر اگر متعہ جائز ہوتا تو کیوں یہ بدکاری ہمہ گیر طوفان بن کر اہلِ عالم پر چھا جاتی؟

نیز یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ عورت و مرد کی ازدواجی زندگی صرف نسل انسانی کو برقرار رکھنے کے لئے ہے نہ کہ خواہشات کا الو سیدھا کرنے کے لئے۔ نکاح متعہ چونکہ صرف جذبات شہوانیہ کی تسکین کے لئے ہوتا ہے لہٰذا یہ غرض خلقت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی احکام شرعیہ مصلحتوں کے ماتحت ہوا کرتے ہیں اور نکاح کی مصلحتِ حقیقیہ ہے۔ نسل انسانی کو برقرار رکھنا لیکن اس سلسلہ کو جاری کرنے کے لئے جب تک عورت و مرد میں ایک دوسرے کی طرف کشش نہ ہو یہ خواب کیونکر شرمندہ تعبیر

ہو۔ پس خداوند کریم نے عورت و مرد میں کشش پیدا کرنے کے لئے ان کو اپنی حکمت تامہ کی رو سے قوت شہوانیہ عطا فرمائی تا کہ ان کا باہمی تجاذب سلسلہ نسل انسانی کا پیش خیمہ ہو۔ پس فطری طور پر انسان بقاء نسل کی طرف اقدام کرتا ہے لیکن شہوانیکشش کے ماتحت ورنہ اگر یہ کشش نہ ہوتی تو قطعاً یہ غرض پوری نہ ہو سکتی۔ دیکھئے نکاح سنت ہے اور خداوند کریم کی طرف سے انسان پر عائد شدہ احکام واجبات محرمات جن کو شریعت مقدسہ نے رائج فرمایا ہے کس قدر زیادہ ہیں۔ انسان اور خصوصاً مسلمانوں کا طبقہ ان پر کس حد تک عمل پیرا ہے؟ اور یہ اس لئے کہ ان پر عمل کرنے سے انسان کو لذت نہیں آتی اور جن چیزوں میں نفس لذت محسوس کرتا ہے خواہ خدا ان کو حرام بھی کہے ان سے باز نہیں آتا اور نکاح باوجودیکہ روکاوٹیں ہوں تب بھی ان کے دفع کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہوتا ہے بلکہ اس کی خاطر جان و مال تک کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ پس یقینی بات ہے کہ اگر خواہش و شہوت نہ ہوتی نسل انسانی کی برقراری کی غرض صرف عورت و مرد کی خلقت سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

پس عورت و مرد کی ازدواجی زندگی صرف نسل انسانی کی بقاء کے لئے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ انسان حیوانیت کی بے راہ روی سے بچ سکے اور افراط و تفریط سے یکسو ہو کر تمدن انسانی کا ضامن ہو جس کے لازمی نتیجہ میں نسل انسانی کی بقاء سے زمین آباد ہو اور عالم سکون و اطمینان کا گہوارہ ہو۔ پس خواہشات کا پورا کرنا غرض خلقت انسانی کے منافی نہیں۔ ہاں ان کی آوارگی اور بے راہ روی منافی فطرت بھی ہے اور مصادم غرض بھی۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر شادی کرنے والا جوڑا صاحب اولاد ہو۔ تو کیا ایسی صورت میں ان کا شادی کرنا ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ ان کی شادی سے نسل انسانی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح بانجھ عورت سے شادی کرنا اور اسی قسم کی ہزاروں شقیں سامنے

لائی جاسکتی ہیں۔ بہر کیف شہوت کی تکمیل حرام نہیں بلکہ تکمیل شہوت میں بے راہ روی اور آوارگی شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دی ہے۔ بنابریں نکاح متعہ کو شریعت مقدسہ نے اسی آوارگی اور بے راہ روی کے سدباب کے لئے ایجاد کیا تھا جبھی تو مولائے کائنات فرمایا کرتے تھے: ''اگر متعہ کو حرام نہ کیا گیا ہوتا تو بدنصیب ہی بدکاری کا مرتکب ہوتا۔'' پس اس باب میں اتنا لکھنا کافی ہے اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ متعہ انہی عورتوں سے ہوسکتا ہے جن سے نکاح دائمی ہوسکتا ہے اور متعہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد اس کو بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ مدت ختم ہو جانے کے بعد عورت کے لئے طلاق کی نصف عدت تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد وہ کسی دوسرے سے نکاح متعہ یا نکاح دائمی کرسکتی ہے نیز متعہ کی اولاد اس مرد کی صحیح اولاد ہوگی اور وہ اپنے ماں باپ کی وارث ہوگی جس طرح دوسری اولاد وارث ہوا کرتی ہے۔ نیز متعہ کے صیغے نکاح کے صیغوں کی طرح پڑھے جاتے ہیں اور مجبوری کی صورت میں ان کے اپنی زبان میں ترجمہ سے بھی متعہ ہوسکتا ہے۔ اور متعہ میں تعداد کی کوئی پابندی نہیں حتیٰ کہ اگر چار منکوحہ عورتیں گھر میں ہوں تب بھی ایک یا زیادہ عورتوں سے متعہ کیا جاسکتا ہے۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۱۶۰ تا ۱۶۳)

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ

''اور عبادت کرو اللہ کی اور نہ شریک کرو اس کا کسی شے کو اور ماں باپ

سے احسان کرو اور قرابت دار سے اور یتیموں اور مسکینوں اور ہمسایہ قرابت دار اور ہمسایہ اجنبی اور پہلو کے ساتھ اور مسافر اور اپنے غلاموں کنیزوں کے ساتھ تحقیق اللہ نہیں دوست رکھتا ہے اترانے والے فخر کرنے والے کو جو بخل کرتے ہیں۔"

نبیؐ اور علیؑ امت کے باپ ہیں

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا : اس آیتِ مجیدہ کے ذیل میں تفسیر برہان میں متعدد احادیث خانوادہ عصمت سے مروی ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ اور حضرت علی علیہ السلام تمام امت کے باپ ہیں اور جناب رسالت مآبؐ سے بھی مروی ہے کہ اَنَا وَعَلِیٌّ اَبَوَا هٰذِهِ الْاُمَّةِ ۔اور کتاب مناقب محمد بن جریر سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ منادی کرو جو شخص اپنے اجیر اجرت کے متعلق ظلم کرے گا اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جو اپنے مولی کے علاوہ کسی اور کی ولا رکھے گا اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جو اپنے ماں باپ پر سب کرے گا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ پس حضرت امیر علیہ السلام نے منادی کی تو صحابہ کی ایک جماعت جن میں حضرت عمر بھی تھے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور منادی کے ان کلمات کی تفسیر دریافت کی۔ آپ نے آیت مودت پڑھ کر فرمایا: جو اس بارے میں ہم پر ظلم کرے گا وہ اللہ کی لعنت کا حقدار ہے۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ آیت پڑھ کر حدیث غدیر مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ پڑھی اور فرمایا جو اس کی اور اس کی ذریت کی ولا چھوڑ کر کسی اور کو مولا بنائے اس پر لعنت ہے۔ اس کے بعد فرمایا اَنَا وَعَلِیٌّ اَبُو الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی میں اور علیؑ مومنوں کے باپ میں ہیں جو ہم میں سے ایک کو سب کرے گا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ جب باہر نکلے تو حضرت عمر نے باقی صحابہ سے فرمایا کہ غدیر خم یا دوسرے مقامات کی بہ

نسبت ولا علی علیہ السلام کے متعلق حضورؐ کا آج کا تاکیدی فرمان بہت شدید ہے۔ حسان بن ثابت کہتا ہے کہ یہ واقعہ جناب رسالت مآبؐ کی وفات سے سترہ روز پہلے کا ہے۔
(تفسیر انوار النجف جلد ۴، پارہ ۵، ص ۱۷۳)

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا

"گواہ اس دن خواہش کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسولؐ کی کاش ان کو برابر کیا جاتا زمین سے اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات۔"

تفسیر برہان میں بروایت کافی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ آیت بالخصوص امت محمدیہ کے حق میں ہے اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک امام ہوگا جو اپنے زمانہ والوں پر شاہد ہوگا اور جناب رسالت مآبؐ ہم پر شاہد ہوں گے اور حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ اوصیاء صراط پر موجود ہوں گے اور جنت میں ان کا عارف ہی داخل ہوگا اور فرمایا خدا نے انہی کے متعلق فرمایا ہے يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ یعنی وہ گواہ اپنے دوستوں کو پہچانتے ہوں گے۔ (الحدیث)

بروایت عیاشی امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہر نبی کی امت پر اس نبی کا وصی گواہ ہوگا اور اس امت پر حضرت علی علیہ السلام گواہ ہوں گے يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ تفسیر برہان میں قمی سے منقول ہے کہ جن لوگوں نے حضرت امیر علیہ السلام کو ناراض کیا وہ تمنا کریں گے کہ کاش جس دن ہم نے علی علیہ السلام کو ناراض کیا تھا اس دن ہمیں زمین نگل گئی ہوتی اور فرمان رسولؐ کو نہ چھپایا ہوتا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۴، ص ۱۷۵)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا (النساء:٤٨)

"قرآن مجید میں یہ آیت گنہگار مومنین کے لئے بخشش کا سہارا ہے

کیونکہ فرماتا ہے شرک کے علاوہ باقی سب گناہ بخشے جاسکتے ہیں۔"

پس مومن کو کسی صورت میں بخشش خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: اگر مومن کی امید مغفرت اور خوف عذاب کو تولا جائے تو وہ ہموزن ہوں گے، کیونکہ نا امید ہونے والے کے متعلق فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ

یعنی رحمت پروردگار سے گمراہ ہی مایوس ہوا کرتے ہیں، عذاب خدا سے نڈر لوگوں کے متعلق فرماتا ہے:

وَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ

"یعنی اللہ کی گرفت سے خسارہ پانے والے ہی نڈر ہوا کرتے ہیں۔"

آیت مجیدہ سے مغفرت عامہ کا استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ خدا اگر چاہے تو تمام گناہ بلا توبہ کیئے ہی بخش دے کیونکہ توبہ کے بعد تو شرک کا گناہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں شرک اور دوسرے گناہوں کے درمیان فرق کرنے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اگر انسان بغیر توبہ کیئے مر جائے تو شرک کے علاوہ جس قدر گناہ ہوں گے اگر وہ چاہے گا تو بخش دے گا اور شرک کا گناہ قطعاً قابلِ بخشش ہی نہیں اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شرک کے علاوہ جو گناہ ہیں وہ ہر ایک کے معاف نہ ہوں گے بلکہ بعضوں کے معاف ہوں گے کیونکہ اگر سب کے معاف ہوتے تو فرماتا کہ ہر ایک کو بخش دوں گا یہ نہ فرماتا کہ جس کے چاہوں گا معاف کروں گا اور یہ بات عدل کے منافی بھی نہیں کیونکہ بلا استحقاق کسی کو سزا دینا منافی عدل ہوتا ہے لیکن بلا استحقاق کسی کو انعام

واکرام کرنا منافی عدل نہیں بلکہ عین تفضل ہے اور وہ اپنے افعال میں مجبور نہیں جس پر اپنا فضل وکرم کرنا چاہے اسے کوئی پابندی نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے فضل وکرم کے لئے کوئی ترجیح کی بھی تو وجہ ہوگی کیونکہ فعل حکیم حکمت سے خالی نہیں ہوا کرتا تو اس کے متعلق تفسیر برہان میں فقیہ سے مروی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ مومن جس حال میں مرے جس دن مرے اور جس ساعت میں اس کی روح قبض ہو وہ صدیق اور شہید ہو کر مرتا ہے۔ میں نے اپنے حبیب جناب رسولؐ سے سنا ہے آپ نے فرمایا اگر مومن دنیا سے کوچ کرے درحالیکہ کہ اس کے اوپر اہل زمین کے گناہوں کے برابر بوجھ ہو تو موت اس کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی پھر فرمایا کہ جو شخص خلوص کے ساتھ کلمہ توحید زبان پر جاری کرے وہ شرک سے بری ہوگا اور جو بھی شرک سے بری ہو کر دنیا سے جائے وہ داخل جنت ہوگا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ مِنْ مُّحِبِّیْكَ وَشِیْعَتِكَ یَا عَلِیُّ

یعنی اے علی علیہ السلام یہ تیرے شیعوں کے لئے ہے۔ حضرت فرماتے ہیں میں نے عرض کی: حضورؐ! یہ میرے شیعوں کے لئے ہے آپ نے فرمایا: ہاں، مجھے اپنے پروردگار کی قسم یہ تیرے شیعوں کے لئے ہے۔ اور وہ لوگ قبروں سے نکلیں گے یہ کہتے ہوئے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ علی ابن ابی طالب حُجَّةُ اللّٰهِ

پس جنت کے سبز حلے ان کی خدمت میں لائے جائیں گے پس وہ پہنیں گے اور تاج ملک اور دستار کرامت سر پر رکھیں گے اور ناقہ ہائے جنت پر سوار ہوں گے جو انہیں پرواز کر کے جنت میں پہنچائیں گی۔

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ هٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ

"ان کو قیامت کی سخت گھبراہٹ محزون نہ کرے گی اور ملائکہ ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم وعدہ کئے گے تھے۔"

اس بنا پر حضرت امام باقر علیہ السلام نے شرک سے کفر ولایت علی مراد لیا ہے اور یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ مصداق ایسے لوگوں کو قرار دیا ہے جو ولایت علی رکھتے ہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۵، ص ۱۸۱ تا ۱۸۲)

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (نساء آیت ۵۶)

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ: باعتبار ظاہر یہودیوں کی حسد کی حکایت ہے کیونکہ وہ حضرت رسالت مآب کی نبوت وسلطنت سے حسد کرتے تھے۔ پس خدا فرماتا ہے آل ابراہیم میں یہ نبوت کوئی پہلی بار تو نہیں اس سے پہلے بھی تو آل ابراہیم علیہ السلام میں نبوت ومملکت رہی ہے۔ حضرت داؤد صاحب نبوت وسلطنت تھے جن کی (۹۹) بیویاں اور حضرت سلیمانؑ نبی اور بادشاہ جن کی (۱۰۰) یا ایک ہزار تک زوجات تھیں تو ان پر حسد کیوں نہیں کرتے؟ چونکہ جناب رسالت مآب تمام لوگوں کی طرف رسولؐ تھے لہٰذا ان کا حسد تمام لوگوں کے حسد کے برابر ہے اسی لئے کہا گیا کہ یہ لوگ ناس سے یعنی تمام لوگوں سے حسد کرتے ہیں اور باعتبار باطن ہر وہ شخص اس کا مصداق ہے جو خدا کے کسی منتخب بندے پر حسد کرے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہاں فضل سے مراد نبوت وامامت ہے اور ناس سے مراد نبی وآل نبی ہیں تفسیر عیاشی سے مروی ہے کہ

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا ہم وہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض کی اور انفال وغیرہ کے حقدار ہم ہیں اور راسخین فی العلم بھی ہم ہیں اور ہم وہ محسود ہیں جن کے متعلق خدا نے فرمایا کہ وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں یعنی جن پر حسد کیا گیا وہ ہم ہیں۔
(مجمع البیان، تفسیر انوار النجف جلد ۴، ص ۱۸۳)

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور صاحبان امر کی جو تم سے ہیں پس تمہیں اگر جھگڑا ہو کسی شئے میں تو اسے رد کرو طرف اللہ اور رسولؐ کے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روز قیامت پر یہ بہتر اور خوب تر ہے از روئے انجام۔'' (النساء آیت ۵۹)

اولوالامر کی تشخیص

فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک بات کہی ہے کہ اس مقام پر خداوند کریم نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم جزمی اور قطعی طور پر دیا ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ اولی الامر وہی ہو سکتے ہیں جو معصوم ہوں کیونکہ اگر معصوم نہ ہوں تو ان سے غلطی کا امکان ہوگا اور ان کو غلط باتوں میں بھی ان کی اطاعت کرنا پڑے گی۔

کیونکہ حتمی طور پر بلا استثنا اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے لیکن غلط کاریوں سے بھی منع فرماتا ہے لہٰذا ایسے مقام پر اطاعت ساقط ہونی چاہیے تو آیت اولی الامر کی رو سے اس کی اطاعت کے وجوب کا حکم اور غلطی سے بچنے کے عمومی اوامر کے ماتحت اس کی

عدم اطاعت کا حکم تناقض ہے اور محال ہے پس ثابت ہوا کہ یہاں اولوالامر سے مراد معصوم ہے لیکن اس کے بعد کہتا ہے کہ وہ معصوم امت میں سے کوئی خاص آدمی ہوں گے یا اس سے مراد مجموع امت ہوگی۔ پہلی صورت باطل ہے کیونکہ اگر خاص افراد مراد ہوتے تو ہمیں ان کی نشاندہی کی جاتی اور تعارف کرایا ہوتا کیونکہ بغیر تعارف کے ان کی اطاعت کا حکم ناجائز ہے اور چونکہ ہمیں بتلائے نہیں گئے تو معلوم ہوا کہ خاص افراد مراد نہیں ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس سے مراد مجموع امت ہے تو مقصد یہ ہے کہ امت کے ارباب حل وعقد جب ایک بات طے کر دیں تو اس کی اطاعت واجب ہے اور آیت مجیدہ اجماع کی حجیت پر دلیل ہے۔

دیکھئے عداوتِ آلِ محمدؐ کا بھوت کس طرح دل و دماغ کو معطل کر دیتا ہے کہتا ہے۔ اگر خاص افراد مراد ہوتے تو ان کی نشاندہی کرائی گئی۔ ہوتی اور ہمیں اس کی نشاندہی نہیں کرائی گئی کس قدر صریح جھوٹ اور خدا اور رسولؐ پر کس قدر بہتانِ عظیم ہے۔

① آیتِ مجیدہ تطہیر:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ۔

اس کے متعلق ابنِ حجر مکی نے صواعق محرقہ میں ذکر کیا ہے کہ اکثر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور فاطمہؑ، حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے حق میں نازل ہوئی۔ مسلم نے باب فضائل اہل بیت میں حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے حسنین علیہما السلام، فاطمہؑ اور علی علیہ السلام کو ردا کے اندر اکٹھا کر کے آیتِ تطہیر پڑھی۔ جلال الدین سیوطی نے درمنثور میں بھی اسے نقل کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کر کے اسے صحیح علی شرط البخاری قرار دیا ہے۔ نیز ترمذی باب مناقب اہل بیت میں عمر بن ابی سلمہ سے مروی

ہے کہ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو اس وقت جناب رسالت مآبؐ اُمِ سلمہ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ پس علی علیہ السلام فاطمہ علیہا السلام اور حسن وحسین علیہما السلام کو جمع کر کے ان پر چادر ڈال دی اور دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِىْ فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا

نیز مستدرک، ترمذی اور مسند احمد میں انس سے مروی ہے کہ اس کے چھ ماہ بعد تک جناب رسالت مآبؐ جب صبح کی نماز کے لئے مسجد کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو دروازہ فاطمہ علیہا السلام سے گزرتے ہوئے آیہ تطہیر کی تلاوت فرماتے تھے اور درمنثور میں ابوالحمراء سے منقول ہے کہ مجھے یاد ہے کہ پورے آٹھ ماہ بعد جب حضورؐ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلتے تھے تو علی علیہ السلام کے دروازہ پر پہنچ کر اپنے دونوں ہاتھ مبارک دروازہ کے دونوں پہلوؤں پر رکھتے تھے اور فرماتے تھے الصلوٰۃ الصلوٰۃ اور پھر آیہ تطہیر پڑھتے تھے ابن عباس نے نقل کیا ہے کہ پورے نو ماہ بعد تک حضورؐ ہر نماز کے وقت علی علیہ السلام کے دروازہ پر کھڑے ہو کر السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ اہل البیت اور آیت تطہیر پڑھتے تھے اور ہر روز پانچ مرتبہ ایسا کرتے تھے۔

(ملخص از دلائل الصدق)

بہرکیف اس باب کی تمام روایات کو جمع کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے اور علماء نے اس موضوع پر انفرادی طور پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ حتی کہ اس کے تواتر میں کوئی ذی شعور شک وشبہ نہیں کر سکتا اور اس کے خلاف جن لوگوں نے اس آیت مجیدہ کے شان نزول کو ازواج سے خاص کرنے کی کوشش کی ہے تو صرف اہل بیتؑ کی خاص فضیلت کو پوشیدہ کرنے یا ان کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے ہی ان کی رگ عصبیت تڑپی ہے لیکن بایں ہمہ ان نقول متواتر کے مقابلہ میں ان کو لانا فضول ہے۔

اب جائے غور ہے کہ خداوند کریم اس آیت تطہیر میں ان ذوات مقدسہ کی علی الاطلاق تطہیر کا اعلان فرما رہا ہے۔ اور ہر قسم کے رجس کی دوری کی تصریح فرما رہا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ فعل جو منشاء خدا کے خلاف ہو وہ رجس ہے اور ہر وہ نظریہ جو خطا اور غلط ہو وہ رجس ہے پس جب خدا نے مطلقاً اہل بیت عصمت سے رجس کو دور فرمایا اور ان کی ہر رجس سے تطہیر کا اپنی پاک کتاب میں اعلان فرمایا تو معصوم کی نشاندہی اور اس کا تعارف اس سے زیادہ واضح اور کھلے لفظوں میں اور کس طرح ہوگا جس کا عذر فخرالدین رازی بیان کر رہا ہے۔ کیا اسے آیت تطہیر یاد نہیں تھی کیا وہ ان روایات کو نہیں جانتا تھا؟ سب کچھ تھا اس کی نظر سے یہ باتیں اوجھل نہ تھیں البتہ علی علیہ السلام کی دشمنی اس کو ان حقائق کے اظہار کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا وہ مجبور تھا کہ یہ بہانہ بنائے۔

② آیتِ مباہلہ: تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ مباہلہ رسولؐ کے ساتھ جانے والے افراد یہ بزرگوار تھے جو آیتِ تطہیر کا مصداق تھے اور سچ اور جھوٹ کے امتیاز کا یہ آخری اور چوٹی کا مقابلہ تھا۔ چنانچہ اس کی نشانی یہ تھی کہ جھوٹوں پر لعنت کی بددعا کی جائے۔ پس نصرانیوں کی تسلیم نے یہ مسلمانوں پر بھی ثابت کر دیا کہ رسولؐ اور رسولؐ کے ہمراہ جانے والے سچے ہیں اور صداقت جس طرح قول میں ہوتی ہے اسی طرح فعل میں ہوتی ہے اور اسی طرح عقلی نظریوں میں ہوا کرتی ہے اور علی الاطلاق سچا وہ کہے جانے کا مستحق ہے، جو قول فعل اور اعتقاد میں ہر پہلو سے سچا ہو اور مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کے قول، عمل اور اعتقاد میں غلطی کا شائبہ نہ ہو اور اسی کو معصوم کہا جاتا ہے۔ پس آیت مباہلہ میں معصوم کی نشاندہی نہیں تو اور کیا ہے اور كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا امر اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ کی دوسری تعبیر ہے لیکن چونکہ علی علیہ

السلام کو پیچھے ہٹاتا ہے لہٰذا کچھ بھی ہو مانتا نہیں۔

۳ آیتِ صلوٰۃ یعنی اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ صحیح مسلم سے منقول ہے کہ حضورؐ سے صلوٰۃ کا طریقہ دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا اس طرح کہا کرو۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَاٰلِ اِبْرَاہِیْمَ

اور ظاہر ہے جس پر خدا کا درود وسلام ہو اور مومنین کو بھی درود وسلام کا حکم دے وہ معصوم ہوگا چنانچہ بعد میں سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا حکم دے کر ان کی اطاعت کو بھی لازم وواجب قرار دے دیا اور آلِ محمدؐ کے متعلق آیت تطہیر کی شانِ نزول نے وضاحت کردی کہ وہ کون لوگ ہیں۔

۴ آیتِ ولایت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہ مفسرین کا اجماع ہے کہ حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے والا سوائے حضرت امیر کے اور کوئی نہیں تھا پس اللہ اور رسولؐ کی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی ولایت مطلقہ کا مالک ہے تو جس قسم کی ولایت اللہ ورسولؐ کو حاصل ہے حضرت علی علیہ السلام بھی اس میں شریک ہیں اور خدا کسی کو ولایت مطلقہ نہیں دیتا جب کہ معصوم نہ ہو۔

بہرکیف اس قسم کی آیات اور بھی بہت ہیں جو اس مقام پر گنوائی جاسکتی ہیں۔ جن کے ذکر سے طول ہو جائے گا۔ اور منصف مزاج انسان کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ اب جناب رسولِؐ خدا کی نشاندہی کا جائزہ لیں تو ان احادیث کی طویل فہرست ہے جو اس ذیل میں ذکر کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا مناسبت مقام سے بعض کا ذکر ناگزیر ہے۔

۵ حدیث منزلت جو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں بھی منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو فرمایا:

اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلاَّ اَنَّهٗ لاَ نَبِیَّ بَعْدِیْ

حضرت رسالت مآبؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو ہارونؑ سے مشابہت دے کر فرمایا کہ حضرت ہارونؑ کے لئے جو خصوصیات تھیں وہ تجھ میں ہیں سوائے نبوت کے۔ باتفاق علماء اسلام حضرت ہارون علیہ السلام معصوم تھے اور روایت مذکورہ کو فضل بن روز بہان جیسے متعصب نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۲ بروز خندق حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الشِّرْکِ کُلِّهٖ

"کہ سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے شرک کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔"

کیا غیر معصوم کو عین ایمان کہا جا سکتا ہے؟ اور عمرو بن عبدود کے مارے جانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا: علی علیہ السلام کی یہ ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے یا میری امت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے کیا یہ عصمت نہیں تو اور کیا ہے؟ حدیث مذکورہ کو فضل بن روز بہان نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۳ حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا: لاَ یُحِبُّكَ اِلاَّ مُؤْمِنٌ وَّلاَ یُبْغِضُكَ اِلاَّ مُنَافِقٌ جس کو امام احمد بن حنبل نے مسند میں ذکر کیا ہے اور فضل بن روز بہان نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کیا خطا کار کی محبت ایمان کی نشانی ہو سکتی ہے یا خطا کار سے بغض رکھنا منافق کے علامت ہے؟ کھلے لفظوں نہ سہی التزاماً یہ حدیث حضرت علی علیہ السلام کی عصمت کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟

۴ حدیث طیر جو کتب صحاح میں موجود ہے اور مسند احمد بن حنبل میں بھی

مذکور ہے کہ حضرت کے پاس ایک بھونا ہوا پرندہ آیا تو آپ نے دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ ائْتِنِیْ بِاَحَبِّ النَّاسِ اِلَیْکَ یَاکُلُ مَعِیَ فَجَاءَ عَلِیٌّ فَاَکَلَ مَعَہٗ

"یعنی اے اللہ تو وہ بندہ بھیج جو تیری مخلوق میں سے تیرا محبوب ترین ہو۔"

پس آپ کی دعا مقبول ہوئی اور حضرت علی علیہ السلام آئے اور حضرت رسالت مآبؐ کے ساتھ وہ پرندہ نوش فرمایا۔ یہ حدیث متواترات میں سے ہے اور صاف ظاہر ہے کہ خدا کا محبوب ترین بندہ غیر معصوم نہیں ہو سکتا۔

(۵) ترمذی اور مستدرک حاکم اور دیگر کتب صحاح میں موجود ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وَعَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ لَنْ یَّفْتَرِقَا

کیا یہ الفاظ حضرت علی علیہ السلام کی عصمت کا کھلا اعلان نہیں کر رہے۔ کیا خطا کار بھی حق سے جدا نہیں ہو سکتا؟

اس باب کی حدیثیں کافی جمع کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً حدیث نور، حدیث ثقلین حدیث سد ابواب حدیث مواخاۃ وغیرہ ان تصریحات کے بعد کوئی منصف مزاج انسان کہہ سکتا ہے کہ معصوم پر نص وارد نہیں اور ہمیں معصوم کا تعارف نہیں کرایا گیا؟ البتہ فخر الدین اور اس کے ہمنوا جن لوگوں کی عصمت کے خواہش مند ہیں۔ اگر ان کے متعلق تصریحاً تو بجائے خود تلویحاً بھی کوئی ایسی منقبت مذکور ہوتی جس سے ان کی عصمت کا شائبہ ہو سکتا تو یقیناً اسے بیانگ دہل اچھالتے لیکن عصمت کی نصوص ان لوگوں کے متعلق ہیں جن کو یہ لوگ پیچھے ہٹانے کے درپے ہیں اور اگر انہیں معصوم تسلیم کر لیں تو انہیں آگے لانا پڑتا ہے۔ پس عذر ہی سوچا کہ کسی کے متعلق عصمت کی نص ہے نہیں لہٰذا اولوالامر کے مصداق افراد معینہ نہیں ہو سکتے۔

اب ذرا ان سے پوچھا جائے کہ حضور! ارباب حل وعقد کا فیصلہ حجت قرار دیا جا رہا ہے۔ اور آیت اولوالامر ان پر انطباق کیا جا رہا ہے۔ آیا ان کے متعلق کہیں عصمت کی نص آپ کے پاس پہنچ چکی ہے اور کیا ان کی نشاندہی رسالت مآبؐ نے کر دی تھی۔

تہافت اور تناقض گوئی کی یہ حد کہ ایک دفعہ تو کہا کہ معصوم مجموع امت یا فرد پھر دلیل میں فرد کی نفی کر کے ارباب حل وعقد کو سامنے لے آئے ثابت تو کرنا تھا مجموع امت کی عصمت کو، جس کے لئے افراد کی عصمت کو راستہ سے ہٹایا، لیکن جب مجموع امت کے کردار پر نظر ثانی کی تو بجائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ افراد کو پھر پیش کیا جائے لیکن الفاظ تبدیل کر دیئے اور کہہ دیا ارباب حل وعقد سبحان اللہ؟ عجیب منطق لڑائی اور خوب علمی طریق سے بحث کی۔

کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجموع امت اولوالامر کی مصداق ہے تو اطیعوا کا حکم ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں یا یہودیوں وغیرہ کو ہو رہا ہے اور ارباب بست وکشاد اگر اس کا مصداق ہیں تو کیا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے خطاب سے وہ خود باہر ہوں گے یا وہ بھی کسی صاحب اولوالامر کی اطاعت کے نیچے ہوں گے اور نیز اگر باقی امت ہی اس خطاب سے مخصوص ہے تو وہ ارباب حل وعقد کون ہیں اور کون معصوم ارباب حل وعقد گزرے ہیں اور موجودہ زمانہ میں کون کون ہیں؟

اگر یہ کہا جائے کہ ہر دور کے ارباب حل وعقد اگرچہ انفرادی طور پر ہر ایک غیر معصوم ہوتا ہے لیکن ان کا متفق عام حکم واجب الاتباع ہوتا ہے پس ان کا متفقہ فیصلہ ہی اولوالامر کا مصداق ہے جیسا کہ فخر الدین رازی بھی اسے اجماعی فیصلہ کی حجیت کو دلیل بنا رہا ہے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ جب انفرادی طور پر ارباب حل وعقد میں سے

اسے اجماعی فیصلہ کی حجیت کو دلیل بنا رہا ہے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ جب انفرادی طور پر ارباب حل وعقد میں سے ہر ایک سے غلطی کا امکان ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ چند غلط کاروں کا مجموعی اتفاقی فیصلہ کیسے عصمت کی صفت سے متصف ہو سکتا ہے؟ اور مشاہدہ حال جتلاتا ہے کہ ارباب حل وعقد کا فیصلہ جو آج ہوا ہے کل وہی ارباب حل وعقد اپنے فیصلہ کے خلاف ہو رہے ہیں کیا عصمت اسی کا نام ہے؟

اگر تاریخ وحدیث کا جائزہ لیا جائے تو اسلام کے دور اول میں صحابہ کرام کے فیصلوں میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکا چنانچہ گزشتہ ابحاث میں گزر چکا ہے حضرت ابن عباس حضرت ابن مسعود اور حضرت علی علیہ السلام وغیرہ جواز متعہ کے قائل تھے اور حضرت عمر نے اس کے حرمت کا اعلان فرمایا۔ ماہ رمضان کی تراویح حضرت ابو بکر کے زمانہ میں باجماعت نہیں تھیں اور حضرت عمر نے ان کو باجماعت پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اور اس قسم کے ہزاروں مسائل ہیں۔ جن میں صحابہ کو باہمی طور پر اتفاق نہ تھا پھر یہی اختلاف فتاوئی تابعین اور تبع تابعین میں چلا آتا رہا اور آئمہ اربعہ حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد بن حنبل اور حضرت امام مالک اور اس کے دور کے باقی مفتیان کے فتاوئی کا جائزہ لیجئے بہت کم ایسے مسائل ہوں گے جن میں آئمہ کا اختلاف نہ ہو بلکہ میرے خیال میں تو ہر مسئلہ اختلاف کا شکار ہے تو دریں صورت ارباب حل وعقد کی اطاعت کیسے ہوگی اور ان کے فیصلہ پر عصمت کا لیبل کس طرح چسپاں ہوگا؟

ہاں یہ سب کچھ نتیجہ ہے رسولؐ کی وصیت کو بھلا دینے کا اور اہل بیت عصمت کو پیچھے ہٹانے کا اور یقیناً اگر وصیت رسولؐ کے مطابق مسلمانوں نے ثقلین یعنی کتاب اور عترت طاہرہ ہر دو سے تمسک کیا ہوتا تو اس تاریکی میں پھنسنے اور اس خاردار وادی میں الجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اسلام کا شیرازہ منتشر نہ ہوتا۔ حضورؐ نے حجت تمام کر دی:

إِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِی مَا إِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِی

یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے اور اس کی نقل پر شیعہ سنی متفق ہیں۔ ہم نے تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ تفسیر میں بعض عبارتیں درج کر دی ہیں اور اس تمام بحث کے بعد یہ چیز اظہر من الشمس ہے کہ اولوالامر کا مصداق سوائے خاندان عصمت کے اور کوئی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور یہی وہ ہستیاں ہیں جو صفت عصمت سے متصف ہیں اور جن کی عصمت پر آیہ تطہیر خداوند کریم نے بطور مہر ثبت کر دی ہے اور اس آیت مجیدہ میں تمام ایمان والوں کو دعوت دی ہے کہ انہی کی اطاعت کرو اور انہی کو خدا اور رسول کے بعد اپنا حاکم اور مقتدا سمجھو اور جناب رسالتمآبؐ نے مقام خم پر ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں بازو سے پکڑ کر اعلان فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ جو کہ تواتر سے ثابت ہے۔

اولوالامر کا معیار

جن لوگوں کی اطاعت کا حتمی طور پر خدا حکم دے ان کا کوئی معیار ہونا ضروری ہے۔ چونکہ دین اسلام بنی نوع انسان کی دینی و دنیاوی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ پس وہ اولوالامر جن کی اطاعت اللہ کی طرف سے واجب ہو وہ ایسے ہوں جو دین و دنیا کی انسانی کامیابی میں انسان کے پیش رو بن سکیں۔ جناب رسالتمآبؐ چونکہ بنی نوع انسان کے دین و دنیا کے ہر دو شعبوں میں رہبر کامل تھے اور معصوم تھے اور نیز اولوالامر کی اطاعت کو بھی رسولؐ کی اطاعت کے برابر کہا گیا ہے تو گویا اولوالامر رسولؐ کی عدم موجودگی میں رسولؐ کے قائم مقام کے حیثیت سے انسانوں میں فرائض قیادت انجام دینے والے ہوں گے اور جس طرح رسولؐ انسانوں کے رہبر کامل تھے اسی طرح

اولوالامر کو بھی رہبر کامل ہونا چاہیے اور رہبر کامل کے لئے جن جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے وہ اولوالامر میں ہونی ضروری ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انسان بحیثیت شاگرد کے اور رہبر کامل بحیثیت استاد کے ہوں گے۔

سکول کے لڑکے اپنی رہنمائی کے لئے اور کورس میں عبور اور کامیابی کے لئے خود اپنے میں سے کسی کو بحیثیت مدرس منتخب نہیں کر سکتے اور ایسا کرنے کے بعد قطعاً وہ کامیابی کے امیدوار نہیں ہو سکتے اور نہ لڑکوں میں ان کے ارباب حل وعقد یہ فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سب کے سب محتاج ہیں تعلیم حاصل کرنے کے اور قاعدہ ہے کہ فَاقِدُ الشی مُعطی الشی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جس کے پاس ایک شی موجود نہیں وہ اس شے کا دوسرے کے لئے داتا نہیں ہو سکتا۔ پس مدرس سکول کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایک جوہر ہونا اور اس کا ایک معیار ہو جس کے ماتحت وہ ان لڑکوں کی تعلیم وتربیت کے لئے اہل قرار دیا جا سکے۔ اسی طرح بیماروں کے علاج کے لئے ان ہی میں سے ارباب حل وعقد ان کی بیماری کے علاج کے لئے کافی نہیں اور نہ ان کا اجماع کسی صحیح اور کامیاب پروگرام مرتب کرنے پر قادر ہو سکتا ہے بلکہ ان کے علاج کے لئے ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے جو ایک معیار پر فائز ہو۔ علیٰ ہذا القیاس تمام بنی نوع انسان بحیثیت روحانی مریض کے سمجھے یا انسانیت کی صحیح فطری تعلیم کے طالب علم سمجھے جنہیں خدا اور سول کی اطاعت کے بعد اولوالامر کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے اور دین ودنیا کی کامیابیوں کے لئے ان سے درس حاصل کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کا ارشاد ہے۔

بعض جہال کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر اولوالامر سے مراد علی علیہ السلام اور یکے بعد دیگرے ان کی نسل سے آئمہ طاہرین علیہم السلام ہوتے تو خدا نے ان کا نام بیان کر دیا ہوتا۔ یہ بات صرف عقل وفکر کے اندھے ہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب ایک چیز کا معیار

قائم ہو اور ان معیار صفات میں صرف چند افراد ہی امتیازی حیثیت کے حامل ہوں اور پھر کہا جائے کہ فلاں معیار والوں کی اطاعت واجب ہے تو کیا اب بھی کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہے اور کوئی کہہ سکتا ہے کہ نام کیوں نہیں لیا گیا۔ مثلاً جب کہا جائے کہ جس کے پاس ڈاکٹری کی سند ہو علاج کے لئے اس کی طرف رجوع کرو اور پورے ملک میں سند صرف ایک ہی شخص کے پاس ہو تو کیا کسی صاحب انصاف کو کہنے کی مجال ہے کہ اس کا نام نہیں لیا گیا۔ بڑا سوال یہ ہے کہ نشاندہی نہیں کرائی اور نام نہیں لیا گیا۔ کیا جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اس وقت صحابہ کو اس کے مصداق کی تعیین کی ضرورت نہ تھی۔ بلاضرورت امور کے متعلق سوال کرتے تھے۔ مثلاً چاند کیا چیز ہے؟ اور روح کیا چیز ہے؟ وغیرہ تو اولی الامر کی تعیین کے متعلق کیا کسی نے سوال نہ کیا ہوگا کہ ارباب حل وعقد کو اس کے حل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟ ہاں ضرور سوال کیا ہوگا بلکہ کیا تھا اور نشاندہی بھی کرائی گئی تھی۔ نیز خم غدیر کا فرمان اسی سوال کا جواب تھا جو متواتر منقول ہے لیکن چونکہ منشاء کے مطابق نہ تھا اس لئے دبانے کی کوشش ہے اور زبان پر رٹ جاری ہے کہ حضورؐ نے نشاندہی نہیں کرائی لیکن کیا ارباب حل وعقد کی نشاندہی کرائی تھی تو چپ۔ ہاں نشاندہی بھی کرائی تھی نام بھی بتلائے تھے اور معیار بھی بیان کیا تھا لیکن مانے کون؟

قرآن مجید میں اطاعت کے لئے جو خدا کی طرف سے معیار مقرر ہے وہ خدا نے ایک مقام پر اہل اسلام کے متنبہ کرنے کے لئے ذکر فرما دیا ہے۔ چنانچہ طالوت اور جالوت کا قصہ اس کا بین شاہد موجود ہے۔ جب نبی سے استدعا کی گئی کہ ہمارے لئے ایک واجب اطاعت حاکم مقرر کیا جائے تو نبی نے جواب دیا خدا نے اس معاملہ میں طالوت کو منتخب کیا ہے۔ انہوں نے مل جل کر طالوت کے خلاف محاذ قائم کیا اور اس کے انتخاب پر نکتہ چینی کی تو نبی نے معیار انتخاب واضح کر دیا کہ چونکہ وہ علمی اور جسمانی

حیثیت سے ممتاز ہیں، لہٰذا وہی اس عہدہ کے اہل وسزاوار ہیں۔ وہاں بھی ارباب حل وعقد نے اجماع کیا اور نبیؑ سے اپنے اجماعی فیصلہ کے منوانے کی سعی بلیغ کی لیکن نبیؑ نے ان کی ہر بات کو ٹھکرا کر رکھ دیا۔ اس کی تفصیلی بحث تفسیر کی تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔

جب نبی نے کھلے لفظوں ارباب حل وعقد کے اجماعی فیصلہ کو رد کر دیا اور خدائی معیار انتخاب ان کے گوش گزار کر کے انہیں خاموش کر دیا اور خدا نے قرآن مجید میں اس واقعہ کو دہراتے ہوئے نبی کے اس فعل پر نکتہ چینی کرنے والوں کو ندامت کے لہجہ میں یاد فرمایا تو کیا یہ واقعہ خدا نے صرف قصہ خوانی کے طور پر قرآن مجید میں بھرتی کیا ہے اور کیا قرآن کی ہر ہر آیت اور اس کا پیش کردہ ہر مضمون اسلام والوں کی ہدایت کے لئے نہیں؟

اسی پارہ کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں ارشاد ہے:

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (الخ)

یعنی خدا چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں چلائے ان لوگوں کے راستہ پر جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا طالوت کا انتخاب اور ارباب حل وعقد کے اجماع کی تردید اور ندامت پہلے لوگوں کا قصہ نہیں جو ہمارے لئے ایک اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا اعلان ہوتے ہی ملائکہ کا مقدس اجماع ان کی خلافت کے متعلق بارگاہ رب العزت میں عرض گزار نہیں ہوا تھا۔ جب ان کے سامنے معیار انتخاب پیش کیا گیا اور وہ تھا علم تو ملائکہ نے فوراً اپنا سوال واپس لے لیا تھا اور آدم کے سامنے سربسجود ہو کر اپنی غلطی کی تلافی کی تھی۔ کیا قرآن کے اس قسم کے واقعات سے ہم درس عبرت نہیں لے سکتے کہ اولوالامر کے عہدہ کے لئے بھی وہی معیار

ہونا ضروری ہے جو خدا کی طرف سے واجب الاطاعت انسان کے لئے ہونا ضروری ہے۔ آیت مجیدہ میں چونکہ رسول کی اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم مطلق ہے اور بلا قید ہے یعنی یہ نہیں کہ اگر جائز حکم دیں تو اطاعت کرنا ورنہ اطاعت ساقط ہے جس طرح والدین کی اطاعت کا حکم دیا لیکن پابندی لگادی کہ اگر ان کا حکم خدا کے دین کے خلاف ہو تو اس میں اطاعت ساقط ہے پس اولوالامر کی اطاعت میں یہ قید نہ لگانا اس امر کی دلیل ہے کہ ولی امر معصوم ہوگا ورنہ یہ قید ضرور لگادی گئی ہوتی تو آیت سے ثابت ہوا کہ الوالامر بھی رسول کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔

اسی آیت مجیدہ سے پہلی آیت میں امانتوں کی ادائیگی اور رعایا کے درمیان عادلانہ فیصلے کا حکم ہے جس سے اولالامر کا معیار خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور انداز آیت بتلاتا ہے کہ اس آیت کا مخاطب وہ ہے جس کو حکومت تفویض ہوئی ہے۔ پس اس میں ان صفات کا ہونا از بس ضروری ہے۔

① صفت عدل رکھتا ہو اور یہ صفت کما حقہ، معصوم میں ہی ہو سکتی ہے۔ جس سے غلطی کا امکان نہ ہو۔

② حکم کی نوعیت کو سمجھتا ہو اور خدائی فیصلہ کے ماتحت ان کے درمیان حکم کر سکتا ہو لہذا علم میں کمال رکھنا ضروری ہے۔

③ فیصلہ کرنے میں جرأت سے کام لے سکتا ہو۔ اگر فیصلہ کسی کے خلاف ہو تو اس سے دب کر حق کو چھوڑنے والا نہ ہو پس صفت شجاعت ضروری ہے۔

④ لوگوں کو اس پر اعتماد کلی ہو۔ خائن نہ ہو۔ جبھی تو پہلے امانتوں کے ادا کرنے کا ذکر فرمایا ہے بلکہ خود فیصلہ و حکم کرنا بھی ایک امانت ہے۔

اس آیت کے بعد فوراً حکم دے دیا کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت

کرو اور اولوالامر کی اطاعت کرو تو سیاق آیت صاف بتلاتا ہے اور قرآن مجید میں تھوڑا سا تدبر اور فہم رکھنے والا انسان خود سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اولوالامر سے مراد وہ انسان ہے جو گزشتہ آیت کا مصداق ہوتے ہوئے ان صفات مذکورہ بالا کا حامل ہو۔

صفت عدل کے متعلق آیتِ مباہلہ، آیت تطہیر، آیتِ ولایت اور آیت صلوٰۃ وغیرہ پر مختصر عرض کیا جا چکا ہے کہ امت محمدیہ میں سے سوائے علی علیہ السلام اور اس کی کے بعد دیگرے معصوم اولاد کے کوئی بھی اس صفت سے کما حقہ، متصف نہیں ہے اور صفت امانت خود بخود اس ضمن میں آ جاتی ہے۔

علم کے متعلق تفسیر کی جلد اول یعنی مقدمہ ص ۸۷، ۸۸ میں ہم نے بہت کچھ لکھا ہے جو منصف مزاج انسان کے لئے کافی ہے اور یہاں بھی احادیث کا دھرانا خالی از فائدہ نہیں۔

علامہ نے مسند احمد بن حنبل اور صحیح مسلم سے نقل کیا ہے:

لَمْ یَکُنْ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ یَقُوْلُ سَلُوْنِیْ اِلَّا عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

"جناب رسالت مآبؐ کے صحابہ میں سے سلونی کا دعویٰ کرنے کی کسی کو جرأت نہ تھی سوائے علی بن ابی طالبؑ کے اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

اس پر فضل بن روز بہان جو ایک متعصب انسان گزرا ہے۔ کہتا ہے یہ حدیث حضرت علی علیہ السلام کے کثرت علم پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ کہ حضرت کو وقائع مختلفہ کے جوابات معلوم تھے اور متفرق علوم و معارف پر ان کو اطلاع تھی اور یہ سب باتیں مسلم ہیں لیکن یہ چیزیں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر نص نہیں ہو سکتیں، کیونکہ خلیفہ

کے لئے اعلم ہونا ضروری نہیں بلکہ خلیفہ وہ ہونا چاہیے جو حوزۂ اسلامیہ کو محفوظ رکھ سکے اور امت کے لئے اصلح ہو اور اگر حضرت ابو بکر امت کے لئے اصلح نہ ہوتا تو لوگوں نے اس کو منتخب نہ کیا ہوتا۔

بریں عقل و دانش بباید گریست۔ میں کمزور قول کا جواب نہ دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ سابق قرآنی معیار حکومت کے سامنے اس نظریہ کو رکھ کر صاحبان انصاف خود اندازہ کر لیں کہ عالم کے مقابلہ میں جاہل سے اصلاح کی توقع کیا ہو سکتی ہے اور کیا امت کا ایک بے علم کو انتخاب کر لینا خدائی معیار کو منسوخ کر سکتا ہے۔ حضرت طالوتؑ کے انتخاب پر نظر رکھیں۔ اور امت جن کو چننا چاہتی تھی ان کی ندامت کو بھی ملحوظ رکھیں۔

④ علامہ نے صحیح ترمذی سے نقل کیا ہے:

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

اور بعض روایات میں ہے۔ اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ اس کے نیچے فضل بن روز بہان کہتا ہے: اس میں شک نہیں کہ علی علیہ السلام امت کے علماء میں سے تھے اور لوگ ان کی طرف علم میں محتاج تھے اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ حقائق و معارف اور علم کے پہنچانے میں جناب نبی علیہ السلام کے وصی تھے (لیکن بایں ہمہ وہ خلافت کے حقدار نہیں تھے کیونکہ خلافت کے لئے علم کی ضرورت نہیں)

⑤ سیوطی سے لئالی مصنوعہ میں حاکم سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی اٰدَمَ فِیْ عِلْمِہٖ وَنُوْحٍ فِیْ فَھْمِہٖ وَاِبْرَاھِیْمَ فِیْ حِلْمِہٖ وَیَحْیٰی فِیْ زُھْدِہٖ فِیْ بَطْشِہٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی عَلِیٍّ

"جو دیکھنا چاہے آدم علیہ السلام کو علم میں، نوح علیہ السلام کو فہم میں،

ابراہیمؑ کو حلم میں یحییٰؑ کو زہد میں تو وہ علی علیہ السلام کو دیکھے۔"

اس حدیث کی تردید فضل بن روز بہان جیسے متعصب سے بعید نہیں اس لئے کہ حضرت کی فضیلت اس کی خار ہے اور ہم نے ثابت کیا ہے اپنے مقام پر کہ جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام عالمین کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور انبیاء ہے۔ افضل میں تو ان کا صحیح قائم مقام اور جانشین ہوگا وہ عالمین کا امام ہوگا اور عالمین سے افضل ہوگا۔ مقدمہ تفسیر میں حدیث ثقلین کے بیان میں ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے علاوہ حضرت عمر نے متعدد مرتبہ اعتراف کیا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ اور ابن عباس خیر الامت کا قول ہے:

مَا عِلْمِیْ وَعِلْمُ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ فِی عِلْمِ عَلِیٍّ اِلَّا كَقَطْرَةٍ فِی سَبْعَةِ اَبْحُرٍ

"کہ میرا اور جملہ اصحاب رسالت مآب کا علم حضرت علی علیہ السلام کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا سات سمندروں کے مقابلہ میں ایک قطرہ آب۔"

صفت شجاعت

اسی جلد میں جنگ اُحد کے بیان میں بہت کچھ گزر چکا ہے۔ جنگ خندق میں انہیں کی ایک ضربت کو تمام امت کی یا ثقلین کی عبادت سے افضل قرار دیا گیا اور بروز خیبر حضرت علی علیہ السلام کے متعلق ہی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کو صحیح مسلم بخاری اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے۔

اِنِّیْ دَافِعُ الرَّایَةِ غَدًا اِلٰی رَجُلٍ یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ كَرَّارٍ غَیْرِ فَرَّارٍ لَا یَرْجِعُ حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰهُ لَهٗ

"یعنی کل علم اس مرد کو دوں گا جو اللہ ورسول کا محبّ اور محبوب ہو گا جو کرار غیر فرار ہو گا اور نہ پلٹے گیا جب جب تک کہ خدا اس کو فتح نہ عطا کرے گا۔"

اسی حدیث کے متعلق فضل کہتا ہے: یہ حضرت امیر علیہ السلام کے فضائل میں ایسی فضیلت ہے جس میں اس کا کوئی بھی شریک نہیں اور اس قسم کے اور بھی بہت سے فضائل ہیں۔

احادیث میں سیر کرنے والا اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا خود بخود اس نظریہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام امت محمدیہ میں تمام افراد امت سے افضل تھے۔ اور جملہ صفات کمالیہ میں ان کی نظیر کوئی نہیں تھا۔ بشرطیکہ طبیعت میں انصاف ہو اور حسد وتعصب سے بالاتر ہو کر حقائق کا جائزہ لینے والا ہو، ورنہ اگر دھڑے بندی اور پارٹی بازی کا لحاظ ہو تو حُبُّ الشَّی یَعْمٰی وَیعمُ "یعنی شے کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ کردیا کرتی ہے" کے مقولہ کے ماتحت حق تک رسائی مشکل بلکہ محال ہے اور خصوصاً یہ صفات جو صاحبانِ حکومت الٰہیہ اور اولوالامر کے لئے ضروری ہیں اس کے متعلق خود اکابر صحابہ کے اعترافات موجود ہیں اور متعصب ذہنیت کے لوگ فضل بن روز بہان جیسے بھی انکار نہیں کر سکتے تو اس کے بعد یہ کہنا کہ خدا نے نام نہیں لیا، یا حضرت رسالت مآبؐ نے نص نہیں فرمائی صرف حق سے کنارہ کشی اور حقائق سے روگردانی نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز اسی آیت کا آخری جملہ ہے اگر تم کسی شے میں جھگڑا کرو تو اس کو خدا اور رسولؐ پر رد کرو جو فیصلہ وہ فرمائیں اسی پر عمل کرو اور ہمیں جب اولوالامر کی تعیین میں نزاع ہے کیوں نہ اس کا فیصلہ خدا اور رسولؐ سے کرالیں اور خدا اور رسول کا جب فیصلہ ہو جائے اور وہ صراحتاً بھی فرمائیں اور معیار کے ذریعے سے بھی بتائیں تو پھر ادھر ادھر جانا اور

بہانے تلاش کرنا کیا فائدہ رکھتا ہے؟

اولوالامر کا مصداق حضرت علی علیہ السلام اور ان کی عترت طاہرہ کو اگر قرار دیا جائے جیسا کہ نصوص صریحہ اس پر دوال ہیں تو فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے ایک علمی مظاہرہ کیا ہے اور وہ یہ کہ خدا فرماتا ہے اولوالامر کی اطاعت کرو اور یہ ہے جمع کا صیغہ اور مذہب شیعہ کے نزدیک ایک وقت میں صرف ایک ہی امام ہو سکتا ہے لہٰذا اس لحاظ سے بھی اولوالامر سے مراد مذہب شیعہ کے بارہ امام نہیں ہو سکتے۔

یہ صرف تعصب اور حسد ہی ہے جس کو اگلا جا رہا ہے۔ اس کو عوام بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جب مجموع کی طرف ایک مجموع کا خطاب ہو تو اس سے مراد اپنے متعلقہ افراد ہی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً حکومت وقت کا حکم جاری ہوتا ہے کہ تمام رعایا کو چاہیے کہ افسروں سے تعاون کریں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ ملک کے ہر فرد کے لئے ہر ہر افسر سے تعاون ضروری ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا کہ ہر جگہ کے باشندوں کے لئے اپنے اپنے مقامی افسر سے تعاون کرنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ایک ہی وقت میں ایک مقام پر زیادہ تعداد میں افسر مقرر کئے جائیں تا کہ رعایا کی طرف جمع کا خطاب صحیح ہو بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب ایک تبدیل ہو جائے اور دوسرا آ جائے، پھر تیسرا پھر چوتھا۔ پس رعایا کو اپنے مقامی افسر کی ہر دور اور ہر زمانہ میں اطاعت اور اس سے تعاون کرنا ضروری ہے اور قرآن کریم کا لہجہ کوئی نیا نہیں، بلکہ یہ گفتگو عام عرف کے ماتحت ہے۔ جس طرح فرماتا ہے۔ اگر عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت یہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص ہر عورت کو طلاق دے۔ اگر چہ صیغہ جمع کا ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ اپنی منکوحہ عورت کو طلاق دو تو ان کی عدت یہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے خدا نے اپنی مخلوق کی

ہدایت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر فرد کے لئے وہ سب نبی بیک وقت تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مجموعی طور پر ایسا ہوا ہے ورنہ ہر ہر زمانہ کے لئے الگ الگ نبی تھے۔

خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ

"نمازوں پر محافظت کرو۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب نمازیں اکٹھی پڑھو۔ بلکہ جس نماز کا وقت آتا جائے اسے ادا کرتے جاؤ وعلی ھذا القیاس

اسی طرح یہاں بھی قیامت تک کے لئے جمیع امت کو خطاب ہے کہ اولوالامر کی اطاعت کرو یعنی ہر دور میں واجب الاطاعت امام کی پیروی کرو۔ اور معیار اولی الامر کے متعلق تفصیلی بحث ہماری کتاب اسلامی سیاست میں ملاحظہ فرمائیں۔

اولوالامر کی تعیین

تفسیر برہان میں جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے۔ جب یہ آیت اَطِيْعُوا اللّٰهَ نازل ہوئی تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو جان لیا، لیکن یہ فرمایئے کہ وہ اولوالامر کون ہیں جن کی اطاعت آپ کی اطاعت کے ساتھ مقرون ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ اے جابر! وہ میرے خلفاء ہیں جو میرے بعد مسلمانوں کے امام ہوں گے۔ ان میں پہلا علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ پھر حسن علیہ السلام پھر حسین علیہ السلام پھر علی بن الحسین پھر محمد بن علیؑ جو تورات میں باقر کے لقب سے معروف ہے۔ اے جابر! تو اس کی زیارت کرے گا۔ جب ان سے ملنا تو میرے سلام ان کو پہنچانا۔ پھر جعفر بن محمد صادق پھر موسیٰؑ بن جعفر پھر علی بن موسیٰؑ، پھر

محمد بن علیؑ، پھر علی بن محمدؑ، پھر حسن بن علیؑ، پھر میرا ہم نام اور ہم کنیت محمد ہوگا۔ زمین پر حجۃ اللہ اور مخلوق میں بقیۃ اللہ ہوگا۔ حسن بن علیؑ کا فرزند ہوگا۔ اس کے ہاتھوں پر خدا مشرق و مغرب کی فتح نصیب کرے گا۔ جو کافی عرصہ اپنے شیعوں اور دوستوں سے غائب ہوگا اور اس کی غیب کے زمانہ میں اس کی امامت کے اقرار پر وہی ثابت قدم رہے گا۔ جس کا دل ایمان کے لئے امتحان کی کسوٹی سے پورا اُتر گیا۔ جابر کہتا ہے: میں نے عرض کی: حضور! اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کے وجود سے شیعوں کو کچھ فائدہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ جس نے مجھے برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اس کی قسم شیعہ اس کے نور سے روشن ہوں گے اور اس کی تولا سے نفع مند ہوں گے جس طرح سورج بادل میں آکر مخلوق خدا کو نفع پہنچایا کرتا ہے۔

نیز ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے اسی آیت مجیدہ کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا: یہ آیت حضرت علی علیہ السلام، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے حق میں اُتری ہے۔ میں نے عرض کی: حضور! لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے علی علیہ السلام اور اہل بیتؑ کا نام کیوں نہیں لیا۔ آپ نے فرمایا: خدا نے نماز کا حکم دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کی رکعت تین ہیں یا چار۔ پس جناب رسالت مآبؐ نے ہی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اسی طرح زکوۃ کا خدا نے حکم دیا اور یہ نہیں کہا کہ چار درہموں میں سے ایک دیا جائے تو رسالت مآبؐ نے تفصیل بیان کی۔ اسی طرح آیت اَطِیْعُوا اللّٰہ اتری اور جناب رسالت مآبؐ نے بیان فرمایا کہ یہ علی، حسن اور حسین علیہم السلام کے حق میں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اور نیز فرمایا میں تم کو کتابِ خدا اور اہل بیت علیہم السلام کی وصیت کرتا ہوں اور خدا نے میری دعا کو مستجاب فرمایا۔ پس یہ دونوں جدا نہ ہوں گی اور تمھیں

حوضِ کوثر تک میرے پاس پہنچائیں گے اور پھر حدیث کسا کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت علیہم السلام کی بھی تعیین فرمادی تا کہ آل فلاں اور آل فلاں اہل بیت ہونے کا دعویٰ نہ کردیں۔ چنانچہ (اہل بیت علیہم السلام کی عصمت پر نص آیتِ تطہیر نازل ہوئی۔ پس علی علیہ السلام سب سے اولیٰ تھے اور ان کے بعد امام حسن علیہ السلام اور پھر امام حسین علیہ السلام اور ان کے بعد ان کی اولاد یکے بعد دیگرے اور اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ کی تاویل جاری رہی۔ حدیث طویل تھی میں نے اختصار کے پیش نظر اس کا خلاصہ عرض کردیا ہے۔ اسی مضمون کی احادیث بکثرت موجود ہیں ان میں سے بعض مقدمہ تفسیر میں بھی ذکر کی جا چکی ہے یہاں تک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اولوالامر سے مراد حضرت علی علیہ السلام کی عترت طاہرہ ہے جو یکے بعد دیگرے عہدہ امامت پر فائز ہیں اور سب کے سب گناہان صغیرہ وکبیرہ سے پاک ومعصوم ہیں اور اس وقت اس آیت مجیدہ کا مصداق حضرت ولی عصر صاحب الزمان عجل اللہ فرجہ، علیہ السلام موجود ہیں جو ہماری آنکھوں سے غائب ہیں جب اللہ کا حکم ہوگا وہ ظہور فرمائیں گے، اور دنیا کو عدل وانصاف سے پر کریں گے جس طرح کہ جور وستم سے پر ہو چکی ہے۔

اللھم عجل فرجہ واجعلنا من انصارہ

تنبیہ: اس آیت مجیدہ کو بعض ذاکر وواعظ پیش کر کے اس سے ثابت کرتے ہیں کہ اہل بیت طاہرین خالق ہیں۔ ان کا استدلال اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ خدا نے ان کو اولوالامر کہا ہے اور خدا نے اپنے امر کی تعریف کی ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

یعنی خدا کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی کے متعلق ارادہ کرے کہ ہو جا تو وہ چیز جایا

کرتی ہے جب خدا نے کہہ دیا یعنی امر کے مالک تو کُن کہنے والے یہی ہیں، اور انہی کے ارادہ اور امرِ کن سے مخلوق پیدا ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

خداوند کریم ایسے عقیدہ رکھنے والوں کو ہدایت کرے جو مذہب امامیہ حقہ، کو بدنام کرنے در پے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ خدا کا امر تکوینی ہے اور امر تکوینی کا تعلق ذات آمر سے ہی ہوا کرتا ہے اور اہل بیت علیہم السلام کو جس امر کا اختیار دیا گیا وہ امر تشریعی ہے ہاں اولوالامر میں الامر چونکہ مطلق ہے اس لئے ان کو یہ اشتباہ ہوا ہے لیکن یہ ان کی لاعلمی اور دریدہ ذہنی ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ امر تکوینی کبھی قابل نیابت ہو سکتا ہی نہیں اور جو امر قابلِ نیابت ہے وہ صرف امر تشریعی ہے۔ امر تکوینی کا نا قابل نیابت ہونا ہی اس کا مقید ہے۔ لہٰذا علیحدہ قید لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ چونکہ ایک علمی بحث ہے پھیلانا ناظرین کتاب کے لئے الجھن کا باعث ہوگا۔ لہٰذا اس مسئلہ کو یہیں ختم کرتا ہوں اور واعظین وذاکرین کرام کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے عقائد کو مضبوط کریں اور چاہت دنیا اور اس کے عارضی مفاد کی خاطر قرآن سے نظریہ نہ خود قائم کریں نہ عوام کے عقائد کو تباہ کریں۔ خدا ہر شے کا خالق و مالک ہے اور محمدؐ وآل محمدؐ اس کی مخلوق میں سے افضل و برتر مخلوق ہیں اور اس کی جانب سے تمام کائنات کے حاکم ہے۔ ان کی ولا موجب جنت اور ان سے عداوت موجب جہنم ہے اور یہی شیعہ عقیدہ ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳ ص ۱۹۸،۸۶)

رَّحِيْمًا ○ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

"اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان ایسا نہیں تیرے رب کی قسم یہ لوگ

ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک تیری حکومت نہ مانیں اپنے باہمی جھگڑوں
میں پھر نہ محسوس کریں اپنے دلوں میں تنگی اس سے جو تو فیصلہ کرے اور
تسلیم کریں جس طرح تسلیم کا حق ہے۔"

معیارِ ایمان

فلا و ربک یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ طاغوت کی طرف فیصلہ بھی لے جائیں اور اس کو حاکم بھی تسلیم کریں اور ان کا دعویٰ ایمان بھی سچا ہو، بلکہ ایمان دار نہیں ہو سکتے، جب تک آپ کی حکومت کو تسلیم نہ کریں۔

تفسیر برہان میں قمی سے منقول ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ وہ لوگ جنہوں نے علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے خلاف باہمی معاہدے کئے ہوئے تھے یہ آیت انہی کے متعلق ہے کہ وہ ایمان دار نہیں ہو سکتے جب تک کہ باہمی مشاجرات یعنی اختلافی امور میں آپ کی حکومت کو تسلیم نہ کریں اور علی علیہ السلام کی ولایت کے متعلق جو کچھ آپ فیصلہ فرما چکے ہیں اس کو دل و جان قبول نہ کرلیں اور ولایت علی علیہ السلام کو اس طرح تسلیم کریں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے۔

اُصول کافی سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر ایک قوم اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت گزار ہو نمازیں پڑھنے والے، حج کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنے والے ہوں لیکن خدا یا اس کے رسولؐ کے کسی فیصلہ پر یہ کہہ دیں کہ ایسا کیوں کیا؟ بلکہ اس طرح کرنا نہیں چاہیے تھا یا اپنے دلوں میں بوجھ تنگی محسوس کریں تو یہ لوگ مشرک شمار ہوں گے۔ پھر آپ نے اپنے صحابہ سے متوجہ ہو کر فرمایا۔ تسلیم کو نہ چھوڑنا۔

تنبیہ: جس طرح جناب رسالت مآبؐ کے ہر فیصلہ پر کیوں کرنا یا اس سے

دل تنگی انسان کو ایمان سے خارج کر دیتی ہے اسی طرح ان کے بعد ان کے حقیقی خالق یعنی آئمہ طاہرین علیہم السلام کے فیصلہ کے اوپر نکتہ چینی یا ان کے کسی فرمان پر دل کی کڑھن وغیرہ ایمان کی علامت نہیں بلکہ یہ منافی ایمان ہے اور اسی کو معصوم علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ کہ شرک میں داخل کرتی ہے تبھی تو صحابہ کو تاکید کی کہ خبردار! تم تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ ہمارے عوام میں یہ مرض عام ہے کہ جب ان کو کسی مسئلہ میں الجھن پیدا ہوتی ہے یا نفس امارہ کسی بات کو نہیں مانتا تو وہ آئمہ کے فیصلہ پر اعتراض کرتے ہیں اور آئمہ کے فیصلہ کو خلاف عقل کہنے پر تل جاتے ہیں حالانکہ ہماری عقول کی مجال نہیں کہ مسائل شرعیہ کے تمام مصالح کو سمجھ سکیں اور نہ ان پر ضروری ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کو ہر شخص کے سامنے بیان کرتے رہیں نے مناسب سمجھا، صرف حکم کو بیان فرمایا اور وجہ بیان نہ کی۔ بہر کیف مومن کا کام ہے تسلیم کرنا۔ پس جہاں ہمارے عقول ان کی مصلحت سمجھنے سے قاصر ہوں تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ حکم خلاف عقل ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ حکم شرعی مطابق عقل ضرور ہے لیکن مری عقل اس کی مصلحت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء:٦٦)

تفسیر مجمع البیان میں اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم ان پر اپنے نفسوں کا قتل اور گھروں سے جلاوطنی کا حکم صادر کرتے جیسے قوم موسیٰ پر کیا تھا اور انہوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے نفسوں کو قتل کیا اور گھروں کو چھوڑ گئے تھے تو ان لوگوں سے یہ امید نہیں کہ عمل کریں سوائے چند لوگوں کے اور وہ جناب رسالت مآبؐ کے صحابہ کی ایک جماعت تھی جنھوں نے کہا تھا کہ اگر ہمیں ایسے سخت احکام دیئے جائیں تو ہم ماننے کو تیار ہیں اور اللہ کی حمد ہے کہ اس نے ہمیں اس قسم کی سخت آزمائش میں رکھا۔

تفسیر برہان میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے متعلق وَلَوْ اَنَّهُمْ

فَعَلُوْا یعنی اگر وہی کرتے جو انہیں کہا گیا ہے یعنی ولایت علیؑ کے بارے میں تو ان کے لئے خوب ہوتا اور امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ امام کی تسلیم میں انہیں حکم دیئے جائیں تو سوائے چند آدمیوں کے کوئی بھی نہ مانے گا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۲۰۲، ۲۰۳)

خلقت نوری کی تفصیل

روایت مذکورہ میں انس کہتا ہے کہ جب آپ آیت کے الفاظ کے مصداق بیان کر چکے تو آپ کے چچا حضرت عباس جو حاضر مجلس تھے اور کھڑے ہوئے تھے اور حضورؐ کے قریب آ کر سامنے بیٹھ گئے۔ پھر عرض گزار ہوئے۔ حضورؐ کیا میں اور آپ اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ اور حسینؑ سب ایک درخت سے نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا اس سوال کا مطلب عباس نے عرض کی: حضور! صرف علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی ہی تعریف فرما رہے ہیں؟ حضور ہنس پڑے اور فرمایا یہ درست ہے کہ ظاہری خلقت میں ہم ایک درخت سے ہیں۔ لیکن عم بزرگوار! خدا نے مجھے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے خلق فرمایا: جب نہ آسمان کی بناء تھی نہ زمین کا فرش، نہ ظلمت تھی نہ نور اور نہ جنت تھی نہ نار اور نہ شمس و قمر تھے۔ پس عباس نے خلقت نوری کی تفصیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا: جب اللہ نے ہماری تخلیق کا ارادہ فرمایا تو پہلے نور کو پیدا کیا اور پھر روح کو خلق فرمایا اور ان دونوں کو ملا کر مجھے اور علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو پیدا کیا۔ پس ہم اس وقت تسبیح گزار تھے جب تسبیح نہ تھی اور اس وقت ہم اس کی تقدیس کرنے والے تھے جب تقدیس نہ تھی (تقدیس کرنے والا کوئی نہ تھا) پس جب مخلوق کو خلق فرمایا چاہا تو میرے نور سے عرش کو پیدا کیا۔ پس عرش کا نور میرے نور سے ہے لہٰذا میرا نور عرش سے افضل ہے پھر علی علیہ السلام کے نور سے ملائکہ کو خلق فرمایا۔ پس علی کا نور ملائکہ کے نور سے ہے اور علی کا نور اللہ کے نور سے ہے لہٰذا فاطمہؑ آسمانوں اور زمین

سے افضل ہے۔ پھر حسنؑ کے نور سے حسنؑ کے نور سے شمس وقمر پیدا ہوئے۔ پس حسنؑ کا نور شمس وقمر کے نور سے ہے لہٰذا حسنؑ شمس وقمر سے افضل ہے۔ پھر حسینؑ کے نور سے جنت اور حورالعین کو پیدا کیا تو جنت وحور حسینؑ کے نور سے ہیں اور حسینؑ اللہ کے نور سے ہے لہٰذا حسینؑ جنت وحور سے افضل ہے۔ پھر ظلمات کو حکم دیا کہ چھا جائیں چنانچہ آسمانوں میں تاریکی چھا گئی اور ملائکہ تسبیح وتقدیس کے ذریعہ سے بارگاہ رب العزت میں انکساری سے عرض گزار ہوئے: اے ہمارے الہٰ وسید! جب سے تو نے ہمیں خلق فرمایا اور ان پاک وانوار کی معرفت عطا کی تو آج تک ہم نے یہ مصیبت نہیں دیکھی۔ پس ان پاک انوار کے واسطہ سے اس ظلمت کو دور فرما۔ پس خدا نے نور فاطمہؑ سے ایک قندیل نور کو ظاہر کر کے زیر عرش آویزاں کیا جس سے آسمان وزمین منور ہو گئے اور اسی لئے اس کو زہراؑ کہا جاتا ہے ملائکہ نے عرض کی: پروردگار! یہ نور ظاہر کس کا ہے جس سے زمین وآسمان روشن ہو گئے۔ وحی ہوئی کہ یہ نور میں نے اپنے نور جلال سے خلق فرمایا ہے۔ میری کنیز جو میرے حبیب کی دختر میرے ولی کی زوجہ اور میرے برگزیدہ آئمہ کی ماں ہے اس کا نور ہے اور تمہیں شاہد بنا کر کہتا ہوں: اے ملائکہ! تمہاری تمام تسبیح وتقدیس کا ثواب اس پاک بی بی اور قیامت تک کے اس کے شیعہ ومحب لوگوں کے لئے ہوگا۔ پس جب یہاں تک پہنچے تو عباس اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت علی علیہ السلام کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہنے لگے: یا علیؑ خدا کی قسم خدا اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تو ہی حجت بالغہ ہے۔

تنبیہ: ادائے امانت والی آیت کے بعد کی تمام آیات کا تسلسل اور روانی بتلاتی ہے کہ ان آیات میں اولوالامر کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں تسلیم کی تائید کی گئی ہے جیسا کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے فرامین تائیدی طور پر پیش کئے جا

چکے ہیں۔ ہاں بعض آیات کے شان نزول کے خصوصی واقعات آیات کو انہی موارد پر بند نہیں کر سکتے، کیونکہ قرآن تا قیامت زندہ ہے اور اس کے مصادیق تا قیامت موجود ہونے ضروری ہیں۔ اسلوب قرآن سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ ان آیات میں ایسی چیز کے متعلق پر زور تاکید کی گئی ہے جس کے ماننے سے دعویٰ ایمان کرنے والے کتراتے تھے اور ان کے دلوں میں کڑھن پیدا ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ نماز، روزہ، حج اور جملہ واجبات ومحرمات میں مومنین نے کبھی جی نہیں چرایا تھا اور خدا نے ان جی چرانے والوں کو منافق کے خطاب سے بھی ذکر کیا اور رسولؐ کو ان کی تفہیم کا بار بار ارشاد فرمایا اور آخر کار کھلے لفظوں میں فرمایا کہ تمہارا ایمان ہرگز قابل قبول نہیں، جب تک رسولؐ کے فیصلہ کو دل وجان قبول نہ کر لو گے، یہاں تک کہ تمہارے نفسوں پر ان کا بوجھ تک نہ رہے اور کتب سیر وتاریخ صاف بتلاتی ہیں کہ وہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی خلافت تھی جس کا آپ وقتاً فوقتاً اعلان فرماتے تھے اور آخر نتیجہ وہی ہوا جس کی پیشین گوئی قرآن کر رہا ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۴، ۲۰۳)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ .... ۔ (النساء، آیت: ۷۷)

اَلَمْ تَرَ جب مکہ میں قریش کے ظلم سے مسلمان تنگ آتے تھے تو جناب رسالت مآبؐ سے درخواست کرتے تھے کہ ہمیں جہاد کا حکم دیجئے اور آپ انہیں نماز و زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے ابھی جنگ کا حکم نہیں آیا جب یہاں سے ہجرت کر کے مدینہ میں پہنچے اور بدر کی لڑائی کا حکم ہوا تو پھر کہنے لگے جہاد کیوں فرض ہو گیا ہے، ابھی کچھ اور مہلت دی جاتی تو اچھا تھا۔

شانِ نزول خواہ کچھ ہو آیت قیامت تک چلے گی اور اس پر عمل کرنے والے قیامت تک ہوں گے۔ اور ہر ہر زمانہ میں ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں جن کو یہ آیت تنبیہ

کرتی چلی جا رہی ہے۔ اسی بناء پر تفسیر برہان میں متعدد روایات ہیں جن میں اس کا مصداق امام حسین علیہ السلام کے زمانہ والوں کو قرار دیا گیا جب کہ جہاد ان پر فرض تھا لیکن کوتاہی کر گئے۔

ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تم راضی نہیں ہو کہ نماز ادا کرو اور زکوۃ دو اور اپنی زبانوں کو محفوظ رکھو اور ان کے نتیجہ میں جنت پہنچو اپنے موالیوں کو خطاب کر کے فرمایا خدا کی قسم اس آیت کے اہل تم ہو۔

تفسیر صافی میں عیاشی سے منقول ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے زمانہ میں لڑائی سے ہاتھ روکنے کا حکم ہوا، اور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جہاد کا حکم ہوا اور آیت مجیدہ کے وہ لوگ بھی مصداق ہیں۔

تنبیہ: عوام کو دھوکا میں ڈالنے کے لئے شاہ عبدالقادر نے كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ کا ترجمہ کیا ہے اپنے ہاتھ بند رکھو اور قائم کرو نماز۔ تھانوی نے ترجمہ کیا ہے اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو اور نمازوں کی پابندی رکھو۔

تا کہ جہال تحت اللفظی ترجمہ دیکھ کر یہ سمجھیں کہ قرآن مجیدہ میں نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم دیا ہے حالانکہ بالکل غلط ہے بلکہ بہتان عظیم ہے اور اہل سنت کے مفسرین ملا فخر الدین رازی اور بیضاوی وغیرہ نے صاف لکھا ہے کہ اس سے مراد جنگ سے ہاتھ روکنا ہے اور نماز و زکوۃ کی پابندی کرنا ہے۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۴، پارہ ۵، ص ۲۰۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا

(النساء: ۹۴)

"اے ایمان والو! جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کرو اور نہ کہو جو شخص۔"

تفسیر مجمع البیان میں ہے (کہ ایک شخص نے اسامہ کو) اسلام کے اظہار کے ساتھ ان کو سلام بھی دیا تھا اور قرآن مجید اس کی حکایت کر رہا ہے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو لڑائیاں در پیش آئیں تو اسامہ نے اپنی قسم کا عذر پیش کر کے علیحدگی اختیار کی تھی۔

محدث فیض رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت اسامہ کے نفاق کا پتہ دیتی ہے جبھی تو حضرت علی علیہ السلام سے علیحدہ رہا۔

علامہ طبرسی بھی فرماتے ہیں کہ اسامہ کا یہ عذر نا قابل قبول ہے، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ امام کی اطاعت واجب ہے جب کہ رسول خداؐ سے سن چکا تھا۔

حَرْبُكَ يَا عَلِيُّ حَرْبِيْ وَسِلْمُكَ سِلْمِيْ

''یا علیؑ تیری جنگ میری جنگ اور تیری صلح میری صلح ہے۔''

تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۵، ص ۲۲۵

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِيْنَ خَصِيْمًا۔ (النساء، آیت: ۱۰۵)

''ہم نے اتاری آپ پر کتاب ساتھ حق کے تاکہ آپ حکم کریں لوگوں میں ساتھ اس کے جو اللہ نے آپ کو رائے زنی کی قوت دی ہے۔''

تفسیر برہان میں منقول ہے موسیٰ بن اشیم کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملاقات کے لئے وقت طلب کیا اور آپ نے میری استدعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے میرے ساتھ ایک دن کا وعدہ کیا۔ پس وعدہ کے مطابق جب میں حاضر ہوا تو جو کچھ پوچھنا تھا پوچھا۔ اسی اثناء میں ایک شخص نے دروازہ پر دستک دی۔ آپ نے فرمایا: دیکھو دروازہ پر کوئی ہے۔ میں نے عرض کی: حضور! میں فارغ ہو چکا

ہوں۔ جیسا مناسب ہو آپ کریں۔ آپ نے اس کو اندر آنے کی اجازت دی۔ ایک شخص آ کر بیٹھ گیا اور وہ مسائل دریافت کیے جو میں ابھی کر چکا تھا۔ آپ نے جواب اس کو میرے جواب کے خلاف دیا۔ یہ سنتے ہی میری طبیعت میں اس قدر اضطراب پیدا ہوا کہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ وہ شخص فارغ ہو کر چلا گیا اور تھوڑی دیر گزری کہ اور شخص آ گیا۔ آپ نے اس کو اجازت دی وہ ایک گھنٹہ بیٹھا۔ اور وہی مسائل پوچھنے لگا جو ہم دونوں پوچھ چکے تھے تو آپ نے اس کو پہلے دو جوابوں کے علاوہ جواب دیا اور میرا غم واضطراب پھر اور زیادہ بڑھ گیا۔ اور قریب تھا کہ میں کافر ہو جاؤں۔ پس وہ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد تیسرا آدمی آ پہنچا اور اس نے بھی بعینہٖ وہی مسائل دریافت کیے تو آپ نے اس کو پہلے تمام جوابوں کے علاوہ جواب دیا۔ پس میرے اضطراب کی کوئی حد نہ رہی اور مجھ پر دنیا تاریک ہو گئی۔ جب آپ نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور میرا اضطراب ملاحظہ فرمایا تو میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے: اے ابن اشیم! خدا نے ابنِ داؤد کو ملک تفویض فرمایا تھا اور ارشاد ہوا تھا:

هٰذَا عَطَآءُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

اور تحقیق اللہ سبحانہ، نے جناب محمد مصطفیؐ کو دین کے معاملات تفویض فرمائے اور ارشاد ہوا: لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ اور خدا نے ہمیں وہی کچھ سپرد کیا جو اس نے اپنے رسولؐ کو سپرد کیا تھا مقصد یہ ہے کہ نبی اور امام کا کام ہے مصلحت دیکھ کر ان کے درمیان حکم کریں جس طرح کہ ڈاکٹر ایک ہی بیماری کے مریضوں کو ان کے مزاج اور ماحول کے مطابق دوا اور پرہیز بتلاتے ہیں۔ اسی طرح نبی و امام جو روحانی حکیم ہیں ماحول اور مزاج کو پہچان کر ان کے موافق روحانی علاج کے نسخے تجویز کرتے ہیں۔ (انوار النجف جلد ۴، پارہ ۵، ص ۲۳۹)

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا

(النساء آیت ۱۱۷)

"نہیں پکارتے اس کے سوا مگر مؤنثوں کو اور نہیں پکارتے مگر سرکشوں کو۔"

تفسیر برہان میں عیاشی سے مروی ہے کہ اس شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو سلام یوں دیا السلام علیکم یا امیر المومنین فرماتے خبردار ایسا نہ کہو کیونکہ یہ لقب صرف امیر المومنین سے خاص ہے اور ان کو اللہ نے یہ لقب دیا ہے۔ لہٰذا علی علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص پر یہ لقب لگایا جائے اور وہ اس پر راضی ہو تو یا وہ مفعول ہوگا یا بن جائے گا، کیونکہ خدا فرماتا ہے: إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا پھر راوی نے پوچھا حضرت قائم کو کس لقب سے پکارا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ان کو کہا جائے گا السلام علیک یا بقیۃ اللہ! السلام علیک یا ابن رسول اللہ آیت مجیدہ کے باطن سے معصوم نے کیا خوب نظریہ پیش فرمایا ہے کیونکہ ناحق مسند الوہیت پر بیٹھنے والوں کو خدا نے مؤنث کے خطاب سے یاد کیا ہے اور چونکہ مسند رسالت بھی مسند الوہیت کے قائم مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور اسی وجہ سے خدا نے رسولؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا پس مسند رسالت پر ناجائز قبضہ جمانے والے اسی آیت مجیدہ کی رو سے مؤنث ٹھہرے اور اگرچہ ظاہر وہ مذکر بھی ہوں لیکن ان میں اس صفت خصوصی کا پایا جانا ضروری ہے جو مؤنث کے شایان شان ہے۔ پس اسی آیت کے ماتحت آپ نے فرمایا کہ جو بھی اپنے آپ کو امیر المومنین کہلوانے پر رضا مند ہوگا وہ مفعول ہوگا اور واقعات تاریخ معصوم کے اس فرمان کی تصدیق کرتے ہیں جن کی تفصیل کا اس جگہ محل نہیں۔

(تفسیر انوار النجف جلد ۳، پارہ ۵، ص ۲۳۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (النساء آیت ۱۳۶)

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر۔"

منافقوں کا ذکر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ: اس آیت مجیدہ کے معنی میں تین قول نقل کیے گئے ہیں لیکن جس کو صاحب مجمع البیان نے صحیح قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو صرف زبانی طور پر ایمان کا دعوئی کرتے تھے اور حقیقت ایمان سے ان کے دل ناآشنا تھے چنانچہ بعد والی آیتوں کا ارتباط بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مصداق منافق لوگ ہیں جن کا قول نہ ان کے دل کے مطابق اور نہ عمل کے موافق ہے کیونکہ ملت اسلامیہ کو چھوڑ کر ملت کفر کو اختیار کرنا اور پھر مسلمان ہونا اور پھر کافر ہونا یہ طرز عمل قطعاً ایسی لوگوں سے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا جن کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا ہو۔

نَزَّلَ: تنزیل تدریجی نزول اور انزال دفعی نزول کے لئے استعمال ہوا کرتا ہے اسی لئے قرآن کے لئے نَزَّلَ اور کتب سابقہ کے لئے اَنْزَلَ کا لفظ استعمال ہوا اور تفسیر کی تیسری جلد ص ۱۱۰ انوار علیہ میں دوسرے نمبر پر اس مطلب کو ذکر کیا جا چکا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ بعض لوگوں نے اس سے مراد یہود و نصاریٰ لئے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر کافر ہوئے اور پھر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور کافر ہوئے اور جناب رسالت مآبؐ پر ایمان نہ لانا ان کی زیادتی کفر ہے لیکن یہ معنی قطعاً بے جوڑ ہے اور اسلوب قرآنی کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت مثل سابق کے منافقوں کے حق میں اتری جو صرف زبان پر دعوئی ایمان رکھتے تھے اور ان کے دل کفر سے بھرپور تھے۔ تفسیر برہان اور صافی میں اہل بیت عصمت سے مروی ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں ہے جو پہلے ایمان لائے اور جب ولایت امیر علیہ السلام کا بروز غدیر بالفاظ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ اعلان ہوا تو انکاری ہوئے پھر ظاہری بیعت کر کے اور

بُخ بُخ کے الفاظ جاری کر کے ایمان کا اظہار کیا لیکن وفات رسولؐ کے بعد انکار پر ڈٹ گئے اور اس میں زیادتی کرتے گئے اور ایمان سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک روایت میں معصوم علیہ السلام نے فرمایا: اس آیت کے مصداق وہ لوگ ہیں جو شراب کی حرمت پر ایمان لائیں اور پئیں اسی طرح زنا کی حرمت پر ایمان لائیں اور پھر خود زنا کریں اور زکوٰۃ کے وجوب پر ایمان لائیں لیکن ادا نہ کریں۔ بہرکیف تاویل کا دائرہ وسیع ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور معصوم نے آیت کے بعد مصداق کی بطور مثال نشاندہی فرمائی ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۴، پارہ ۵، ص ۲۵۶)

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ ظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَ لَا لِیَہۡدِیَہُمۡ طَرِیۡقًا

"تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں اور بخشے گا ان کو اور نہ ہدایت کرے گا کسی راہ کی۔"

اِنَّ الَّذِیۡنَ: تفسیر برہان اور صافی میں کافی و عیاشی سے مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ ظلموا کے بعد آلِ محمدؑ کی لفظ لے کر جبرائیلؑ اترا تھا اور مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے کفر کیا اور آل محمدؑ پر ظلم کیا ان کو خدا کبھی نہیں بخشے گا۔

یَا اَیُّہَا الَّذِیۡنَ قَدۡ جَآءَکُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ

"اے لوگو! تحقیق آیا تمہارے پاس رسولؐ برحق تمہارے رب کی طرف سے۔" (النساء آیت ۱۷۰)

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ یہاں حق سے مراد دین ہے اور امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ حق سے مراد ولایت ہے اس کی جس کی ولایت کا حکم خدا نے دیا ہے۔

بہرکیف حق سے مراد جو بھی جناب رسالت مآبؐ کی حدیث صحیح موجود ہے جو

مسلم میں الفریقین ہے عَلی مَعَ الْحَقِ وَالْحَقِ مَعَ عَلی

علامہ حلی نے کتب جمہور سے نقل فرمایا ہے کہ حضورؐ نے عمارؓ کو فرمایا: اے عمارؓ ! میری امت میں تلوار چلے گئی اور تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ اے عمارؓ جو تلوار لے کر علی علیہ السلام کی امداد کرے گا خدا بروز قیامت اس کے گلے جنت کے موتیوں کے دو ہار ڈالے گا اور جو علی علیہ السلام کی دشمنی میں تلوار اُٹھائے گا تو اُس کے گلے میں جہنم کے دو طوق ڈالے جائیں گے پس جب یہ تلوار چلے تو علیؑ کا دامن نہ چھوڑنا اور اگر ساری دنیا علی علیہ السلام کو چھوڑ جائے تو اس راہ پر چلنا جس پر علی علیہ السلام ہو کیونکہ اس کی اطاعت میری اطاعت ہے۔ علیؑ حق کے ساتھ ہوگا۔

اللھم ادر الحق معه حیث دار: پس معلوم ہوا کہ علیؑ سے تمسک کے بغیر حق نہیں مل سکتا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۳، ص ۱۷۱)

• یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء، آیت: ۱۷۴)

"تمہارے پاس برہان اپنے رب سے اور نازل کیا ہم نے تمہاری طرف نور مبین۔"

نور اور برہان

یٰاَیُّهَا النَّاسُ: آیت مجیدہ میں برہان سے مراد جناب رسالت مآبؐ ہیں کہ ان کے معجزات قاہرہ اور علامات باہرہ دین اسلام کی حقانیت کے لئے برہان کی حیثیت سے تھے اور بعض لوگوں نے برہان سے مراد قرآن مجیدہ لیا ہے اور نُوْرًا مُّبِیْنًا کے مصداق میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے تو ان کے نزدیک برہان سے مراد پھر حضور رسالت مآبؐ ہی ہوں گے اور اگر برہان سے مراد

قرآن ہو تو نور مبین سے مراد بھی رسالت مآبؐ کو ماننا پڑے گا، اکثر مفسرین اسی پر ہیں کہ برہان سے جناب رسالت مآبؐ اور نور مبین سے قرآن مراد ہیں۔ تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ برہان سے مراد حضرت محمدؐ اور نور سے مراد حضرت علیؑ ہے اور صراط مستقیم سے بھی علی علیہ السلام ہی مراد ہے اور تفسیر قمی سے منقول ہے کہ نور سے مراد امامت حضرت امیرؑ ہے اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الخ)

اس آیت مجیدہ کے مصداق وہ لوگ ہیں جو حضرت علی علیہ السلام اور باقی آئمہ معصومین کی امامت سے تمسک رکھتے ہیں اور اگر عامہ مفسرین کی تفسیر کو لیا جائے کہ برہان سے مراد جناب رسول خداؐ اور نور سے مراد قرآن تو چونکہ خطاب تمام لوگوں کے لئے ہے اور قرآن و اسلام قیامت تک کے لئے ہیں تو آیت مجیدہ کا خطاب قیامت تک کی آنے والی نسلوں سے بالعموم ہو گا۔ پس جس طرح نور مبین سے مراد قرآن ہے اور وہ قیامت تک زندہ ہے تو برہان سے مراد بھی وہ شخصیت ہو گی جو تا قیامت قرآن کے ساتھ ہو تا کہ تا قیامت تمام لوگوں کے لئے خطاب درست ہو اور اس مطلب کو حدیث ثقلین متواتر بین الفریقین ہے۔ واضح کر رہی ہے اور مقصد یہ ہو گا کہ برہان سے مراد ہادی ہے جو ہر دور میں قرآن کے مطالب سمجھتا ہو اور لوگوں تک پہنچاتا ہو۔ پس دور نبوی میں برہان کا مصداق خود رسالت مآبؐ تھے اور ان کے بعد ان کی عترت طاہرہ جسے خود صاف طور پر فرما گئے۔

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ (الحدیث)

اور اگر برہان سے مراد قرآن اور نور سے مراد رسول ہو تو نور کے سلسلہ کو قیامت تک لانا پڑے گا اور ماننا پڑے گا کہ ہر زمانہ میں اس نور کا ایک فرد موجود ہوا کرتا ہے تا کہ قیامت تک کے لوگوں کو ان دونوں سے تمسک کا حکم دیا جا سکے اور دور حاضر میں

اس نور کا مصداق حضرت ولی عصر امام زمانؑ ہے جو پردہ غیب میں ہے عجل اللہ فرجہ۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۴، ص ۴)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ

''اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے (شروع کرتا ہوں)۔ اے ایمان والو! پورے کرو عہد اپنے حلال کیے گئے تمہارے لئے چوپائے جانور مگر وہ جو تمہیں بتائے جائیں گے درحالیکہ کہ نہ حلال جاننے والے ہو۔ شکار کو حالت احرام میں تحقیق اللہ حکم کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

وفائے عہد اور خلافت علی علیہ السلام

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: تاریخ الخلفاء، مسند احمد اور دیگر کتب سے منقول ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نازل ہوا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اس کے امیر و شریف ہیں اور اور خداوند کریم نے متعدد مرتبہ قرآن مجید میں صحابہ کی سر زنش کی ہے لیکن علی علیہ السلام کو ہر جگہ مدح وثنا اور خیر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ پس وہ آیات قرآنیہ جن میں مومنوں کو خطاب کر کے بعد میں ان کو عتاب کیا گیا ہے ان سے حضرت علی علیہ السلام یقیناً مراد نہیں ہیں اور جن جن آیات قرآنیہ کے مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں ان کے بعد تا حضرت قائم آل محمدؐ تمام آئمہ یکے بعد دیگرے ان کے باطنی مصداق ہیں اور باعتبار ظاہر تمام مومنین زمان رسالت سے لے کر تا قیامت ان خطابات میں داخل ہیں۔ تفسیر برہان میں صحیفۂ امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن میں جس جس مقام پر یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وارد ہے وہ ہمارے حق میں ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے جو عرض کیا جا چکا ہے۔ واللہ اعلم

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ: تفسیر برہان میں بروایت علی بن ابراہیم امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا صحابہ سے دس مقامات پر عہد لیا تھا پس خدا اس جگہ فرما رہا ہے۔ اے ایمان والو اپنے عہدوں کی وفا کرو جو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں تم سے لئے جا چکے

ہیں۔ظاہری اعتبار سے مومنین کے جس قدر بھی آپس میں یا خدا اور رسولؐ کے ساتھ عہد ہوں سب کی وفا کا حکم ہے اور ولایت وخلافت کا عہد بھی ان عہدوں میں داخل ہے۔ لہٰذا روایت معصوم میں خلافت علی علیہ السلام کا اس آیت سے مراد ہونا ایک فرد اہم اور مصداق اتم کی نشان دہی ہے۔

توضیح مزید

جس طرح ایک سلطان وقت اپنی تمام رعایا کو اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کا حکم دے تو بالعموم یہ حکم سلطانی تمام رعایا کے افراد پر حاوی ہے لیکن افسران وعہدہ داران بالخصوص اس حکم کے مخاطب ہوں گے اور تمام افسروں وعہدہ داروں پر جو انچارج ومختار عام ہوگا۔وہ جس طرح عنایت سلطانیؒ کے ماتحت اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوکر تمام رعایا سے امتیازی شان کا حامل ہے اسی طرح اس حکم کے خطاب میں بھی وہ سب سے پہلے مراد اور سلطان کا مقصود اعظم قرار دیا جائے گا۔پس سلطان کی طرف سے فرائض کی انجام دہی کا حکم حاوی تو ہے تمام رعایا پر جس میں افسر وماتحت اور عہدہ دار وعوام سب داخل ہیں لیکن فرائض کی تعیین ہر فرد رعایا پر اس کے شان وعہدہ کے موافق ہوگی۔یعنی مملکت کے انچارج ومختار عام کے فرائض میں سے ہے کہ وہ سلطان وقت کی کماحقہ، اطاعت کرے اور ہر وقت اس کی خوشنودی کو ملحوظ رکھے اور اسی کے ماتحت اپنے ماتحت افسران وعہدہ داران کو اپنے فرائض سے متنبہ کرتا رہے اور سلطان وقت کی طرف سے عائد کردہ قوانین کو رعایا میں نافذ کرکے ان کے کاروبار کی صحیح نگرانی کرے تاکہ مملکت کا صحیح نظم ونسق بحال رہے اور رعایا بھی خوشحال رہے۔اس کے بعد افسروں اور عہداہ داروں کے فرائض میں سب سے اہم فریضہ ہے۔سلطان وقت اور اس کی طرف سے متعین انچارج کے ساتھ عہد وفاداری اور ان کے احکام کی اطاعت

شعاری بعدازیں اپنے معینہ عہدہ کی ذمہ داریوں سے ایماندارانہ عہدہ برا ہونا وغیرہ اور رعایا کے فرائض میں سب سے پہلے سلطان وقت اور اس کی جانب سے متعین افسران وعہدہ داران کی اطاعت اور حتی الامکان قانون کی پاسداری کرنا۔

اس توضیح کے بعد یہ سمجھنا نہایت آسان ہوگیا کہ خداوندکریم کی جانب سے تمام ایمان والوں کو حکم ہے کہ اپنے اپنے عہدوں کی وفا کریں۔ لیکن چونکہ ذات احدیت کی جانب سے تمام دنیا میں منشاء خداوندی کے ماتحت نظام مملکت کے قیام وبقاء کے لئے انچارج ہیں۔ انبیاء ومرسلین اوران کے بعد ان کے اوصیاء طاہرین علیہم السلام اوران کے بعد علمائے عاملین۔ پس خطاب خداوندی میں نظرعطوفت ایزدی کا مورد اول ہے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے بعد حضرت شاہ ولایت اور پھر یکے بعد دیگرے آئمہ طاہرین علیہم السلام اور پھر تمام مومنین از اولین وآخرین۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جن عہدوں کی وفا کرنی ہے ان سے مراد وہ عہد ہیں جو ان کے عہدہ جلیلہ کے شایان ہیں اوران میں سب سے پہلے ہے اطاعت مالک حقیقی اوراس کو آپ نے اس حد تک نبھایا کہ پاؤں پر ورم پڑ گئے اور تا زلیست زبان سے یہ کلمہ نہ نکلا کہ میں نے کما حقہ، اطاعت کرلی بلکہ اس معاملہ میں اپنی کوتاہی محسوس فرماتے رہے۔

مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ اَوْ كَمَا قَالَ

اور یہ ہے مرحلہ اولیٰ میں اپنے پروردگار کے عہد کی وفاداری اوراس کے بعد اس کی جانب سے معین کردہ قوانین کا نفاذ تو انسانی فلاح وبہبود کے لئے کوئی ضابطہ وقانون ایسا نہیں جس کو آپ نے بیان نہ فرمایا ہو۔ خواہ اس کا تعلق اصلاح نفس سے ہو یا تدبیر منزل سے یا سیاست عامہ سے اور خواہ امور دنیاویہ سے متعلق ہو یا امور آخرت سے اور بایں ہمہ تازیست کسی آدمی کے زیر بار احسان ہونا گوارا نہ کیا اور نہ کسی سے

مراعات کی خواہش فرمائی اور فرماتے رہے کہ میں یہ سب کچھ خوشنودی خدا کے لئے کرتا ہوں اور اس کا عوض مجھے میرا پروردگار ہی عنایت فرمائے گا۔ فریضہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا کچھ تکلیفیں برداشت نہیں کیں۔ پیدل سفر کئے۔ قریبیوں ورشتہ داروں سے بائیکاٹ وقطع تعلق کے بوجھ سہے۔ لوگوں کے طعن وتشنیع برداشت کئے۔ بھوکے رہے پیاسے رہے۔ شعب ابی طالب علیہ السلام میں تین سال تک جلاوطن رہے پھر جسم اطہر پر پتھر کھائے۔ ہجرت کی تکلیفیں اٹھائیں، دندان مبارک شہید ہوئے، حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب یہ الفاظ بھی منسوب ہیں کہ فرمایا:

مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَآ اُوْذِیْتُ

"یعنی کسی نبی کو اس قدر اذیتیں نہیں دی گئیں، جتنی مجھے دی گئیں"

بایں ہم تبلیغ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ذرا بھر بھی کوتاہی نہیں کی اور خلق کی خیر خواہی واصلاح کو ہر مرحلہ میں ہی مقدم رکھا۔ یہ سب کچھ اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لئے ہی کیا اور باوجود تکلیفوں اور اذیتوں کے شکوہ نہ کیا بلکہ اس کے ذکر وشکر اور حمد وثنا میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ یہ ہے ان کی اس مرحلہ ثانیہ میں اپنے پروردگار کے عہد کی وفاداری حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے صحیح جانشین حضرت ولایت مآب امیر المومنین علیہ السلام ہیں اور وہ بھی ذات پروردگار کی جانب سے عہد کی وفاداری کے لئے مامور ومخاطب ہیں۔ ان کے عہد میں سب سے اول ہے۔ اطاعت خالق اور اس کے بعد اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے عائد شدہ قوانین کا تمام امت میں انفاذ واجراء اور نگرانی۔ اس مقام پر حضرت علی علیہ السلام کے جملہ

شعوب زندگی پر اگر تفصیلی نگاہ دوڑائی جائے تو آپ کی مقدس زندگی کا کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا، جس میں ایک چشم زدن کے لئے بھی خوشنودی خدا کو پس پشت ڈالا گیا ہو۔ یہ صرف حضرت امیرؑ کی ہی شان تھی کہ بڑی وسیع وعریض سلطنت کو ٹھوکر ماردی، لیکن خوشنودی خدا سے قدم باہر نہ رکھا۔ تاج وراج چھوڑنا منظور کر لیا، لیکن دین خدا کی لاج نہ چھوڑی۔ نماز میں دیکھئے ایک ہزار رکعت شبانہ روز پڑھتے ہیں اور خوف خدا کا یہ عالم ہے کہ شب تاریک میں ریش مبارک کو پکڑ کر اپنے عجز وانکساری کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ شب ہجرت عین عالم شباب میں بستر موت پر سونا اور پھر ہر جنگ میں سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بقاء وجود کے لئے ایسے آڑے وقتوں میں سینہ سپر ہونا جب کہ بڑے سے بڑے اطاعت کے دعویٰ کرنے والے بھی روپوش نظر آتے تھے۔ یہ علی علیہ السلام کی اطاعت گزاری ووفاشعاری کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔ وہ کون تھا جس نے جنگ بدر میں اپنی بے پناہ جرأت وقوت ایمانی سے کفار کے حوصلے پست کر دیئے؟ کون جنگ اُحد میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سینہ سپر رہا؟ کس نے جنگ خندق میں اسلام کے پرچم کو بلند کرتے ہوئے ثقلین کی عبادت کو تلوار کی ایک جنبش میں سمو کر کل ایمان کی سند لی۔ وہ کون تھا جس نے میدان خیبر میں زبان وحی ترجمان سے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پراخلاص محبت کے ساتھ ساتھ کرار غیر فرار کا تمغہ حاصل کیا؟ تو تاریخ متفقہ طور پر یہی کہے گی کہ اس قسم کے حوصلہ شکن مراحل میں خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے لئے اپنی جان پر کھیلنے والا صرف علیؑ ہی تھا اور اطاعت وفرض شناسی کی حد ہے کہ غلط فہمی سے اپنے عقیدہ میں افراط کرنے والا کہتا ہے کہ تو خدا ہے اور علی علیہ السلام اسے واجب القتل قرار دے کر اپنی عبدیت پر نازاں ہیں اور توحید پرستی کا یہ عالم ہے کہ مناجات میں عرض کرتے ہیں:

كَفٰى بِىْ فَخْرًا اَنْ تَكُوْنَ لِىْ رَبًّا وَكَفٰى بِىْ عِزًّا اَنْ اَكُوْنَ لَكَ عَبْدًا

''یعنی میرے فخر کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے اور میری عزت کے لئے یہ کافی ہے کہ میں تیرا عبد ہوں۔''

اور ایک مقام پر عرض کرتے ہیں۔

اِلٰهِىْ وَجَدْتُكَ رَبًّا كَمَا اَرْتَضِىْ فَاجْعَلْنِىْ عَبْدًا كَمَا تَرْضٰى۔

''اے میرے اللہ! میں نے تجھے اپنا پروردگار اس طرح پایا ہے جس طرح میں چاہتا ہوں اور تو مجھے اپنا عبد اس طرح بنا جس طرح تو چاہتا ہے۔''

اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالم یہ ہے کہ اگر کسی نے نادانستہ طور پر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیا تو فوراً اس کی زبان بندی ان الفاظ سے فرمائی:

اَنَا عَبْدٌ مِّنْ عَبِيْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔

''میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔''

سامنے بیٹھ کر جی حضوری بنتے ہوئے غلامی کرنا اور ہے اور علیحدگی میں کسی کو مبالغہ آمیز تعریف سے روک کر اپنے عہدہ پر برقراری کا مظاہرہ کرنا اور ہے اور یہ بھی اسی اطاعت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ہے کہ جہاں حکم ملا کہ آگے بڑھنا ہے تو ہزاروں لاکھوں کے مقابلہ میں جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایسے آگے بڑھے کہ شجاعان زمانہ کے دل ہلا دیئے اور جہاں مصلحت وقت کے ماتحت رسول صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی وصیت ہوئی: یا علی خاموش رہنا تو معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ لیکن جذبات کو کچلتے ہوئے ۲۵ سال کی طویل خاموشی اختیار کر لی اور اطاعت کے دائرے سے قدم باہر نہ نکالا۔ ارباب تاریخ اور اصحاب دانش پر واضح ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے جملہ شعوب زندگی میں سے کوئی شعبہ ایسا نہیں مل سکتا جس میں صرف جذبات نفسانیہ کا خیر مقدم کیا گیا ہو، بلکہ ہر مرحلہ پر اطاعت خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آپ کا مطمح نظر رہی۔ یہ ان کے ایفائے عہد کی شق اول کے متعلق مختصری گزارش کی گئی ہے ورنہ تفصیل مطلب کے لئے تو علمائے اعلام کی ضخیم کتابیں بھی اس کے حق بیان سے قاصر رہی ہیں۔

اب رہا ان کے عہد کے ایفا کا دوسرا پہلو جو خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے انفاذ سے متعلق ہے تو آپ نے باوجود انتہائی پر فتن دور کے نامساعد حالات میں حقیقت بین نگاہوں اور صحیح الفطرت عقلوں کے لئے زمان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد تازہ کر دی۔ اس میں شک نہیں کہ دانستہ طور پر آپ کے مختصر سے زمانہ خلافت کو جنگ وجدال کے الجھاؤ میں ڈال کر کوشش کی گئی کہ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح تعلیمات کو زیر حجاب رہنے دیا جائے تاکہ اسلام بااقتدار طبقہ کی کٹھ پتلی بنا رہے اور بعد کی نسلیں حضرت علی علیہ السلام کے دور سے سابق ولاحق حکومتوں پر صحیح اسلامی نقطہ نگاہ سے حرف زنی نہ کر سکیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کی ثبات قدمی اور اپنے ذمہ لئے ہوئے عہد امامت کی پاسداری کے تقاضے نے نفسانیت وشہوانیت یا وقتی سیاست ولادینیت کے راستہ میں سنگ گراں بن کر اور رکلی سطوت واستبداد کی خطرناک اور ہمہ گیر طوفانی موجوں کے سامنے آہنی چٹان بن کر کفر والحاد کے ابھرتے ہوئے سیلاب کو اپنی حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا اور باطل کا ناطقہ

بند کر کے رکھ دیا حتی کہ اس دور کی دو طرفہ پالیسیوں کی چاشنی لینے والے بھی خوب تاڑ گئے تھے کہ علی علیہ السلام کس عہد پر ثابت قدم ہیں اور مقابل والے کیا چاہتے ہیں۔ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے وہ کہا کرتے تھے کہ کھانا امیر شام کے دستر خوان پر خوب پر لطف ہوتا ہے لیکن نماز حضرت علی علیہ السلام کی اقتداء میں درست ہوتی ہے۔ گویا دبی زبان میں یہ کلمات اس امر کا اعتراف ہیں کہ ان کی حکومت صرف شکم پری اور عیش نفسی کا پیش خیمہ ہے اور اس طرف خدا ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور عہدہ امامت کی پاسداری حکومت وخلافت کا مطمح نظر ہے اور اسی عہد کے ہر دو پہلوؤں کی رعایت حضرت امیر کے بعد حضرت امام حسنؑ نے صلح کے رنگ میں اس طرح کی جس طرح کرنے کا حق تھا۔ کیونکہ وقتی تقاضے کے ماتحت بغیر صلح کے عہدہ امامت کے فرائض کی پاسداری نہایت مشکل تھی۔ جسے امام حسن علیہ السلام خود ہی سمجھ رہے تھے اور ان کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے حقوق اللہ اور حقوق رعایا کی ادائیگی کا تو وہ منظر پیش فرمایا کہ رہتی دنیا تک اس کے نقوش صحیفۂ عالم کے تاریخی اوراق پر ثبت رہیں گے اور پھر یکے بعد دیگرے ہر امام معصوم نے اس عہدہ کے فرائض کو ہر دو پہلوؤں کے لحاظ سے اس طرح نبھایا جس طرح اس کے نبھانے کا حق تھا۔

نتیجہ بحث

مثال سابق سے خوب واضح ہو گیا ہے کہ جس طرح مملکت ظاہریہ میں سلطانی احکام واوامر کا خطاب اگرچہ تمام رعایا کی طرف ہوتا ہے خواہ عہدہ دار ہوں یا ماتحت لیکن عہدہ دار اور ذمہ دار افراد اسی قسم کے اوامر سے بالخصوص مراد ہوا کرتے ہیں کیونکہ ان کے فرائض اس سلسلہ دوہرے ہو جاتے ہیں ایک خود عمل کرنا اور دوسرے رعایا پر

ان کو واضح کرنا اور ان کو عمل کی تلقین کرنا اور پھر نگرانی کرنا۔ اسی طرح خدائی اوامر میں جہاں کہیں اصلاح امت کے لئے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب سے تمام اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے

وہاں اگرچہ یہ خطاب تمام امت اسلامیہ کے افراد پر بالعموم حاوی ہے لیکن نظام اسلامی کے قیام کے لئے جو خدائی عہدہ دار تھے۔ یہی خطاب ان کے لئے خصوصی حیثیت کا حامل تھا کیونکہ ان کی ذمہ داریاں دوہری تھیں۔ پس یہ حدیث اپنے مقام پر بالکل صحیح اور قرین واقع ہے کہ جہاں کہیں قرآن مجید میں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وارد ہے حضرت علی علیہ السلام اس کے امیر و رئیس ہیں۔ اور آپ کے بعد بلاشک وشبہ قائم آل محمد تک تمام آئمہ اسی حدیث کے رو سے ان خطابات میں امیر و رئیس کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ جس طرح تعلیمات اسلامیہ تا قیامت ناقبل تنسیخ ہونے کی حیثیت سے ہر بعد والے دور کے لئے مفید اور ضروری ہیں کیونکہ خطابات قرآنیہ تا قیامت زندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی جانشین جو معلم قرآن و محافظ شریعت ہیں انہی خطابات میں رئیس و امیر کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ اسی معنی کی معصوم کی ایک فرمائش نقل کی جا چکی ہے اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس جگہ آیت مجیدہ میں عقود سے مراد وہ عہود ہیں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے خلافت کے متعلق امت سے لئے تھے تو اس کا مطلب بھی صاف ہو گیا کہ رعایا کے لئے اوامر سلطانیہ کی اطاعت کا اس وقت کچھ وقار ہو گا جب وہ سلطان کی جانب سے معینہ عہدہ داروں کی اطاعت کا عہد کریں اور اس کی وفا بھی کریں اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ سلطان کی طرف سے معین کردہ عہدہ داروں وافسروں کی اطاعت سلطان کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور ان کی اطاعت

سے گریز کرنا سلطان وقت کی نافرمانی متصور ہوتی ہے کوئی شخص قوانین مملکت کا ہزار ہی احترام کیوں نہ کرتا ہو۔ جب تک اپنے افسران بالا کا اطاعت گزار و وفادار نہ ہو صرف قوانین سلطانی کا احترام اسے سلطان کا اطاعت گزار نہیں کہلا سکتا بلکہ ایسا شخص بجائے تعریف کے مذمت کا اہل ہوتا ہے اور بجائے جزاء وانعام کے سزا وعقاب کا زیادہ مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر آیت مجیدہ میں اگرچہ تمام عہود کی ایفاء کا حکم ہے لیکن چونکہ نظام قرآنی کو برقرار رکھنے کے لئے خداوند کریم کی جانب سے جن لوگوں کو بطور سربراہ حکومت اسلامیہ کے نامزد کیا گیا ہے۔ ان کی اطاعت کا عہد اور اس سے وفاداری تمام اسلامیان عالم کا سب سے اہم اور ضروری فریضہ ہے کیونکہ باقی جملہ قوانین شرعیہ اور احکام اسلامیہ پر عمل درآمد اس کی فرعی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ضروری امر ہے کہ جہاں متعدد قوانین وضوابط کی پاسداری کا حکم ہو تو ان میں سے جن قوانین وضوابط کو اصولی حیثیت حاصل ہوگی وہ بہ نسبت فروعی امور کے خاص اہمیت کے ساتھ معرض توجہ ہوں گے بلکہ حاکم کی نگاہ بالذات اصولی نکات پر ہی ہوا کرتی ہے۔ اسی بناء پر شریعت اسلامیہ کے قواعد وضوابط و جملہ عہود میں سے ولایت امیر علیہ السلام اور ان کی اطاعت کا عہد چونکہ اصولی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ نظام اسلامی کے لئے سربراہ کی حیثیت سے ہیں۔ لہٰذا ایفائے عہد کے امر میں ارشاد خداوندی کا مقصود اول حضرت علی علیہ السلام کے عہد خلافت کی وفاداری کا حکم ہے اور اس کے بعد جملہ قوانین اسلامیہ کی پاسداری فروعی طور پر خود بخود اس کے ضمن میں داخل ہے۔ علمائے اہل سنت مثلاً طبرانی وسیوطی واحمد بن حنبل ودیگر علماء کا یہ نقل کرنا کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یَـٰٓأَیُّهَا ٱلَّذِینَ آمَنُوْا نازل ہوا ہے اس کے امیر وشریف یا رئیس وقائد حضرت علی بن ابی طالب علیہ

السلام ہیں۔ ان کا یہ اعتراف اس امر کی نص ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام ہی ان کے صحیح جانشین اور مملکت اسلامیہ کے خدا کی جانب سے سربراہ اور حاکم اعلیٰ ہیں۔ سربراہ حکومت الٰہیہ کے لئے جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے اس کے متعلق تفسیر کی چوتھی جلد میں ص ۱۹۱ تا ۱۹۶ پر کافی لکھا جا چکا ہے جن کا جامع صرف ایک کلمہ ہے اور وہ یہ کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری میں تمام امت سے ممتاز ہو اور اس سلسلہ میں علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام جو آئمہ ہیں کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا خود ہی اپنے مقام پر فیصلہ کر سکتا ہے کہ تمام اکابر امت کو فرداً فرداً تو بجائے خود مجموعی طور پر بھی ان کی صفت کمالیہ کے مقابلہ کی تاب نہیں کیونکہ جن کی ایک ضربت جن وانس کی تمام عبادتوں سے افضل ہو ان کے تمام جہادوں کی شان کا کون اندازہ کر سکتا ہے جن کا ایک سجدہ جو انتہائی کرب و بے چینی کے عالم میں اطمینان وسکون اور خشوع وخضوع کا ایسا مرقع ہو کہ ارواح انبیاء اور ملائکہ تک اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں جس کی نیاز جبین نے تپتی ہوئی ریتی پر کفر واستبداد کے ابھرتے ہوئے ناز توڑ دیئے اور پوری کائنات میں سجدہ اور ساجدین عبادت اور عابدین بلکہ معرفت وعارفین کے دل ہلا دیئے اور قیامت تک کے لئے بقائے اسلام کی ضمانت لے لی۔ اس کے شؤون زندگی کے دوسرے شعبوں کے متعلق انسان کیا ذکر کر سکتا ہے؟ پس یہی ذوات مقدسہ ہیں جن کی عبادت عبادت کی لاج اور تقویٰ تقویٰ کا وقار ہے ان کے علاوہ اور کس کی مجال ہے کہ حکومت الٰہیہ کے فرائض کا بوجھ اٹھا سکے یا ان کی پاسداری سے حتمی طور پر عہدہ برآ ہو سکے؟ یہ اور بات ہے کہ اقتدار کی بھوکی دنیا نے انہیں اپنے راستہ سے ہٹانے کے لئے ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ان کے قدر ومنزلت کو گھٹانے کی کوشش کی اور مہلت نہ دی کہ یہ اپنے عہدہ کے پیش نظر نظام

خداوندی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر عالم کو گہوارۂ امن وسکون بنائیں جو انسانیت کا فرض اول ہے پس جس طرح خدا کو خدا نہ تسلیم کرنا اس کی خدائی میں نقص کا موجب نہیں اسی طرح ان کو بھی امام وحجت نہ ماننا ان کی امامت میں مخل نہیں چونکہ دین خدا کی اطاعت میں جبر واکراہ کو دخل نہیں ہے کہ فرماتا ہے لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ تاکہ بروز قیامت سزا وجزا کا محل صحیح ہو بلکہ ہر انسان کو اختیار حاصل ہے کہ خواہ اعمال صالح سے جنت کی راہ لے یا بد اعمالی سے جہنم کو پسند کرے اور جس طرح خدا نے فرعون ونمرود وشداد وغیرہ کے لئے اپنی قدرت کو استعمال نہیں فرمایا اسی طرح خدائی عہدہ داروں نے بھی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کا نمونہ پیش کر کے صبر وضبط سے کام لیا۔ لہٰذا جس طرح خدا اپنے مقام پر خدا ہے اسی طرح خدائی عہدہ دار بھی اپنے مقام پر عہدہ دار ہیں اور خلق خدا پر حجت ہیں۔ ظاہری حکومتوں میں بعض اوقات حکومت وملک کے غدار لوگ اقتدار حاصل کر کے سربراہ مملکت بن جایا کرتے ہیں اور ان کے خود ساختہ قوانین وضوابط بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کی ترمیم یا تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہاں معیار حکومت ہے صرف اقتدار کا حصول لیکن حکومت الہیہ میں اللہ کی جانب سے ایک معیار مقرر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ صرف انہی کو ہی نامزد فرماتا ہے جن کو اس نے اس کی اہلیت تفویض فرمائی ہو اور اسی معیار پر فائز ہوں پس یہ نظریہ قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ جس کے متعلق مل جل کر فیصلہ کر لیا جائے کہ فلاں شخص معیار حکومت الہیہ کا اہل ہے پس وہ اللہ کے نزدیک بھی اہل قرار دیا جائے اور یہ محکم اور پکی بات ہے کہ جو شخص کسی وقت بھی حکومت الہیہ کا غدار رہا ہو وہ بعد میں کتنا ہی صالح اور نیک ہو جائے مسلمان ہو گا۔ مومن ہو گا جنتی ہو گا لیکن ناممکن ہے کہ وہ خدا کی جانب سے عہدہ دار حکومت اسلامیہ بھی ہو جائے۔ اسی بناء پر تو جب حضرت خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے عہدہ

امامت طلب کیا تھا تو جواب ملا تھا کہ ظالموں تک میرا یہ عہد نہیں پہنچ سکتا یعنی جو کسی وقت ظالم رہا ہو وہ میری طرف سے عہدۂ امامت کے ہرگز قابل نہیں ہوا کرتا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ بن جانا اور بات ہے اور ہونا اور بات ہے۔

پس یہ بات صاف ہو گئی کہ آیت مجیدہ میں تمام اہل ایمان کو جن عہود کی ایفا کا حکم دیا گیا ہے اس خطاب کے رأس ورئیس حضرت علی علیہ السلام اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے آئمہ طاہرین علیہ السلام ہیں اور باقی امت پر جملہ عہود کی پاسداری سے زیادہ اہم اور ضروری حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد امجاد کی اطاعت کے عہد کی پاسداری ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۶ تا ۱۲)

بلند نہ کیا کرو۔ جس طرح آپس کے باہمی مکالمات میں کرتے رہتے ہو ورنہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے درحالیکہ تم ملتفت بھی نہ ہو گے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ اے ایمان والو! ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن پر تمہارا عمل نہیں ہوتا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام اس قسم کی آیات وخطابات میں رأس ورئیس ہیں تو ان تہدیدی پیغامات میں ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔ تو اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ سلطان وقت کے وہ پیغامات جن میں رعایا کو قانون شکنی یا غلط کاری سے روکا جاتا ہے وہ حکومت کے فرض شناس عہدہ داروں کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوا کرتے بلکہ عہدہ داران حکومت اس قسم کے تہدیدی پیغامات کو رعایا تک پہنچانے کے لئے سلطان وقت کی طرف سے وکالت کا عہدہ انجام دیتے ہیں اور ان کا عہدہ ہے مسلمانوں کو ان کی خلاف ورزی سے روکنا ہاں وہ خطابات جن میں خالق نے اپنی اطاعت یا دوسرے ایسے امور کی طرف دعوت دی جن کا تعلق عوام وخواص سب سے یکساں ہے تو محمدؐ وآل محمدؐ ان کے مقصود اصلی اور رأس ورئیس ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مَامِنْ عَامٍ اِلَّا وَقَدْ خُصَّ علمائے اصول کے مابین ایک قاعدہ مسلمہ ہے کہ کوئی عام ایسا نہیں جس میں تخصیص نہ ہو۔ پس اگرچہ ظاہری طور پر یہاں بھی عموم ہے کہ جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وارد ہے حضرت علی علیہ السلام اس کے رئیس وامیر وقائد ہیں لیکن یہ کلیہ بھی تخصیص پذیر ہے اور وہ یہ کہ تہدیدی اور سرزنش کے خطابات کے علاوہ جہاں بھی قرآن میں یہ خطاب وارد ہے حضرت علی علیہ السلام اس کے رئیس وقائد ہیں۔ چنانچہ انہی منقولہ روایات کے آخری جملے اس امر کی تائید مزید کر رہے ہیں کہ کہ ابن عباس فرماتے ہیں قرآن مجید میں جس جگہ بھی یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اترا ہے حضرت علی علیہ السلام اس کے شریف وامیر ہیں اور خداوند کریم نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابہ کو کئی دفعہ جھڑکا ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام کا جہاں بھی فرمایا ذکر خیر ہی فرمایا یعنی علی علیہ السلام کی مدح وثنا ہی فرمائی۔

تیسرا جواب تہدید وسرزنش کے خطابات انہی کی طرف عائد ہوتے ہیں جو غلط کار ہوں لیکن جن سے غلط کاری کا وجود اصلاً ناپید ہو اور خطاب کرنے والا جانتا ہو کہ فلاں غلط کار نہیں تو عقل وانصاف کے منافی ہے کہ وہ تہدیدی خطاب کی زد میں آئے۔ مثلاً سکول میں ایک ہی کلاس کے لڑکوں میں چند لڑکے ہنس رہے ہوں یا کھیل کود میں وقت ضائع کر رہے ہوں تو استاد پوری جماعت کو خطاب کر کے کہہ دیا کرتا ہے کہ لڑکو! خبردار ہنسو نہیں۔ وقت ضائع مت کرو۔ شرارتیں نہ کرو ورنہ میں سزا دوں گا تو ایک کھلی ہوئی واضح اور غیر مبہم حقیقت ہے کہ اس خطاب تہدیدی میں وہ لڑکے مخاطب ہیں جو آداب تعلیم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہیں اگر سزا تک نوبت پہنچ جائے تو انہی تک ہی محدود رہے گی۔ لیکن جو لڑکے شریفانہ طور پر اپنے کام میں مشغول ہوں گے، نہ وہ

مخاطب ہوں گے اور نہ قابل سزا ہوں گے۔ بشرطیکہ استاد عادل اور منصف مزاج ہو اور جن کی شرافت و محنت و دیانت کا استاد خود معترف ہو تو ناممکن ہے کہ پھر ایسے خطابات کے ساتھ ان کو تہدید کرے۔ محمدؐ و آل محمدؐ وہ شخصیتیں ہیں جن سے خطا کاری ناممکن ہے بلکہ ہر وہ صفت کمال جو کمال انسانی کے منافی ہو وہ ان سے پاک ہیں اور خود خلاق عالم نے آیت تطہیر بھیج کر ان کی اخلاق ناشائستہ و صفات رذیلہ سے مل کر مجسم الفاظ میں اعلان فرما دیا ہے پھر کیسے کہ ممکن ہے کہ ان کو غلط کاروں کے زمرہ میں داخل کر کے تہدیدی خطابات میں شامل کرے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۶)

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

”آج (بروز غدیر) مایوس ہو گئے وہ جو کافی ہیں تمہارے دین اسلام کے مٹانے سے پس ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں نے کامل کر دیا تمہارے لئے تمہارا دین (ساتھ اعلان ولایت علی کے) اور تمام کر دی تم پر اپنی نعمت اور راضی ہوا میں تمہارے لئے اسلام پر دین کے لحاظ سے (کہ یہ تمام دینوں سے افضل ہے) پس جو مضطر ہو حالت بھوک و گرسنگی میں کہ نہ مائل ہو گناہ کے لئے تو تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

آیت اکمال دین

اَلْيَوْمَ يَئِسَ: آیت مجیدہ میں ربط الفاظ اور تسلسل معنی کا تقاضا تو یہ تھا فَمَنِ

اضۡطُرَّ پہلے مذکور ہوتا اور اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ کے بعد نئی آیت کا عنوان ہوتا کیوں کہ اس سے پہلے یہی بیان ہوا ہے کہ تمہارے اوپر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اللہ کے نام کے بغیر ذبح شدہ منخنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ، درندوں کی پھاڑی ہوئی جس کا تزکیہ نہ ہو سکا۔ بتوں کے لئے ذبح کی ہوئی اور جوئے کے ذریعہ حاصل شدہ کل گیارہ چیزیں حرام ہیں اور ان کا کھانا فسق ہے۔ اب یہاں اس استثنا کا مقام تھا کہ البتہ جو شخص حالت گرسنگی اور سختی میں مجبور و مضطر ہو کر بلا رغبت گناہ ان چیزوں میں سے اس قدر کھالے کہ اس کی جان بچ جائے تو خداوند کریم اس کے اس اضطراری فعل کو بخشے گا کیونکہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور غفور و رحیم کی لفظوں کا مطلب یہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں جس حرام کو استعمال کیا گیا ہے وہ حلال نہیں ہو جاتا۔

یعنی مجبوری حرام کو حلال نہیں کر دیا کرتی بلکہ حرام تو حرام ہی رہتا ہے البتہ خدا کی مغفرت و رحمت کے تقاضے سے اس کی سزا نہ ہوگی۔ اب اس حکم کے بیان ہو جانے کے بعد دوسری بات کا آغاز ہوتا ہے کہ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ یعنی کفار لوگ جو تمہارے دین اسلام کے مٹانے کے درپے تھے اور وہ اس کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اب وہ اس سے مایوس ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب ان کی مکاریوں اور فتنہ بازیوں سے خوف نہ کرو بلکہ مجھ سے ہی ڈرو۔ الخ۔ اگر اس طرح ہوتا تو اسلوب بیان اور نظم مطالب میں کوئی سکتہ نہ آتا۔ جو دشمنان اسلام کی نکتہ چینی کا بڑا حربہ ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ اس قسم کا قرآنی آیات میں تقدم و تاخر حضرت جامع قرآن کی قرآنی مطالب سے بے بہرگی کا نتیجہ ہے ورنہ خود قرآن اس قسم کی لغزشوں سے پاک و منزہ ہے تو پھر کوئی اشکال نہیں رہتا۔ چونکہ آیہ مجیدہ کے یہ الفاظ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ حضرت علی علیہ السلام کے اعلان خلافت اور بیعت غدیر کے بعد نازل ہوئے۔ جن کا

شان نزول کے لحاظ سے مقصد یہ ہے کہ آج یعنی ولایت علی بن ابی طالب کے بعد ہی تمہارا دین کامل ہوا۔ اور تم پر نعمت تمام ہوئی اور میں نے تمہارے لئے اس دین اسلام کو پسند کیا۔ تو موجودہ برسر اقتدار طبقہ کو کیسے گوارا ہوتا کہ قرآن مجید کے جمع وتالیف کے وقت ان الفاظ کو اپنا اصلی مقام دیا جائے جو آنے والی نسلوں کے لئے سابقہ خلافتوں کے عدم جواز کا ببانگ دہل اعلان کرنے والے ہوں پس ان الفاظ کو ایسے مقام پر گھسیڑ دیا گیا جس سے یہ الفاظ قطعاً بے ربط اور بے لگاؤ ہیں۔ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی جب آیت مجیدہ کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو حیرت انگیز تعجب لاحق ہوتا ہے کہ کجا کلام خالق اور کجا یہ بے ربطی؟ ہاں ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے نظم وضبط پر انگشت نمائی ہو تو بے شک ہو لیکن ادوار سابقہ کی دھاندلی کی قلعی کہیں نہ کھلنے پائے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اگر دانستہ طور پر یہ اقدام کیا گیا ہو ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ نادانستہ طور پر ایسا ہوا تو یہ جامع قرآن کی قرآن نافہمی اور لاعلمی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ جو مسند خلافت پر جلوہ گر ہونے کے قطعاً منافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے حسب ترتیب قرآن کو جمع کیا تھا لیکن بارگاہ خلافت میں اس کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس میں مطالب قرآنیہ کا جوڑ تو تھا نہیں بلکہ حقائق کی تصویر کشی اپنے محل وموقع کی موافقت سے تھی اور اس کا تمام مسلمانوں میں رواج موجودہ اقتدار کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے زید بن ثابت کی خدمات حاصل کر لی گئیں اور حضرت علی علیہ السلام سے استفادہ نہ کیا گیا حالانکہ تمام مسلمانوں کو معلوم تھا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا فرما چکے تھے کہ علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ ابن عباس کی تصریح موجود ہے کہ میرا اور تمام صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم علی علیہ السلام کے علم کے

مقابلہ میں ایسا ہے جیسا کہ سات سمندروں کے مقابلہ میں پانی کا ایک قطرہ۔ نیز حدیث ثقلین جو متواتر ہے تمام صحابہ اس کو خوب جانتے تھے۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔ سب نے اپنے کانوں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا۔ ہم مقدمہ تفسیر میں ان مطالب کو زیادہ وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔ اب حیرت ہوئی ہے کہ جب علی علیہ السلام جیسی قرآن دان شخصیت موجود ہو تو پھر جمع قرآن کے لئے زید بن ثابت اور چند دیگر آدمیوں کی کونسل بلانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم حضرت علی علیہ السلام کو بھی اس میں شریک کر لیا جاتا اور یہ بھی نہیں تو کم از کم اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے کچھ استفادہ یا مشورہ بھی لے لیا ہوتا۔ لیکن باوجود اس یقین کے کہ علی علیہ السلام ہی سب صحابہ سے زیادہ ماہر قرآن ہیں ان کو نظر انداز کر کے بعض غیر معروف لوگوں سے یہ خدمت لینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ نیت بخیر نہ تھی۔ بلکہ دال میں کالا کالا ضرور تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دور خلافت میں اپنے جمع شدہ قرآن کو کیوں نہ رواج دیا تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے مختصر سے دور خلافت کو فضاء زمانہ کے تکدر میں اس طرح الجھا دیا گیا کہ ایک پل و لحہ کے لئے بھی خارجہ مشکلات سے رہائی نہ مل سکی اور یہ سب سابقہ حکومتوں کی چاشنی لینے والے بعض اقتدار کے پیاسے حضرات کا دانستہ منصوبہ تھا۔ جس سے حضرت علی علیہ السلام کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ سب سے پہلے جنگ جمل کی ایک حرم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہا کر دی بہانہ تھا خون خلیفہ ثالث۔ اندازہ فرمایئے۔ قتل کرنے والے مصری یا بعض صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد جو مدینہ میں تھی اور انتقامی کاروائی بصرہ والوں سے ہو رہی ہے اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ خلیفہ کے خون میں حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ نہیں اور جن جن

لوگوں کا ہاتھ تھا وہ انہیں خوب جانتی تھیں لیکن مقصد تھا صرف حضرت علی علیہ السلام کو الجھانا اور لوگوں کو ان سے متنفر کرنا۔ جب ان کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو امیر شام نے علم بغاوت بلند کر دیا کہ میں خلیفہ ثالث کے خون کا انتقام لوں گا۔ بہر کیف یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ذات اس سے مبرا ہے لیکن مقصد یہ تھا کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے حضرت علی علیہ السلام کو نظام اسلام کی ترویج کا موقعہ نہ دیا جائے، ورنہ لوگ سابقہ حکومتوں کے متعلق بدگماں ہو جائیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا جمع شدہ قرآن بھی ترویج نہ پا سکا۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام دیکھ چکے تھے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے اقتدار کے ہاتھ اپنی من مانی چیزوں کو تعلیمات اسلام میں بلا جھجک داخل کر رہے ہیں اور اپنی طبیعت کی ناپسندیدہ چیزوں کو اسلامی تعلیمات سے خارج کر رہے ہیں اور جب اسلامی تعلیمات تحریف و تصحیف کا شکار ہو چکی ہیں تو اس فضا میں اگر اپنا جمع شدہ قرآن نافذ کر دیا جائے تو یقیناً حزب مخالف اس کے مقابلہ میں خلیفہ ثالث کے جمع شدہ قرآن کو ہی اپنائے گا اور آج ہی سے دو قرآن ہو جائیں گے اور پھر صاحبان اقتدار کو ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا اور وہ اس قرآن میں موقعہ و محل کے لحاظ سے رد و بدل کی کوشش کرتے رہیں گے پھر قرآن کی حیثیت یقیناً کتب سماویہ سابقہ کی سی رہ جائے گی۔ اسی بناء پر آپ نے قرآن کے متعلق صرف اتنا فرما دیا کہ یہی قرآن جو دفتین کے درمیان موجود ہے کتاب خدا ہے اور اپنا جمع شدہ قرآن پیش نہ کیا تا کہ کتاب اللہ کا وقار ختم نہ ہو جائے اور اسلامی تعلیمات کا اصلی ماخذ تحریف و تصحیف کا کھلونا نہ بن جائے۔

فخر الدین رازی کی منطق

امام اہل سنت فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس آ مجیدہ کی تفسیر میں لکھا

ہے کہ یہ آیت رافضیوں کے قول کو باطل کرتی ہے، کیوں کہ خدا فرماتا ہے: اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یعنی کافر لوگ اب دین اسلام میں رخنہ اندازی اور فتنہ انگیزی سے مایوس ہو چکے ہیں اور وہ سمجھ چکے ہیں کہ دین اسلام اس قدر مضبوط و مستحکم ہو گیا ہے کہ اس کی تخریب اب ہمارے بس کا روگ نہیں اور شیعہ کہتے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی امامت وخلافت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے منصوص تھی۔ ایک طرف خدا فرماتا ہے کہ کافر لوگ اسلام میں تخریبی کارروائیوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ ان سے کسی کا خطرہ نہ کرو۔ اور دوسری طرف شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی امامت منصوص تھی اور اسلام میں تخریبی کارروائی کی گئی اور حضرت علی علیہ السلام کو پیچھے ہٹایا گیا۔ پس آیت مجیدہ نے فیصلہ کر دیا کہ حضرت علی علیہ السلام کی امامت قطعاً منصوص نہیں تھی ورنہ اس میں تخریبی کارروائی نہ کی جاسکتی کیونکہ ان کی مایوسی کی خدا خود شہادت دیتا ہے۔

جواب: حضرت علی علیہ السلام کی امامت وخلافت پر لاکھ پردہ ڈالا جائے۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اسے باطل کی کوششیں اور سازشیں کبھی معرض خفا میں نہیں لاسکتیں۔ رازی بچارے نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کے شان نزول کو چھپانے کے لئے پیش بندی کے طور پر شیعوں پر ایک اعتراض کر دیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ کی روائتی پوزیشن سے چپکے چپکے جان چھڑا کر آگے نکل جاؤں۔ پس قارئین کے سامنے ایک معمہ رکھ دیا اور اپنا علمی مظاہر کرتے ہوئے آگے کو سرک گئے بے شک بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ فرمایا اور بڑی صفائی کے ساتھ عناداً وعمداً منطقی طرز عمل سے ایک تمویہ کا غبار اڑا کر حق وحقیقت کی طرف سے نظریں پھیرنے کی کوشش کی اور غلط بیان کو علمی لبادہ اڑھا کر حق پوشی کا متعصبانہ فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے ہم نواؤں سے خراج

داد و تحسین بھی پالیا۔ لیکن سورج پر گرد اڑانے سے سورج کو کوئی خسارہ نہیں ہوتا۔ وہ گرد اپنے منہ پر ہی پڑا کرتی ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! فرمایئے مسئلہ خلافت دین میں داخل ہے یا اس کا دین سے کوئی واسطہ نہیں؟ اگر مسئلہ خلافت دین میں داخل ہے تو حضرت علی علیہ السلام کی نہ سہی کیا کسی اور کی خلافت پر نص وارد ہے! اگر نہیں تو پھر دین کامل کیسے ہو گیا۔ جب کہ ایک اہم مسئلہ کو بیان ہی نہیں کیا گیا اور اگر کسی کی خلافت پر نص ہے تو پیش کیجئے ورنہ حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نصوص متواترہ خصوصاً حدیث غدیر جس کے فوراً بعد یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ نازل ہوئی اسے تسلیم کیجئے اور اگر یہ مسئلہ دین میں سرے سے داخل ہی نہیں تو صحابہ کرام نے جنازہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مؤخر کر کے اس کی طرف پہل کیوں کی اور بے اصولی کی چیز کو کیوں رواج دیا؟ اور پھر کسی کو خلیفہ نہ ماننے والوں کو آپ رافضی کے لفظ سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں؟ نیز یہ خطاب مسلمانوں کو ہو رہا ہے کہ تمہارا دین کامل ہو گیا اور تم پر نعمتیں تمام ہوئیں اور کافر لوگ تمہارے دین کے استحکام سے اس قدر مرعوب ہو گئے ہیں کہ اب وہ ابھر نہیں سکتے بلکہ وہ اپنے مقام پر مایوس ہیں۔ شیعہ یہ کب کہتے ہیں کہ کافر اور مشرک لوگوں نے دین سے نبرد آزمائی کی بلکہ شیعہ تو کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کو کامل دین عطا کیا گیا اور جن پر نعمات الٰہیہ تمام کی گئیں انہوں نے اپنی ناقدری کا مظاہرہ کیا اور خود انہوں نے ہی دینی عمارت میں رخنہ اندازی کر کے اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا اور ارشاد خداوندی میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اب تمہارا دین اس قدر مضبوط ہے کہ اغیار اس کو کمزور نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان سے نہ ڈرو لیکن خبردار کہیں تم لوگ خود اس دین کی تخریب کے درپے نہ ہو جانا۔ اس لئے فرمایا: فَلَا تَخْشَوْهُمْ یعنی کافروں سے خطرہ محسوس نہ کرو وَاخْشَوْنِیْ اور مجھ سے ڈرو یعنی تم خود دین کو بگاڑنے کے درپے نہ

ہو جانا۔ اور حضرت کے منصب خلافت و امامت پر کفار و مشرکین نے کب دست درازی کی۔ یہ تو سب کچھ انہی لوگوں نے کیا جن کو ارشاد ہو رہا ہے کہ کافر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لہٰذا تم میرا لحاظ کرتے ہوئے خود نہ بگڑ جانا۔

حدیث غدیر

شان نزول آیت مجیدہ: بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت بروز جمعہ عرفات پر حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ بمقام جحفہ نازل ہوئی اور بعضوں نے مقام کراع الغمیم اس آیت کا محل نزول بتلایا ہے اور ان سب اقوال سے صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ یہ آیت بمقام غدیر نازل ہوئی۔ جب آیتِ مجیدہ یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا الخ کے اترنے کے بعد پالانوں کے انوکھے منبر پر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو ولایت و خلافت کا اعلان فرما چکے پس اس کے فوراً بعد یہ آیت اتری۔ چنانچہ اسی پر اہل بیت اطہار علیہم السلام کا اتفاق ہے اور منصف طبع علمائے اسلام نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ معتبر کتب سیر و تاریخ میں اس کی صراحت موجود ہے اور تفسیر لوامع التنزیل میں کتب معتبرہ سے عبارات بھی نقل کی گئی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

① لَمَّا كَانَ يَوْمَ غَدِيْرِ خُمٍّ وَهُوَ يَوْمُ ثَمَانِيْ عَشَرَةَ مِنْ ذِي الْحُجَّةِ قَالَ النَّبِيُّ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔

”جب غدیر خم کا دن ہوا اور وہ ماہ ذی الحجہ کی (۱۸، ۱۰ھ) تاریخ تھی تو حضرت نبی علیہ السلام نے فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ پس خدا نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ کی آیت نازل فرمائی۔“

(تفسیر در منثور)

۲ نیز تفسیر در منثور میں علامہ سیوطی نے حضرت سعید خدری سے اس طرح نقل کیا ہے:

لَمَّا نَصَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ عَلِیًّا یَوْمَ غَدِیْرِ خُمٍّ فَنَادیٰ لَہٗ بِالْوِلَایَۃِ هَبَطَ جِبْرِئِیْلُ بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ

''جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو کھڑا کیا اور ان کی ولایت کا اعلان کیا تو جبریل اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ کی آیت لے کر اترے۔''

۳ تفسیر ثعلبی۔ اسنی المطالب اور مناقب مغازلی شافعی وغیرہ میں سعید خدری سے اس طرح مروی ہے:

اِنَّ النَّبِیَّ دَعَا النَّاسَ اِلٰی عَلِیٍّ فِیْ غَدِیْرِ خُمٍّ وَاَمَرَ بِمَا تَحْتَ الشَّجَرَۃِ مِنَ الشَّوْکِ فَقُمَّ فَدَعَا عَلِیًّا فاخذ بضبعیه فرفعهما حتی نظر الناس الی بیاض ابطی رسول الله وعلی ثم لم یتفرقوا حتی نزلت ھٰذِہِ الایۃ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ الله اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمة ورضاء الرب برسالتی والولایة لعلی بن ابی طالب بعدی ثم قال مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَہٗ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَہٗ..........

''تحقیق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی طرف بلایا اور درختوں کے نیچے سے خاروخس کے دور کرنے کے لئے جھاڑو کا حکم دیا پس علی

علیہ السلام کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس قدر بلند کیا کہ لوگوں نے حضرت نبیؐ اور علی علیہ السلام کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا۔ پھر لوگ ابھی متفرق نہ ہوئے تھے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کی آیت اُتری تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعرہ تکبیر بلند کیا کہ دین کامل ہوا، نعمت تمام ہوئی اور میری رسالت اور علی علیہ السلام کی ولایت پر پروردگار راضی ہوا۔ پھر فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ اے پروردگار! تو اس کو دوست رکھ جو اسے دوست رکھے اور تو اس کی مدد کر، جو اس کی مدد کرے اور تو اس کو چھوڑ دے، جو اس کو چھوڑ دے۔"

4۔ امام ابوالقاسم حسکانی سے شواہد التنزیل میں بھی اسی معنی کی روایت منقول ہے اور نیز موفق بن احمد مکی خوارزمی نے فضائل میں اور حموینی نے فرائد السمطین میں اور نطنزی نے خصائص میں اور دیگر علماء مثلاً ابونعیم اور سیوطی وغیرہ نے بھی مضمون سابق کی ایک روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ پس حسان بن ثابت نے خدمت نبویؐ میں عرض کی کہ مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں کچھ شعر کہوں تو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی برکت سے کہو تو حسان نے کھڑے ہو کر کہا: اے بزرگانِ قریش! میری بات سنو کہ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس کے شاہد ہیں۔

یُنَادِیْهِمْ یَوْمَ الْغَدِیْرِ نَبِیُّهُمْ نُجِمٍ وَاَسْمِعْ بِالنَّبِیِّ مُنَادِیًا بِاَنِّیْ
مَوْلَاکُمْ نَعَمْ وَوَلِیُّکُمْ فَقَالُوْا وَلَمْ یَبْدُوْا هُنَاکَ التَّعَادِیَا اِلٰهَکَ
مَوْلَانَا وَاَنْتَ وَلِیُّنَا وَلَنْ تَجِدَنْ مِنَّا لَکَ الْیَوْمَ عَاصِیًا فَقَالَ لَهٗ قُمْ
یَا عَلِیُّ فَاِنَّنِیْ رَضِیْتُکَ مِنْ بَعْدِیْ اِمَامًا وَهَادِیًا فَمَنْ کُنْتُ

مَوْلَاہُ فَھٰذَا وَلِیُّہٗ فَکُوْنُوْا لَہٗ اَنْصَارَ صِدْقٍ مُوَالِیَا ھُنَاکَ دَعَا

اَللّٰھُمَّ وَالِ وَالِیَہٗ وَکُنْ لِلَّذِیْ عَادیٰ عَلِیًّا مُعَادِیَا

''غدیر کے روز حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند آواز سے فرما رہے تھے مقام خم میں اور حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی آواز تمام لوگوں کو خوب سنائی دیتی تھی کہ میں تمہارا مولا اور دین و دنیا میں تمہارے تمام امور کا مختار ہوں تو سب نے بغیر اظہار کراہت کے یک زبان جواب دیا کہ تیرا خدا ہمارا مولا ہے اور آپ تمام امور میں ہمارے ولی و حاکم ہیں اور اس معاملہ میں ہمارا کوئی فرد آپ کا نافرمان نہ ہوگا۔ پس حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اٹھو کیونکہ میں اپنے بعد تجھے امامت و ہدایت کے لئے نصیحت کرتا ہوں۔ پس جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ ولی ہے۔ پس تم لوگ اس کے دوست اور سچے مددگار بن جاؤ۔ پس دعا کی کہ اے خدا تو اس کو دوست رکھ جو اسے دوست رکھے اور تو علی علیہ السلام کے دشمن کا دشمن ہو۔''

۞ مناقب فاخرہ میں اس طرح منقول ہے کہ جب آیت بَلِّغْ مَا اتری اور حفاظت کا وعدہ ہو گیا تو حجۃ الوداع سے واپسی پر آپ نے لوگوں کو بلایا پس جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو۔

فَقَالَ النَّبِیُّ من اولی منکم بانفسکم فضجوا باجمعھم وقالوا اللہ ورسولہ فاخذ بید علی وقال من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ لانہ منی وانا منہ هو منی بمنزلۃ ہارون

من موسى الا انه لانبی بعدی وكانت اخر فريضة فرضها الله علی محمد ثم انزل الله اليوم اكملت لكم دينكم

''حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو تمہارے نفسوں سے اولی ہے تو سب نے بآواز بلند کہا کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔ پس علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ اے اللہ اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھ اس کے ناصر کی نصرت کر اور ذلیل کر اس کو جو علی علیہ السلام کو ذلیل کرے کیوں کہ وہ مجھ سے اور میں اس سے ہوں اور اس کی مجھ سے مثال ہارونؑ وموسیٰؑ جیسی ہے البتہ میرے بعد نبی کوئی نہ ہوگا اور یہی آخری فریضہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر نازل ہوا پھر خدا نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ نازل فرمایا۔''

اور تذکرہ خواص الامۃ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ صحابہ کرام و دیہاتی عربوں اور مکہ کے گرد و نواح کے لوگوں کا کل مجمع ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد پر مشتمل تھا اور یہ سب وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع کے مناسک ادا کئے اور اپنے کانوں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے یہ الفاظ سنے۔

⑨ اخطب خوارزمی نے مناقب میں حذیفہ یمانی اور ابوذر غفاریؓ سے روایت کی ہے کہ جب پیغمبر نے غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمایا تو حکم دیا کہ سلموا علی علی بامرة المومنین یعنی علی علیہ السلام کو حکومت وخلافت مومنین کا سلام کرو۔ اس کے بعد اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ والی آیت نازل ہوئی۔

بہر کیف شیعہ وسنی کتب میں حدیث تواتر منقول علمائے امامیہ نے

اس حدیث کی سند اور راویان حدیث کے موضوع پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں۔ چنانچہ تفسیر برہان میں شہر آشوب سے مروی ہے کہ میں نے ابو المعالی جوینی کو حالت تعجب میں دیکھا کہ کہہ رہا تھا۔ میں نے بغداد میں ایک کاتب کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی جس میں حدیث غدیر کے موضوع کی روایات درج تھیں اور کتاب کے سرورق پر لکھا تھا کہ یہ اٹھائیسویں جلد ہے حدیث من کنت مولاہ کے سلسلہ اسناد کے موضوع پر اور اس کے بعد اسی موضوع پر انتیسویں جلد لکھی جائے گی نیز آج کل اسی موضوع پر ایران کے ایک بزرگ علامہ عبدالحسین امینی مدظلہ، ایک مبسوط کتاب لکھ رہے ہیں۔ جس کا نام انہوں نے الغدیر ہی رکھا ہے۔ اور اس کتاب کی گیارہ جلدیں اس وقت چھپ چکی ہیں۔

خطبہ غدیر اور بیعت علیؑ

۞ تفسیر برہان میں روضۃ الواعظین سے ایک طویل روایت منقول ہے۔ جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے کہ جب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کے تمام احکام سوائے حج اور ولایت کے پہنچا چکے تو جبریل کا نزول ہوا اور عرض کی کہ خداوند کریم بعد تحفہ سلام کے فرماتا ہے کہ میں کسی نبی وسول کی قبض روح نہیں کرتا جب تک تکمیل دین نہ ہو جائے۔ اب آپ پر دو فریضے رہ گئے ہیں ایک حج اور دوسرا ولایت۔ پس آپ ان دونوں فریضوں کی ادائیگی کریں، نماز و روزہ کی طرح حج کے مناسک خود ادا کر کے ان کو سکھائیں۔ چنانچہ تمام لوگوں میں حضورؐ کی کی حج کا اعلان کر دیا گیا تو ستر ہزار یا اس سے زیادہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہمراہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ میں حاضر ہوئے۔ جس طرح کہ حضرت ہارونؑ کی بیعت کے وقت بنی اسرائیل کی بھی یہی تعداد تھی اور جس طرح انہوں نے سامری اور

گوسالہ کی اطاعت کر کے حضرت ہارون کو چھوڑ دیا تھا اسی طرح ان لوگوں نے بھی حضرت علی علیہ السلام کو چھوڑ کر اوروں کو آگے کر دیا (ترمذی اور بخاری وغیرہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ یہود ونصاریٰ کے نقش قدم پر چلو گے جو باتیں ان لوگوں میں تھیں تم میں انہی جیسی باتوں کا ظہور ہوگا اور ہم تفسیر کی دوسری جلد میں قدرے تفصیل سے اس مسئلہ کو ذکر کر چکے ہیں) حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب موقف پر کھڑے ہوئے تو جبرئیلؑ نے پیغام پروردگار پہنچایا کہ علوم انبیاء واسرار خاصہ اپنے وصی وخلیفہ علی بن ابی طالب کے سپرد فرمایئے۔ نیز تبرکات انبیاء بھی ان کے حوالہ کیجئے اور لوگوں میں اعلان کر کے ان کے لئے بیعت وخلافت کا عہد بھی لے لیجئے کیوں کہ اس کا اطاعت گزار میرا اطاعت گزار اور اس کا نافرمان میرا نافرمان ہوگا۔ اس کا عارف مومن اور اس کا منکر کافر ہوگا۔ بروز محشر جس کے پاس اس کی ولایت ہوگی وہ جنتی ہوگا اور اس کا دشمن جہنمی ہوگا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافق لوگوں کے حالات جانتے تھے۔ اب سوچا کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا اعلان کیا جائے تو یہ لوگ اعلانیہ دشمن ہو کر درپے ایذا ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس اعلان میں تاخیر کر دی۔ چنانچہ دوبارہ مسجد خیف میں وہی حکم لائے پھر سہ بارہ کراع الغمیم پر جبرئیل پھر وہی حکم لائے اور لوگوں کے شر وفساد سے عصمت کا وعدہ بھی خدا کی جانب سے پیش کیا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے قیام فرمایا۔ آگے جانے والوں کو واپس بلایا گیا اور پیچھے آنے والوں کی انتظار کی گئی۔ آپؐ راستہ چھوڑ کر دائیں جانب مسجد غدیر میں ٹھہرے اور نماز کی ادائیگی کا اعلان فرمایا اور درختوں کے نیچے جھاڑو دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ صحابہ نے عمل کیا۔ پھر ایک جگہ پتھروں کو جمع کرنے کا حکم دیا تا کہ منبر بن جائے۔ پس آپ منبر پر تشریف لائے اور خطبہ شروع فرمایا جس میں توحید وتقدیس ذات پروردگار بیان

فرمائی اور اس کے بعد آیہ مجیدہ یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا (الخ) پڑھ کر سنائی اور فرمایا کہ یہ حکم جبرئیل تین دفعہ لے کر پہنچا ہے کہ میں ہر سیاہ و سفید کو بتا دوں کہ حضرت علی علیہ السلام بن ابی طالب میرا بھائی وصی اور خلیفہ اور امت کا امام ہے۔ اے لوگو! خدا نے اس کو مہاجرین و انصار، شہری و دیہاتی، عجمی و عربی، غلام و آزاد خورد و کلاں اور سیاہ و سفید تمام کا ولی و امام واجب الاطاعت مقرر کیا ہے۔ اس کا تابعدار مرحوم اور اس کا مخالف ملعون ہوگا اور پھر امامت میری ذریت میں اسی کی ہی صلب سے ہوگی اور میں نے اپنے علوم علی علیہ السلام کو سونپ دیئے ہیں اور وہ امام مبین ہے۔ اس کی ولایت سے جی نہ چرانا کیونکہ یہ حق پر عمل کرتا ہے اور اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اس کی ولایت کے منکر کی توبہ قبول نہ ہوگی اور اس کے حق کے انکار والوں کی مغفرت نہ ہوگی۔

یاد رکھو میں زمینوں اور آسمانوں کی تمام مخلوق پر حجت خدا ہوں اور اس میں شک کرنے والا کافر اور مجھے یہ فضیلت خدا نے ہی عطا فرمائی ہے۔

میرے بعد تمام لوگوں سے حضرت علی علیہ السلام افضل ہیں۔ ہماری بدولت رزق نازل ہوتا ہے اور ہماری وجہ سے مخلوق باقی ہے اور جو میری اس بات کو ٹھکرائے گا وہ ملعون ہوگا اور اس پر غضب نازل ہوگا اور مجھے جبرئیل نے خبر دی ہے کہ جو علی علیہ السلام سے دشمنی رکھے گا اور اس کی ولا سے کنارہ کرے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔

اے لوگو! قرآن میں تدبر کرو اور اس کی آیات کو سمجھنے کی کوشش کرو لیکن اس کی تفسیر کوئی بھی نہ کر سکے گا مگر وہ جس کو میں اٹھا رہا ہوں۔ یہی جنب اللہ ہے جس کے متعلق ہے: یَا حَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ یہ اور اس کی اولاد طاہرین قرآن کے ساتھ دوسرا ثقل ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ

حوض کوثر پر پہنچیں گے۔ ہاں یادرکھو کہ میرے اس بھائی کے علاوہ دوسرا کوئی بھی امیر المومنین نہیں ہو سکتا اور میرے بعد سوائے اس کے کسی دوسرے کو امیر المومنین کہنا جائز نہیں ہے۔ پس علی علیہ السلام کے بازو کو پکڑا اور اس قدر بلند کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے پیر مبارک جناب رسول خداؐ کے گھٹنوں کے برابر ہو گئے اور فرمایا:

اے لوگو! یہ علیؑ میرا بھائی، وصی، میرے علم کا خزانہ اور میری امت پر میرا خلیفہ ہے۔ یہ قرآن کا مفسر اور اس کا داعی و عامل ہے۔ یہ خلیفہ رسول امیر المومنین اور امام وہادی ہے اور اللہ کے حکم سے ناکثین، قاسطین اور مارقین کو قتل کرنے والا ہے۔ خدا نے اپنے دین کو اس کی امامت کے ساتھ کامل کیا ہے۔ پس جو شخص اس کو امام زمانہ نہ مانے اور تا قیامت اس کی اولاد طاہرین کی امامت کا قائل نہ ہو تو اس کے تمام اعمال رائیگاں ہوں گے۔ خدا نے قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان والوں کا ذکر فرمایا ہے تو علی علیہ السلام صف اول میں شمار ہے۔ جہاں بھی قرآن میں مدح کی آیت موجود ہے تو وہ علی علیہ السلام کے حق میں ہے اور سورہ ھَلْ اَتٰی میں جنت کی شہادت خدا نے علی علیہ السلام کے لئے دی ہے اور اس سورہ میں ممدوح خدا علی علیہ السلام ہے اور بس۔ ہاں یادرکھو ہر نبی کی اولاد اپنی صلب سے ہوتی ہے اور میری اولاد علی علیہ السلام کی صلب سے ہے اس سے حسد نہ کرنا، ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اس سے شقی بغض رکھیں گے اور متقی محبت رکھیں گے اور خدا کی قسم سورہ والعصر علی علیہ السلام کی شان میں ہی نازل ہوئی ہے۔

لوگو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور اس نور پر جو اس کے ساتھ اترا۔ وہ نور مجھ میں ہے اور پھر علی علیہ السلام میں اور اس کے بعد اس کی نسل میں ہے حضرت قائمؑ تک، آگاہ ہو، علیؑ وہی صابر وشاکر ہے جس کی جزا کا خدا

نے وعدہ فرمایا ہے اوراس کے بعد اس کی صلب سے میری اولاد صابر وشاکر ہے۔

اے لوگو! میرے اوپر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ جتلاؤ اور یہ بھی تمہیں معلوم ہو کہ میرے بعد ایسے امام بھی پیدا ہوں گے جو جہنم کی طرف دعوت دیں گے۔ میں اور میرا خدا ان سے بری ہیں اور ان کے تابعدار سب دوزخ میں جائیں گے، میں صراط مستقیم ہوں اور میرے بعد میرا بھائی اور اس کے بعد میری اولاد جو اس کے صلب سے ہوگی۔

صراط مستقیم ہیں وہ اولیاء اللہ جن پر کوئی خوف وحزن نہ ہوگا۔ وہ ہم لوگ ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں مومنوں کی صفات کا ذکر ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو میرا اور میری اولاد کا دوست ہوگا اور یہی لوگ جنت میں بلاحساب داخل ہوں گے اور قرآن میں جہاں جہنیوں کے تذکرے ہیں ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان سے عداوت رکھتے ہوں گے۔ پس ہمارا دشمن اللہ کی لعنت میں ہے اور ہمارا دوست اللہ کا محبوب ہے اور یادرکھو کہ میں خدا کی طرف سے منذر ہوں اور علی علیہ السلام ہر قوم کا ہادی ہے اور میں نبی ہوں اور علیؑ وصی ہے اور ہمارے آئمہ کا خاتم حضرت مہدیؑ ہوگا۔ جو ظالموں سے انتقام لے گا اور وہ ہر علم کا وارث ہوگا۔

اے لوگو! میں تم کو خوب سمجھا چکا اور خطبہ کے تمام ہونے پر میں تم کو اس کی بیعت کی دعوت دوں گا۔ اس کے بعد آپ نے واجبات کی بجا آوری پر زور دیا اور ایک ایک فریضہ کا نام لے کر اس کی تاکید فرمائی اور پھر حرام سے بچنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ کوئی حلال ایسا نہیں مگر یہ کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں اور کوئی حرام نہیں جس سے میں نے تم کو روکا نہ ہو۔ بس موت کو یاد رکھو اور حساب ومیزان کا خیال رکھو اور ثواب وعقاب کے ذکر سے غفلت نہ کرو اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم سے اس امر کی بیعت لوں جو میں تمہارے سامنے

پیش کر چکا ہوں (علی علیہ السلام اور اس کی اولاد طاہرین کی امامت کے لئے) لیکن چونکہ تمہاری تعداد زیادہ ہے لہٰذا سب کے لئے ناممکن ہے کہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھیں۔

پس علی علیہ السلام کی خلافت اور اس کی اولاد امامت کو یوں عہد کرو کہ سب کے سب یک زبان کہہ دو کہ ہم راضی ہیں اور ان کی ہم اطاعت کریں گے اور ہم دل و جان اور دست ولسان اس معاملہ میں آپ کی بیعت کرتے ہیں اور ہم وعدہ شکنی نہ کریں گے۔ پس علی علیہ السلام کی بیعت کرو اور حسن و حسین علیہم السلام اور تمام آئمہ کی جو میری ذریت سے ہوں گے اور علی کی خلافت کا سلام کرو۔ پھر فرمایا: اے لوگو! بولو! تمام لوگوں نے یک زبان یہ آواز بلند کی کہ ہم سب راضی ہیں اور اپنے مقام سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے لگے اور اول وثانی ثالث نے سب سے پہلے بیعت کی اور سب لوگوں نے بیعت کی یہاں تک کہ رات کا اندھیرا چھا گیا اور مغرب وعشاء کی نماز اکٹھی ادا کی گئی اور اس کے بعد متواتر تین دن تک بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔

﴿۹﴾ ابنِ عباس سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: لوگو، خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ علی علیہ السلام کو خلیفہ وامام اور وصی مقرر کروں۔

لوگو! علی علیہ السلام میرے بعد ہدایت کا دروازہ اور خدا کی طرف دعوت دینے والا ہے اور وہ صالح المومنین ہے۔ لوگو! علی علیہ السلام مجھ سے ہے۔ اس کی اولاد میری اولاد ہے۔ وہ میری پیاری بیٹی فاطمہ کا شوہر ہے اس کا حکم میرا حکم اور اس کی نہی میری نہی ہے۔

لوگو! اس کی اطاعت کرنا اور اس کی نافرمانی نہ کرنا، کیونکہ اس کی اطاعت میری اطاعت اور اس کی نافرمانی میری نافرمانی ہے۔

معاشر الناس ان علیا صدیق هذہ الامة وفاروقها ومحد
ثها وانه هارونها ویوشعها واصفها وشمعونها وانه باب
حطتها وسفینة نخاتها انه طالوتها وذو قرینها معاشر الناس!
انه محنة الوری والحجة العظمیٰ والآیة الکبری وامام اهل
الدنیا والعروة الوثقی۔ معاشر الناس ان علیامع الحق والحق
معه وعلی لسانه معاشر الناس ان علیا قسیم النار لاید خلها
ولی له ولاینجو منها عدوله وانه قسیم الجنة لایدخلها دوله
ولایزحزح عنها ولی له

"لوگو! علی علیہ السلام اس امت کا صدیق وفاروق اور محدث ہے اور وہ اس امت کا ہارون ویوشع وآصف وشمعون بھی ہے نیز وہ اس امت کی بخشش کا دروازہ اور کشتی نجات ہے اور نیز اس امت کا طالوت ذوالقرنین ہے۔ لوگو! یہ خدا کی نعمت حجتِ عظمیٰ اور اس کی آیتِ کبریٰ ہے اور وہ دنیا والوں کا امام اور مضبوط جائے تمسک ہے۔ لوگو! علی علیہ السلام حق کے ساتھ اور حق اس کے ساتھ اور اس کی زبان پر ہے۔ لوگو! علی علیہ السلام قسیم النار ہے کہ جہنم میں اس کا دوست نہ جائے گا اور اس کا دشمن بچ نہ سکے گا اور علی قسیم الجنہ ہے کہ اس میں اس کا دشمن نہ جا سکے گا اور دوست اس سے رہ نہ سکے گا۔ (الخ)

(۹) تفسیر برہان میں احتجاج طبرسی سے مروی ہے کہ جب حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہوا تو لوگوں میں ایک وجیہہ وخوبصورت شخص نمودار ہوا جس سے خوشبو مہک رہی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ آج حضرت رسول خدا صلی اللہ

علیہ والہ وسلم نے اپنے چچا زاد کے لئے کس قدر سخت و مضبوط عہد و پیمان لیا جس کو سوائے کافر کے کوئی بھی کھولنے کی جرأت نہ کرے گا اور لمبا عذاب ہوگا اس شخص کے لئے جو اس کو کھولے گا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا کلام سنا تو اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی دلربا شکل اس کو خوب پسند آئی۔ پس خدمت اقدس نبوی میں عرض کی کہ حضور! آپ نہیں سنتے۔ یہ شخص کیسی باتیں کر رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: اے عمر! تم جانتے ہو یہ شخص کون ہے؟ حضرت عمر نے جواب دیا کہ نہیں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم! تو آپ نے فرمایا یہ روح الامین حضرت جبرئیل ہیں۔ خبردار! اس گروہ کو کھولنے کی کوشش نہ کرنا اور اگر تم نے ایسا کیا تو خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومن اور ملائکہ سب تم سے بے زار ہوں گے۔

⑯ تفسیر مذکور میں مناقب بن مغازلی شافعی سے بروایت ابی ہریرہ منقول ہے کہ جو شخص ۱۸ ذی الحجہ کا روزہ رکھے اس کے نامۂ اعمال میں ساٹھ ماہ کے روزوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور یہی وہ غدیر خم کا روز ہے جس میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے لئے بیعت لی تھی اور فرمایا تھا اے اللہ تو اس کو دوست رکھ جو علی علیہ السلام کو دوست رکھے اور تو اس کو دشمن رکھ جو علی علیہ السلام سے عداوت کرے اور اس کی مدد کر جو علی علیہ السلام کی مدد کرے۔ پس حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی علیہ السلام کو ان لفظوں سے مبارک باد پیش کی:

بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا عَلِیَّ بنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَمَوْلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَۃٍ

"یعنی مبارک مبارک اے فرزند ابو طالب کہ آپ میرے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے سردار و مولا ہو گئے ہیں۔"

اس کے بعد خداوند کریم نے یہ آیت بھیجی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ

سبط بن جوزی سے مروی ہے کہ قصہ غدیر یقیناً حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حجۃ الوداع سے واپسی کے موقعہ پر ۱۸ ذی الحجہ کو تھا اور اسی پر علماء کا اتفاق ہے اور ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع میں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے خلافت وولایت کا اعلان فرمایا تھا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مقام تاسف وتحسر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگوں کو صرف دو گواہوں کے کہنے سے حقوق بین سے کھلی ہوئی گمراہی اور بغاوت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟

فضیلت عید غدیر اور اس کے اعمال

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے لئے وہ دن انتہائی طور پر متبرک ہے جس دن خدا کی طرف سے اس کے کامل ہونے کی سند پہنچی اور نعمت خداوندی تمام ہوئی اور خلاق عالم نے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا اور شیعان آل محمدؑ کے لئے تو یہ دن خصوصیت سے برکت وعزت کا حامل ہے کہ اس دن حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو خداوند کریم نے نامزد فرمایا اور خم غدیر کے ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مجمع میں اپنے پیغمبر کی زبانی اس کا اعلان عام فرمایا اور بہانگ دہل یہ اعلان کیا گیا کہ دین اسلام اس قابل ہوا کہ ارشاد قدرت ہوا:

رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

''یعنی میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو ہی پسندیدہ دین قرار دیا۔''

تفسیر لوامع التنزیل میں امالی صدوق وغیرہ سے منقول ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام اپنے آبائے طاہرین علیہم السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت

مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا غدیر کا روز میری امت کے لئے تمام عیدوں سے افضل ہے اور یہ وہی دن ہے جس میں میں نے خدا کے حکم سے اپنے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کو امت کے سامنے خلیفہ مقرر کیا، تاکہ میرے بعد اس سے ہدایت حاصل کرتے رہیں اور یہی وہ دن ہے جس میں خدا نے اپنے دین کو کامل کیا اور میری امت پر نعمت تمام فرمائی اور دین اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا اور کافی سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ جمعہ، عید فطر اور عید قربان کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی اور عید بھی ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ایک ایسی عید ہے کہ ان تمام عیدوں سے اس کی عزت زیادہ ہے۔ راوی نے پوچھا حضور وہ کونسی عید ہے؟ آپ نے فرمایا وہ وہ دن ہے جس میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے لئے نصب فرمایا اور فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے اور وہ ۱۸ ذی الحجہ کا دن ہے۔

① حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ عید غدیر کا روزہ تمام دنیا کی زندگی کے روزں کے برابر ہے۔ یعنی اگر کسی کو ابتدائے دنیا سے انتہاء دنیا تک کی عمر ملے اور وہ تمام عمر روزے رکھتا رہے تو صرف عید غدیر کے روزہ کا ثواب ان تمام روزوں کے برابر ہوگا۔ نیز عید غدیر کا روزہ اللہ کے نزدیک ایک سو حج اور ایک سو عمرہ کے ثواب کے برابر ہے۔

② خداوند کریم نے جس قدر انبیاء بھیجے وہ سب اس دن کو عید مناتے تھے اور اس کو محترم سمجھتے تھے اور ہر نبی نے اپنے وصی کو اس دن کے عید منانے کے وصیت کی اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو وصیت کی کہ اس دن کو عید منائی جائے۔

۳ جو شخص اس روز کسی مومن کو کھانا کھلائے وہ ایسا ہے جس طرح کہ اس نے دس فخام کو کھانا کھلایا ہو اور ایک فخام ایک لاکھ کا ہوتا ہے اور وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے قحط سالی کے زمانہ میں تعداد مذکور کے برابر انبیاء و اوصیاء و شہداء و صلحا کو کھانا کھلایا۔

۴ اس دن ایک درہم صدقہ کرنا دوسرے دنوں کے ایک لاکھ کے صدقہ کے برابر ہے۔

۵ امام نے فرمایا یہ گمان نہ کرو کہ کوئی دن اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ حرمت و عزت والا ہوگا ہرگز نہیں۔

۶ شیخ طوسیؒ اور علامہ مجلسیؒ سے منقول ہے کہ محمد بن فیاض کہتا ہے کہ میں مرو میں بروز غدیر خدمت امام رضاؑ میں حاضر تھا۔ حضرت نے اس دن اپنے مخصوص اصحاب و شیعوں کو جمع کیا ہوا تھا اور رات کو ان کی افطاری کا انتظار فرمایا ہوا تھا اور ان کے گھروں میں کھانا و دیگر خلعت ہائے فاخرہ بھی آپ نے بھجوائی تھیں حتیٰ کہ اپنی نعلین اور انگشتر بھی بھجوا دی تھی اور غلاموں کو اس دن نہایت عمدہ نفیس لباس عنایت فرمائے تھے اور آپ نے اس دن کے فضائل تمام صحابہ و شیعہ کے سامنے بیان فرمائے۔ من جملہ ان کے یہ فرمایا کہ زبان خلافت حضرت امیر علیہ السلام میں ایک دفعہ جمعہ کو اور غدیر کا ایک دن میں اتفاق ہوا تو حضرت نے طلوع شمس سے ۵ گھنٹہ بعد خطبہ شروع فرمایا (موسم سرما میں زوال آفتاب اتنی دیر میں ہو جایا کرتا ہے) اور اس دن کے بہت سے فضائل بیان کئے اور فرمایا کہ اس دن اپنے برادران ایمانی سے احسان کرو اور ایک دوسرے کو مبارک باد کہو۔

⑦ اس دن ایک دوسرے پر احسان کرنا مال وعمر کی زیادتی کا موجب ہوتا ہے۔

⑧ ایک دوسرے پر مہربانی کرنا رحمت خداوندی کی زیادتی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

⑨ اس دن عیال واطفال وبرادران وجملہ امید کنندگان اور غلامان وکنیزان پر بخشش واحسان کرنا چاہیے۔

⑩ جو شخص اس دن مومن کی حاجت پوری کرے۔قبل اس کے کہ وہ اس کا اظہار کرے اور بخوشی ورضا اس کے ساتھ احسان کرے تو ایسا ہے جیسا کہ اس نے اس دن کا روزہ رکھا ہو اور اس کی ساری رات عبادت خدا میں بسر کی ہو۔

⑪ اور جو شخص بوقت شب ایک مومن کو افطاری دے یعنی اس کو کھانا کھلائے تو گویا اس نے ایک ہزار پیغمبر وشہید وصدیق کو کھانا کھلایا۔تو کتنا عظیم ثواب ہوگا اس شخص کے لئے جو کئی مومن مردوں اور عورتوں کی خبر گیری کرے اور اگر کوئی شخص ایسا کرنے والا ہو تو میں ضامن ہوں کہ خدا اس کو کفر وفقر کی موت نہ دے گا اور اگر اس دن مر گیا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

⑫ اگر کوئی شخص اس دن برادران ایمانی کے لئے قرض اٹھائے گا تو میں ضامن ہوں کہ ادائیگی قرضہ تک خدا اس کو زندگی دے گا اور مرے گا تو خدا اس کے قرض کی ادائیگی کا بندوبست فرمادے گا۔

⑬ اس دن جب ایک دوسرے سے ملاقات کرو تو مصافحہ کرو اور ایک دوسرے کو مبارک باد کہو (لوامع التنزیل)

⑭ مفضل بن عمرو نے حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آیا عید غدیر کا روزہ رکھوں تو آپ نے فرمایا ہاں خدا کی قسم اور تین بار آپ نے قسم کھائی اور فرمایا اسی دن خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی اور انہوں نے

شکریہ میں روزہ رکھا اور اسی دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آتش نمرود سے نجات پائی اور خوشی میں روزہ رکھا۔ اور اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اپنا وصی مقرر کیا تو انہوں نے خوشی میں روزہ رکھا۔ اور اسی روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شمعون کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور شکریہ میں روزہ رکھا اور اسی دن حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بھائی حضرت علی علیہ السلام کو وصی و جانشین مقرر کیا۔ اور لوگوں میں اس کا اعلان کیا اور اس نعمت خداوندی کے شکریہ میں روزہ رکھا۔

(۲۰) یہ دن عبادت کا ہے اور مومن بھائیوں کو کھانا کھلانے اور ان سے نیکی کرنے کا دن ہے اور امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ اگر لوگ اس دن کی فضیلت کو اس طرح جانتے جس طرح جاننے کا حق ہے تو ہر روز دس مرتبہ ملائکہ کرام ان کا مصافحہ کرتے۔

(۲۱) اس دن خدا مومنوں سے راضی ہوتا ہے اور شیطان کا ناک خاک سے رگڑا جاتا ہے۔

(۲۲) مصباح المتہجد سے جو خطبہ حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ اور حضرت یوشعؑ اور حضرت شمعونؑ کا یہی دن ہے یعنی وہ بھی اسی دن میں اپنے عہدہ جلیلہ پر فائز المرام ہوئے۔

(۲۳) اس روز حضرت علی علیہ السلام کے فضائل و مناقب کا مذاکرہ کیا جائے اور محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا جائے۔

(۲۴) اس روز خوشی منانی چاہیے لیکن نہ کہ جوا بازی و شراب خواری سے یا لہو ولعب اور شیطانی طریقہ سے بلکہ ایک دوسرے کی حاجت روائی باہمی خوشنودی اور ذکر

خدا ورسولؐ اور ذکر اہل بیتؑ سے۔

۱۰ اس دن کے روزہ کا ثواب بھی زیادہ ہے تو اگر کوئی شخص اس دن روزہ رکھے اور دوسرا مومن بقصد ثواب اس کو اپنے ہاں کھانے کے لئے دعوت دے تو روزہ دار مومن کو چاہیے کہ اپنے روزہ کا اظہار نہ کرے اور اس کی دعوت کو قبول کرلے اور اس کے ہاں کھانا کھالے اور اگر ایسا کرے گا تو اس کو ستر سال کے روزوں کا ثواب مزید ملے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ عام طور پر جو مروج ہے کہ روزہ دار اس نیت سے روزہ رکھ لیتے ہیں کہ ابھی کوئی افطار کرائے گا، بلکہ روزہ رکھنے سے قبل اس قسم کے منصوبے تیار کرلئے جاتے ہیں پس روزہ کا نام کرلیا اور صبح کو ایک دوسرے کو افطار کرالیا۔ میرے خیال میں نہایت مذموم رواج ہے اور شرعی حکم سے تمسخر کے مترادف ہے بلکہ اس طرح چاہیے کہ روزہ رکھنے والوں کو افطاری کی توقع نہ ہو اور نہ اس توقع کے ماتحت وہ روزہ رکھے۔ ورنہ در حقیقت اس قسم کا روزہ روزہ کہلانے کا مستحق ہی نہ ہوگا اور اسی طرح افطار کرانے والا یہ علم نہ رکھتا ہو کہ اس کو روزہ ہے اور اگر بالفرض اس کو علم ہے تو پھر دعوت نہ دینی چاہیے۔ ہاں اگر اس نے چند مومنوں کو دعوت دی اور ان میں سے بعض کو یا سب کو حسن اتفاق سے روزہ ہو تو ان کو بلا اظہار کھانا کھالینا چاہیے۔ دریں صورت ہر دو کو ثواب ملے گا۔ واللہ اعلم

۱۱ اس روز غسل کرنا اور حضرت امیر علیہ السلام کی زیارت کرنا سنت ہے اور کتاب مفاتیح الجنان میں اس دن کی زیارت مخصوصہ اور ادعیہ منقولہ موجود ہیں۔

۱۲ اس دن زوال آفتاب سے نصف گھنٹہ پہلے دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد دس مرتبہ قل شریف اور دس مرتبہ انا انزلناہ اور

دس مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھے۔ اس کا ثواب ایک لاکھ حج اور ایک لاکھ عمرے کے برابر ہوگا اور دنیا و آخرت کی حاجات میں سے جو بھی سوال کرے گا خدا قبول فرمائے گا اور اس کی حاجت پوری کرے گا۔

۲۲ امام رضا علیہ السلام نے ابونصر بزنطی سے فرمایا کہ اے ابونصر تو جہاں بھی ہو غدیر کے روز حضرت علی علیہ السلام کی قبر پر پہنچنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس دن خدا ہر مومن مرد یا عورت کے ساٹھ سالہ گناہ بخش دیتا ہے اور ماہ رمضان اور شب قدر اور شب عید الفطر کے برابر گنہگاروں کو آتش دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین اسلام بیعت غدیر کے بعد کامل ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے قبل کامل نہ تھا بلکہ ناقص تھا۔ لہٰذا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیئس سالہ زندگی میں صحابہ کرام ناقص دین پر رہے اور حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی ناقص دین کے ترجمان رہے اور اس دور میں جن جن صحابہ کبار کا انتقال ہوا یا جو صحابہ مختلف جہادوں میں شہید ہوئے وہ سب کے سب ناقص دین پر رہ کر مر گئے یا نقص دین کے لئے جہاد کر کے دنیا سے کوچ کر گئے۔ لہٰذا وہ لوگ قابل مدح وثناء نہ رہے اور نہ ان کا ایمان موجب نجات وفلاح ہوا حالانکہ وہ لوگ یقیناً قابل مدح تھے اور ناجی تھے اور قرآن کریم اس کا شاہد ہے۔

جواب: دین اسلام ہر زمانہ میں کامل رہا لیکن ہر زمانہ کا کمال اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تھا۔ یعنی گزشتہ زمانہ کے لحاظ سے کامل تھا لیکن مستقبل کے اعتبار سے وہ بعض اوقات ترمیم یا تنسیخ یا اضافہ کا محتاج ہوتا تھا۔ مثلاً ابتدائے اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تو فلاح پاؤ گے تو اس وقت وقتی تقاضا کے لحاظ سے دین اسلام کلمہ توحید کے اقرار کرنے کا نام تھا

اور فلاح کا دارومدار اسی پر تھا۔ جب لوگ اس زینہ پر پہنچ گئے تو یکے بعد دیگرے موزونیت ومناسبت کے لحاظ سے احکام شرعیہ کا اضافہ ہوتا گیا اور بعض احکام میں مصلحت کے لحاظ سے ترمیم وتنسیخ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور اس سلسلہ کی ہر کڑی یا اس منزل کا ہر زینہ اپنے مقام پر ماضی کے اعتبار سے کامل تھا لیکن مستقبل کے لحاظ سے اس میں معمولی ردوبدل یا اضافہ کی گنجائش رہی جو خدا کے علم میں تھی۔ پس ہر دور کا مسلمان اپنے زمانہ کا کامل الایمان تھا اور ان کی موت کمال ایمان پر تھی اور جب کہ اسلام کے تمام احکام وفرائض لوگوں تک پہنچا دیئے گئے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دے دیا تو تعلیمات اسلامیہ کی بقاء کے لئے ضروری تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بعد کوئی ایسا شخص نامزد ہو جو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی طرح دین اسلام کا ذمہ دار قرار دیا جاسکے اور چونکہ اس دین کا کمال صرف ماضی کی مناسبت سے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے یہ دین کامل ہے اور اب تا قیامت اس میں نہ کسی ردوبدل کی گنجائش ہے اور نہ اضافہ کی ضرورت ہے تو اس کی تعلیمات کا انچارج جب تک معین نہ ہو اس وقت تک اسلام کو دین کامل کہنا لغو اور بے معنی رہ جاتا ہے کیوں کہ حسب ضرورت ادویہ کا وجود کسی دارالشفا کے کامل ہونے کی سند نہیں بن سکتا جب تک ان کے سمجھنے سمجھانے اور برمحل استعمال کرانے والا ماہر ڈاکٹر اس کا انچارج مقرر نہ ہو۔ اسی طرح محکمہ تعلیم کی طرف سے سکولوں کا اچھا نصاب سکولوں کی کامیابی وکمال کا ضامن نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ ذمہ دار اساتذہ اور دیانت دار معلمین کا انتخاب نہ ہو۔ بنابریں مقام خم غدیر میں بحکم خدا تعلیمات اسلامیہ کی بقا کے لئے جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو بحیثیت اپنے جانشین کے مقرر فرمایا اور ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع

عام میں اس کا اعلان فرمایا اور عملی طور پر بیعت بھی لے لی تو دین اسلام کا آخری فریضہ ادا ہو گیا۔ پس ارشاد قدرت ہوا کہ آج میں نے دین کو کامل کر دیا اور نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے پسندیدہ دین قرار دیا۔ پس دین کا یہ کمال صرف ماضی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ مستقبل میں بھی اس پر کسی نسخ یا اضافہ کی گنجائش نہیں رہی اس لئے اس کو کامل آج کہا گیا۔ یعنی دین اسلام ابتداء سے لے کر آج تک ہر لحظہ بہ لحظہ کامل تھا لیکن ہر لحظہ و وقت کا کمال محدود تھا اور آج بروز غدیر ایسا کامل ہوا ہے کہ اس کے کمال کی حد قیامت ہی ہے۔

تمام اور کمال میں فرق

تمامیت کسی چیز کی ذاتی اجزاء کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کمال خارجی صفت کے پیش نظر ہوتی ہے۔ مثلاً جسم انسانی میں تمام اجزائے بدن کا پایا جانا ہے تمامیت اور بدن کی تمامیت کے بعد روح کا آنا ہے کمال۔ اسی طرح ہر عضو بدن میں اپنے ضروری اجزاء و مواد کا وجود ہے تمامیت اور اس میں جوہر روح کا وجود ہے کمال۔

اس تمہید کو سمجھنے کے بعد یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی کہ ولایت علی علیہ السلام کو باقی فرائض و احکام اسلامیہ سے کیا نسبت ہے؟ اعلان ولایت کے بعد خداوند کریم دین اسلام کو کمال کی سند دے رہا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اعلان رسالت سے اعلان ولایت تک کے (۲۳) سال دور میں علم خداوندی کے اعتبار سے اسلامی ڈھانچہ میں وقتی مناسبت و مصلحت کے مطابق فرائض و احکام کی بحیثیت اجزاء ضروریہ کے آمد ہوتی رہی اور غیر ضروری اور مضر مواد کا قلع قمع کیا جاتا رہا اور ہر دور میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرپرستی اسلامی جسم کا روح رواں تھی لہٰذا ہر دور میں وہ وقتی طور پر کامل تھا۔ لیکن اب جب کہ جسم اسلام میں تمام

اجزاء ضرور یہ موجود ہو گئیں اور بڑھاؤ ختم ہو گیا اور عنقریب سائیہ رسالت بھی سر سے اٹھنے والا تھا تو ضروری تھا کہ اس کو جوہر رُوح ایسا عطا کیا جائے جو اسلام کو تا قیامت زندہ رکھے اور وہ تھا جوہر ولایت۔ کیونکہ نبوت کی حد ختم ہو گئی لیکن ولایت کی حد قیامت تک ہے۔ جس طرح کہ اسلام کی آخری حد قیامت ہے۔ پس چونکہ ولایت جسم اسلام کے لئے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کے اعلان کے بعد اسلام کو کامل کہا گیا ورنہ احکام حج کے بیان کے بعد اس کو تمامیت تو حاصل ہو گئی تھی۔ کیونکہ فرائض اسلام میں یہ آخری فریضہ تھا جس کو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے عمل سے تمام لوگوں کو سمجھا سکھا دیا تھا۔

خداوند کریم نے ولایت علی علیہ السلام کے بعد جس طرح اسلام کو کمال کی سند دی اس طرح نعمت کو تمامیت کی سند دی گویا تعلیمات اسلامیہ تمام ہو چکی تھیں۔ ان کے لئے جوہر روح کی ضرورت تھی تا کہ اسے کامل کہا جائے اور نعمات خداوندی جن کو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہوں وہ نا تمام کی نا تمام تھیں۔ ان میں سے ایک ایسے فرد فرید کی ضرورت تھی جس کے بعد اس کو تمام کہا جا سکے پس اعلان ولایت وخلافت نے جہاں ایک طرف اسلام کا روح رواں بن کر اس کو کمال کی سند دلوائی اس طرح نعمات الٰہیہ کی آخری فرد بن کر اس کو تمامیت کا تمغہ عطا کیا۔

لہٰذا اہل اسلام کے لئے ولایت علی علیہ السلام کی قدردانی دو پہلوؤں سے واجب وفرض ہے ایک تو اس لئے کہ ولایت علی علیہ السلام اسلامی ڈھانچہ کے لئے روح کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اسلامی کوئی فریضہ ہو جب تک ولایت علی علیہ السلام اس کی روح نہ ہو وہ مردہ کی حیثیت سے ہوگا اور اس کی قیمت کچھ بھی نہ ہوگی اور اس اعتبار سے اسلامی عبادت بے روح ہوگی۔ جس طرح اسلام اعلانِ غدیر کے بعد بغیر ولاء علی

علیہ السلام کے ناقص و بے روح ہے اسی طرح اس کا ہر حکم و فریضہ ولاء علی علیہ السلام کے بغیر مردہ ہے لہٰذا ہر مسلمان کو پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ میرے اسلام میں روح بھی ہے یا نہیں اور دوسرے ولایت علی علیہ السلام کی اس لئے بھی قدر ضروری ہے کہ خداوندی نعمات میں سے یہ وہ نعمت ہے کہ باوجود نعمات الٰہیہ کے شمار میں نہ آ سکنے کے اس کے اعلان نے نعمات کو تمامیت کا تمغہ دلوایا۔ گویا توحید و رسالت کے اقرار کے بعد یہ نعمت تمام نعمات کی رئیس ہے اور یہ نعمت زیادہ مستحق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ پس ہر مسلمان کے لئے شکر نعمت کی ادائیگی کے طور پر اور تعلیمات اسلامیہ بلکہ نفس اسلام میں روح پیدا کرنے کی خاطر ولایت علی علیہ السلام کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں اور جب ولاء علی علیہ السلام کو اسلام میں اس قدر ضروری قرار دیا گیا اور مسلمانوں پر اس کی اہمیت کو واضح کر دیا گیا تو کون منصف مزاج انسان ہے جو اس سے روگردانی کرے۔ تو اب خدا نے بھی اسی اسلام کے متعلق فرمایا: رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کہ تمہارے لئے میں نے اسلام کو دینی حیثیت سے پسند کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

زاہد تیری نماز کو میرا سلام ہے

بن حب اہل بیت عبادت حرام ہے

(تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۲۵ تا ۳۱)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

''اور یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے اور اس کا وہ عہد جو تم سے پکا باندھا اس نے جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا اور ڈرو خدا سے تحقیق اللہ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔''

وفائے عہد کی تاکید

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ: یعنی اللہ کی تمام نعمات کو یاد کرو تا کہ منعم کی یاد آ جائے اور اس کے شکر کی رغبت پیدا ہو، نعمت کو واحد لایا گیا ہے اور اس سے مراد معنی جنسی ہے اور اس نعمت کا ہر فرد اس میں داخل ہے۔

وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ: اس عہد و میثاق سے کیا مراد ہے تو اس میں کئی اقوال ہیں۔ مثلاً یہ کہ بنی اسرائیل کو خطاب ہے کہ اپنا عہد یاد کرو اور اس کی وفا کرو جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے متعلق تم پہلے کر چکے ہو اور یہ قول نہایت کمزور ہے کیونکہ اس سے پہلے ایمان والوں کو نماز کا حکم ہے اور ان کو وضو و تیمم اور غسل جنابت وغیرہ کے احکام بتلائے ہیں اور وَاذْكُرُوْا کا عطف ہے اسی پہلے جملے پر۔ لہٰذا ابن اسرائیل کا عہد مراد ہونا بعید ہے اور سب اقوال سے صحیح قول وہ ہے جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہاں عہد و میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے لیا تھا۔ تحریم محرمات اور کیفیت طہارت اور فرض ولایت نیز آیات کلام اللہ کا ربط و نسق مطالب کا مقتضا بھی یہی ہے کہ عہد و میثاق سے یہاں مراد عہد غدیر ہو پس اس مقام پر نماز کے فریضہ کی طرف متوجہ فرما کر اپنے کئے ہوئے عہد پر پکار ہنے کی تلقین فرما رہا ہے کہ خدا کے احسان کو نہ بھولنا اور اپنے وعدہ کو یاد رکھنا جب کہ تم سب اقرار کر چکے ہو کہ ہم اطاعت کریں گے اور اس بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ نظام امت کی برقراری و پائیداری اس امر پر موقوف ہے کہ ان کے اوپر ایک حاکم و متصرف موجود ہو جو ان کو اپنے اپنے فرائض کی طرف بھی متوجہ کرتا رہے اور ان کے باہمی حقوق کی نگہداشت بھی کرے اور بحکم خدا مقام غدیر میں حضرت علی علیہ السلام کو جناب

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین نصب فرمایا اور تمام لوگوں سے ان کی اطاعت کا عہد بھی لیا پس خدا نے اسلام کو تکمیل کی سند دی اب پھر بطور تاکید کے ارشاد فرماتا ہے کہ اس عہد پر پکا رہنا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: اس فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ عہد کرنے والوں میں سے بعض کے دلوں میں کچھ کدورت تھی یعنی زبان پر اقرار اور باطن میں انکار تو خداوند کریم ان کو متنبہ فرما رہا ہے کہ میں سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہوں اور تم مجھ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے ہو۔ لہٰذا مجھ سے ڈرو اور اپنے عہد سے کنارہ کشی اختیار نہ کرو۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۱۷)

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ

"تحقیق آپ کا تمہارے پاس اللہ سے نور اور کتاب مبین آیا ہے۔"

نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ: کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور نور کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے لیکن اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہی صورت عقل کے فیصلہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ کتاب پڑھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کا پڑھنا عام کتابوں کے پڑھنے کی طرح تو ہے نہیں بلکہ اس کو پڑھنے سے مراد اس کا سمجھنا ہے تو جس روشنی میں ہم نے اس کو سمجھنا ہے وہ دنیاوی ظاہری روشنی نہیں ہے کیونکہ اس ظاہری روشنی میں کتاب پڑھی تو جاسکتی ہے لیکن سمجھی نہیں جاسکتی پس اس جگہ نور سے مراد عام روشنی نہیں بلکہ اس سے مراد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور انہی کی بدولت قرآن فہمی ہو سکتی ہے اور چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے ورنہ کہنے کو عذر باقی رہ جائے گا کہ ہم کتاب کو کیا کرتے جب کہ ہمارے پاس نور ہی موجود نہ تھا۔

پس خداوند کریم نے قیامت تک کے لئے نور کا انتظام فرمایا چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کے متعلق خود سرور کائنات نے فرمایا:

اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ

"یعنی میں اور علی علیہ السلام ایک نور سے ہیں۔"

اور خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

اَنَا مُحَمَّدٌ وَمُحَمَّدٌ اَنَا وَاَنَا مِنْ مُحَمَّدٍ وَمُحَمَّدٌ مِنِّیْ۔

"یعنی میں اور محمدؐ ایک ہیں، میں محمدؐ سے ہوں اور محمدؐ مجھ سے ہیں۔"

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْعَلِیِّ۔

"علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَکُلُّنَا مُحَمَّدٌ۔

"ہمارا اول محمدؐ ہمارا آخری محمدؐ ہمارا اوسط محمد اور ہم سب کے محمدؐ ہیں۔"

اس حدیث کو اور اس قسم کی دیگر احادیث کو ہم نے باتفصیل تفسیر کی پہلی جلد یعنی مقدمہ تفسیر میں مقبولیت اعمال اور ولایت آلِ محمدؐ کے عنوانوں میں بیان کر دیا ہے پس جب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور ہیں اور نور کی جگہ نور ہی کام آ سکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے لے کر مہدی تک جو سب کے سب نور ہیں اور نور محمدی کے ہی اجزا ہیں۔ وہ اس کتاب کے ساتھ ہیں پس قرآن مجید رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں ان کے بیان کی روشنی کا محتاج تھا اور آپ کے بعد ان کے حقیقی جانشینوں کے بیانات کا محتاج ہے

اسی بناء پر تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو متعدد مرتبہ ارشاد فرمایا:

اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِيْ......

"یعنی میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری عترت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی۔"

یہاں تک کہ حوض کوثر تک تمہیں میرے پاس پہنچا دیں گی اور نیز فرمایا: عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ یعنی علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ ہے اور ثقلین کے عنوان کے تحت ہم اس بیان کو وضاحت سے مقدمہ تفسیر میں لکھ چکے ہیں اور صواعق محرقہ سے منقول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُعَلِّمُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ اَعْلَمُ مِنْكُمْ

"کہ اہل بیت کو تم نہ سکھانا کیونکہ وہ تم سے اعلم ہیں۔"

لیکن ان تصریحات کے باوجود کہنے والوں نے کہہ دیا کہ:

حَسْبُنَا كِتَابَ اللهِ

"ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔"

اور یہی وجہ ہے کہ امت اسلامیہ افتراق کا شکار بن گئی ورنہ اگر وصیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل ہوتا اور قرآن کو خدا کے فرستادہ نور کی روشنی میں پڑھا سمجھا جاتا تو اسلام کا شیرازہ منتشر نہ ہوتا۔ خداوند کریم نے اپنی کتاب بھیج کر اس کے معلم بھی اپنی جانب سے بھیجے اور ان کو نور کے مقدس لقب سے نوازا اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سکولوں کا کورس اور کتابیں جب حکومت تجویز کرتی ہے تو ان کے مدرس بھی حکومت اپنے مقررہ کردہ نصاب کے ماتحت متعین کرتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا اور یہ نہ ہو سکتا ہے کہ کورس حکومت بھیجے اور مدرس خود سکول کے لڑکے مل جل کر تجویز کریں ورنہ نتیجہ معلوم

ہی ہے لیکن عجیب منطق ہے امت رسول ہی کہ کتاب بھیجے خدا اور کتاب کا معلم تجویز کریں ہم عقل و دانش سمجھنے سے عاجز ہے، تفسیر قمی میں ہے کہ یہ نور سے مراد حضرت امیر المومنین اور باقی ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں وھو الحق۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵ ص ۸۰)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

”اے ایمان والوں جب تیاری کرو نماز کی تو دھوؤ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے بعض حصہ سر کا اور پورے پاؤں کا ٹخنوں تک۔“

پاؤں کا مسح

أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ: اس کی قرأت میں اختلاف ہے۔ بعض قاریوں نے أَرْجُلَكُمْ کی لام کو فتح زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض قاریوں نے ارجلکم کی لام کو کسرہ زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں قفال سے نقل کرتا ہے کہ ابن عباس، انس بن مالک، عکرمہ، شعبی اور امام محمد باقر علیہم السلام پاؤں کا مسح واجب جانتے ہیں پھر مسح کے وجوب کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

دلیل نمبر 1: اگر أَرْجُلِكُمْ کے لام پر کسرہ پڑھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ أَرْجُل کا عطف ہے رؤس پر چونکہ

① حدث کسی مقام سے خارج ہوتی ہے اور دھویا کسی اور مقام کو جاتا ہے۔

② وضو کرنے والے کے اعضاء پہلے بھی پاک ہوتے ہیں پھر دوبارہ دھونے کا حکم تحصیل ہے۔

④ تیمم وضو کا قائم مقام ہے حالانکہ دھونا اور گرد آلود کرنا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

④ موزوں پر مسح کرنا پاؤں کے دھونے کے قائم مقام ہے۔

⑤ بدبودار پاک پانی سے وضو ہو سکتا ہے حالانکہ عرق گلاب سے نہیں ہو سکتا۔ پس ان پانچ وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کی مصلحت ہماری عقول سے بالاتر ہے لہٰذا وضو کے افعال میں نص سے باہر نہ جانا چاہیے۔ یہ ہے رازی کی اصل عبادت کا ترجمہ تو میں پوچھتا ہوں جب اس بات کا اعتراف ہے کہ وضو کے مصالح ہماری عقل و دانش سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا نص سے آگے قدم نہیں رکھنا چاہیے تو حضرت! پاؤں کے مسح کے وجوب کے بارے میں آپ اپنی عقل و دانش کو کیوں گھسیڑ رہے ہیں۔ جب نص قرآنی کہتی ہے کہ پاؤں کا مسح واجب ہے خواہ اَرْجُلِكُمْ پڑھا جائے یا اَرْجُلَكُمْ پڑھا جائے اور آپ کی بیان کردہ دلیلیں کہتی ہیں کہ مسح واجب ہے پھر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دھونے میں مسح آجاتا ہے لہٰذا احتیاط دھونے میں ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ شاید مصلحت خداوندی صرف مسح کرنے میں ہو۔ اور دھونے میں نہ ہو۔ آپ کی عقلی احتیاط نص قرآنی کے مقابلہ یہاں کیوں نکل آئی؟ پس صریح حکم قرآنی کو چھوڑ کر حدیث کا سہارا لینا مذہب اہل بیت سے کنارہ کشی کا ایک بہانہ ہے ورنہ اسے معلوم ہے کہ وہ حدیث حدیث نہیں جو مخالف قرآن مجید ہو اور پھر یہ کہنا کہ دھونے میں مسح آہی جاتا ہے۔ عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے جب کہ وہ اس امر کا معترف ہے کہ حکمت وضو ہماری عقول سے بالاتر ہے۔

اقول: بعض لوگ جو پاؤں کے دھونے کے قائل ہیں وہ پاؤں کا دھونا قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: اَرْجُلَكُمْ کا عطف

وُجُوْهَكُمْ پر ہے اور یہ اِغْسِلُوْا کا معمول ہے لیکن قرآن کے اسلوب بیان اور نظم مطالب سے بعید ہے کہ اَرْجُلَكُمْ کو اِغْسِلُوْا کا معمول قرار دیا جائے کیونکہ ایک فعل کے معمولات ذکر کرنے کے بعد صرف عطف لا کر دوسرے فعل اور اس کے معمولات کا ذکر کرنا اس وقت درست ہوتا ہے جب کہ پہلے فعل کے معمولات یا متعلقات میں سے کوئی چیز بچ نہ جائے یعنی جملہ معطوف علیہ کی تمامیت کے بعد جملہ معطوفہ لانا چاہیے ورنہ بیان کا نظم اور سلاست ختم ہو جائے گی اور تعقید پیدا ہو جائے گی جو فصاحت کلام کے منافی ہے نیز یہاں اگر اَرْجُلَكُمْ کو اِغْسِلُوْا کا معمول قرار دیا جائے تو اس کا مقصد یہ ہے اِغْسِلُوْا کے معمولات ابھی پورے ذکر نہیں ہونے پائے تھے کہ حرف عطف کے ذریعے اس کے جملہ معطوفہ اِمْسَحُوْا اور اس کے معمولات کا ذکر چھیڑ دیا گیا اور اس جملہ معطوفہ کی تمامیت کے بعد پھر جملہ معطوف علیہا کے معمول اَرْجُلَكُمْ کو ذکر کیا گیا اور یہ بے ربطی اور بے قاعدگی کسی ذی ہوش کے کلام میں برداشت نہیں کی جا سکتی چہ جائے کہ کلام خالق کو اس نا قابل عفو عیب سے ملوث قرار دیا جائے جو مسلم طور پر فصاحت و بلاغت میں اعجازی حیثیت کا حامل ہے۔

فخر الدین رازی نے ایک عذر یہ بھی پیش کیا ہے کہ پاؤں کے حکم کی حد مقرر ہے یعنی کعبین تک اور اس طرف دھونے میں ہاتھوں کی حد مقرر ہے کہنیوں تک پس محدود چیز پر ہی عطف ہونا چاہیے تو اس کا جواب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے جس طرح کہ علامہ طبری نے اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے یہ دیا ہے کہ پاؤں کا محدود ہونا اس کے دھونے کی دلیل نہیں بن سکتا کیوں کہ جس طرح دھونا ایک حکم شرعی ہے اسی طرح اس کے مقابلہ میں مسح کرنا بھی ایک حکم شرعی ہے۔ اس میں حدود کا معین ہونا یا نہ ہونا کوئی اثر انداز نہیں ہے۔

نیز ہم ہاتھوں کے دھونے کے اس لئے قائل نہیں ہے کہ اس کی حدیں مقرر ہیں۔ بلکہ اگر ان کی حدیں مقرر نہ ہوتیں تب بھی ان کا دھونا واجب تھا کیونکہ حکم دھونے کا ہے۔ لہٰذا اس حد بندی کی وجہ سے پیروں کا مسح ثابت کرنا ناجائز ہے۔

اور اگر خواہ مخواہ مناسبت وموافقت کا تلاش کرنا مطلوب ہے یعنی یہ کہ محدود کا عطف محدود پر ہی ہونا چاہیے اور غیر محدود پر نہ ہونا چاہیے تو جب وجوہ غیر محدود تھا اس پر اَیدِی کا عطف کیوں کیا گیا جو کہ محدود ہے پس جس طرح وجوہ غیر محدود پر ایدی محدود کا عطف دھونے کے حکم میں ہوسکتا ہے تو اسی طرح رؤس غیر محدود پر ارجل محدود کا عطف مسح کرنے کے حکم میں بھی ہوسکتا ہے بلکہ ایسا کرنا زیادہ موزوں ہے کیونکہ پہلے جملہ میں دھونے کے اعضاء بتائے۔ جن میں غیر محدود کو مقدم معطوف علیہ قرار دیا اور محدود کو موخر اور معطوف قرار دیا اس کے بعد مسح کا حکم شروع کر کے وہاں بھی غیر محدود کو معطوف علیہ اور محدود کو اس کا معطوف بنایا پس اس طریقہ سے دونوں جملے ایک دوسرے کے بالکل مشابہ ہو گئے کہ معطوف علیہ جملہ میں مغسول غیر محدود مغسول محدود کا معطوف علیہ ہے اور جملہ معطوفہ میں بھی ممسوح غیر محدود ممسوح محدود کا معطوف علیہ ہے۔ بہر کیف فخر الدین جیسے صاحب علم کے قلم سے ایسی پوچ باتوں کا ظہور مقام عبرت ہے لیکن تعصب کی شریعت میں سب کچھ جائز ہے۔ اگر طبیعت میں سلامتی ہو اور دل میں قدرے انصاف ہو تو مسئلہ میں ذرہ بھر گنجلک نہیں لیکن اگر نیت ناصاف ہو اور دل میں کدورتوں کے انبار ہوں تو مطلب اگرچہ کسی قدر ہی واضح کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جائے گا۔ مثل مشہور ہے:

دروغ گو را بہانہ بسیار

اور پھر جس نبی کی شریعت پر ایمان ہے اس نبی کے فیصلہ کو ہی تسلیم کرلیں کیونکہ

خدا بھی فرماتا ہے جب تمہیں کسی بات میں نزاع ہو تو خدا و رسولؐ کی طرف رُجوع کر کے فیصلہ کرا لیا کرو اور ان کا صاف فیصلہ ہے کہ قرآنی مطالب کو علی علیہ السلام سب سے زیادہ سمجھ سکتا ہے چنانچہ ابھی بعد میں چند ایک احادیث اس مضمون کی نقل کی جا رہی ہیں اور شاعر نے خوب کہا ہے۔ (لوامع التنزیل)

إِذَا شِئْتَ اَنْ تَخْتَارَ لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا وَتَعْلَمَ اَنَّ النَّاسَ فِيْ نَقْلِ اَخْبَارِ فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِيِّ وَمَالِكٍ وَاَحْمَدَ وَالْمَرْوِيَّ عَنْ كَعْبِ اَحْبَارِ فَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَحَدِيْثُهُمْ رَوَىٰ جَدُّنَا عَنْ جِبْرِئِيْلَ عَنِ الْبَارِي

''جب تو اپنے لئے کوئی مذہب اختیار کرنا چاہے اور تو جانتا ہو کہ لوگ حدیثیں نقل کرنے کے درپے ہیں۔ تو شافعی مالک کی باتوں کو چھوڑ۔ نیز احمد بن حنبل اور کعب احبار کی روایات کو بھی چھوڑ۔ پس ان لوگوں سے محبت کر جن کی حدیث اور روایات یہ ہو کہ ہمارے نانا نے جبرئیل علیہ السلام سے اور جبرئیل علیہ السلام نے خدا سے یہ حکم پہنچایا۔''

لیکن جن لوگوں کے دل کج ہیں ان کو خواہ مخواہ خاندان نبوی سے عداوت ہے اور ان کو اعمال کے ضائع ہونے کی پرواہ نہیں اور ان کا اصول یہ ہے کہ ہر ایک کی مانیں گے لیکن جو بات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کہیں گے وہ نہ مانیں گے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی ساٹھ ستر برس عمر گزر جاتی ہے اور اس کی ایک نماز بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ راوی نے پوچھا وہ کیسے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وضو میں جس چیز کے مسح کا خدا نے حکم دیا ہے وہ اس کو دھوتا رہا ہے۔ (کافی)

لیعنی جب وہ عمل میں خدا کی مخالفت کرتا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے تو اسے اس

کا ثواب کیا خاک ملے گا۔ بعض لوگ اس اعتراض سے بچنے کے لئے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اَرْجُلَکُمْ پہلے اِغْسِلُوْا کا معمول نہیں بلکہ اس کا عامل جدا محذوف ہے یعنی اصل میں یوں ہے:۔

وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِکُمْ وَاغْسِلُوْا اَرْجُلَکُمْ

''یعنی مسح کرو سروں کا اور دھوؤ پاؤں کو۔''

جیسے کہ ایک عرب کے کلام میں ہے: عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً ا بَارِدًا یہاں مَاءً کا عامل محذوف ہے یعنی اصل میں اس طرح تھا۔ عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً ا بَارِدًا یعنی میں نے اس کو کھلایا بھوسہ پلایا ٹھنڈا پانی تو اس کا جواب یہ ہے کہ حذف وتقدیر اس مقام پر جائز ہو کرتا ہے۔ جہاں التباس کا خطرہ نہ ہو اور حذف پر قرینہ قاطعہ دلالت کرنے والا موجود ہو جس طرح مثال مذکور میں ہے کہ التباس کا خطرہ بھی نہیں اور قرینہ بھی موجود ہے کہ پانی کا تعلق کھانے سے نہیں بلکہ پینے سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن مَانَحْنُ فِیْهِ میں اَرْجُلَکُمْ کا عامل اگر اِغْسِلُوْا محذوف ہے تو اس کا ظاہر کرنا واجب تھا کیونکہ حذف کرنے سے مسح کا التباس بھی موجود ہے اور حذف پر قرینہ قاطعہ بھی موجود نہیں اور اس مقام پر حدیث یا عمل اصحاب کو قرینہ قرار دینا بھی ناجائز ہے کیونکہ ایسے مقامات پر قرینہ متصلہ ضروری ہوا کرتا ہے نہ کہ منفصلہ ورنہ وقت عمل سے بیان کی تاخیر لازم آئے گی اور یہ چیز قطعاً ناجائز ہے جیسا کہ علمائے اصول نے اس کی تحقیق کی ہے۔ بہر کیف پاؤں کے دھونے یا مسح کرنے کے متعلق صحابہ کی دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک جماعت میں بقول رازی ابن عباس خبرالامت اور عکرمہ موجود ہیں اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا مسلک بھی یہی ہے اور دوسری جماعت دیگر صحابہ کی ہے اور نزاع ہے اس بات میں کہ قرآن کیا فیصلہ کرتا ہے تو ایسی نزاعی صورت میں جناب رسالت مآب کا فیصلہ ہی آخری ہونا

چاہیے اور انہوں نے ایک دو نہیں بلکہ بارہا ارشاد فرمایا کہ ایسی صورتوں میں علی علیہ السلام اور آل کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

① عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ لَنْ يَفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ

''یعنی علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس اکٹھے وارد ہوں گے۔''

② عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ يَدُوْرُ حَيْثُمَا دَارَ

''علی علیہ السلام حق کے ساتھ ہے اور حق علی علیہ السلام کے ساتھ ہے حق اس طرف پھرتا ہے جس طرف علی علیہ السلام ہو۔''

③ قَالَ النَّبِيُّ تَكُوْنُ فِتْنَةٌ فَاِذَا ظَهَرَتْ تِلْكَ الْفِتْنَةُ فَعَلَيْكُمْ بِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَاِنَّهُ الْفَارِقُ بَيْنَ الْخَلْقِ وَبَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ

''حضورؐ نے فرمایا فتنہ کا دور آئے گا اور جب وہ زمانہ آئے تو علی علیہ السلام ابن ابی طالب کے ساتھ رہنا کیوں کہ وہ مخلوق میں اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔'' (مناقب خوارزمی)

④ قَالَ النَّبِيُّ مَنْ فَارَقَ عَلِيًّا فَقَدْ فَارَقَنِيْ وَفَارَقَ اللّٰهَ

''حضورؐ نے فرمایا جو علی علیہ السلام سے جدا ہوا وہ مجھ سے اور خدا سے جدا ہوا۔''

⑤ يَا عَمَّارُ اِنْ رَاَيْتَ عَلِيًّا يَمْشِيْ فِيْ وَادٍ وَالنَّاسُ فِيْ وَادٍ آخَرَ

اِذْهَبْ مَعَ عَلِيٍّ فَاِنَّهٗ لَا یُدْخِلُكَ فِیْ ضَلَالَةٍ وَلَا یُخْرِجُكَ مِنْ هُدَایَةٍ

''حضورؐ نے عمارؓ سے ارشاد فرمایا: اگر دیکھو کہ علی علیہ السلام ایک وادی میں جا رہے ہیں اور باقی تمام لوگ دوسری وادی میں جا رہے ہیں تو باقی لوگوں کو چھوڑ کر علی علیہ السلام کے ساتھ ہو جاؤ کیونکہ وہ تم کو گمراہی میں نہ داخل کرے گا اور ہدایت سے نہ باہر کرے گا۔''

⑨ حدیث ثقلین اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ ''میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک قرآن مجید اور دوسری عترت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گی۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔'' یہ تمام حدیثیں مسلم بین الفریقین ہیں۔

پس ان تصریحات کی موجودگی میں اور علاوہ ازیں تمام صحابہ کے اس اعتراف کے باوجود کہ حضرت علی علیہ السلام تمام سے اعلم تر ہیں جیسا کہ ہم نے مقدمہ تفسیر میں اس کو ثابت کیا ہے۔ پس وضوء کے معاملہ میں اگر مسح رجلین میں اختلاف ہے تو کیوں نہ صحابہ کی اس جماعت کا قول مانا جائے جو اہل بیت علیہم السلام کے مسلک کے موافق ہو۔ اہل بیت علیہم السلام کا قول جو قرآن کے ظاہر کے بالکل موافق اور قواعد عربیہ کے عین مطابق ہے۔ اس کی خلاف ورزی کے لئے حدیث کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہی حدیث اور صاحب حدیث بار بار فرمائیں کہ اہل بیت علیہم السلام سے تمسک پکڑو تو پھر حَسْبُنَا کِتَابَ اللّٰہ کی رٹ لگائی جاتی ہے (ببیں چہ بوالعجبی است) اب چند حدیثیں بھی ذکر کرنا ضروری ہیں۔ تاکہ استفادہ وافادہ میں کمی نہ رہے:

① عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَبَی النَّاسُ اِلَّا الْغَسْلَ وَلَا اَجِدُ فِیْ

كِتَابِ اللّٰهِ اِلاَّ الْمَسْحِ

"ابن عباس فرماتے ہیں: لوگوں نے پاؤں دھونے پر ہی ضد کر لیا ورنہ میں کتاب خدا سے مسح کا حکم ہی سمجھتا ہوں۔" (ابن ماجہ، در منثور)

۲ قَالَ ابْنُ عَبَّاس اِفْتَرَضَ اللّٰهُ غُسْلَتَيْنِ وَمَسْحَتَيْنِ اَلاَ تَرَى اَنَّهُ ذَكَرَ التَيَمُّمَ فَجَعَلَ مَكَانَ الْغُسْلَتَيْنِ مَسْحَتَيْنِ وَتَرَكَ الْمَسْحَتَيْنِ

"ابن عباس نے فرمایا: خدا نے وضوء میں دو چیزوں کے دھونے کا حکم دیا اور دو چیزوں کے مسح کا حکم دیا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تیمم میں پانی کی عدم موجودگی کی صورت میں جن دو چیزوں کا دھونا فرض تھا۔ اب مسح کرنا ان کا لازم ہے اور جن چیزوں کا وضو میں مسح کرنا لازم تھا وہ تیمم میں متروک ہیں۔" (در منثور)

۳ عَنِ الشَّعْبِیِّ نَزَلَ جِبْرَئِیْلُ بِالْمَسْحِ عَلَى الْقَدَمَيْنِ اَلاَ تَرَى اَنَّ التَّيَمُّمَ اَنْ يَمْسَحَ مَاكَانَ غَسْلاً وَيُلْغِیْ مَاكَانَ مَسْحًا

"شعبی سے منقول ہے کہ جبرئیلؑ نے قدموں پر مسح کا حکم دیا تھا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ تیمم میں دھونے والی چیزوں کا مسح کیا جاتا ہے اور مسح والی چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔" (در منثور)

۴ تفسیر در منثور سے منقول ہے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام آیت مجیدہ میں اَرْجُلِكُمْ پڑھا کرتے ہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۶۰ تا ۶۵)

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآئِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِيْبًا

"اور تحقیق لیا اللہ نے عہد بنی اسرائیل کا اور بھیجے ہم نے ان سے بارہ نقیب۔"

وضاحت

حضرت یعقوبؑ جو اسرائیل کے نام سے مشہور ہیں کہ بارہ فرزند تھے ہر ایک کو سبط کہا جاتا ہے کیونکہ سبط کلام عرب میں اس درخت کو کہتے ہیں جس کی شاخیں زیادہ ہوں اور چونکہ حضرت یعقوبؑ کا ہر فرزند ایک ایک قبیلے کا باپ بنا اس لئے ان کو انسباط کہا جاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر حضرت امام حسینؑ کو سبط کہا گیا ہے: حسین منی وانا من الحسین، والحسین سبط من الاسباط ،اور تمام اعداد میں سے بارہ کا عدد بھی عجیب مبارک اور محبوب خدا کہ لا الہ الااللہ محمد رسول اللہ علی خلیفۃ اللہ میں سے ہر جملہ بارہ حرفوں سے مرکب ہے۔ پھر نظام کائنات میں مروج کی تعداد بارہ، مہینوں کی تعداد بارہ ہر دن رات کی گھڑیاں بارہ، بنی اسرائیل کے اسباط بارہ پھر ان کے نقیب بارہ اور اسی طرح حضور نے بھی فرمایا:

الائمہ من لبعدی اثناعشریع

''یعنی میرے بعد امام بھی کل بارہ ہوں گے۔''

ینابیع المودۃ سے منقول ہے کہ ایک یہودی نے اپنے سوالات میں سے ایک سوال حضورؐ سے یہ بھی کیا تھا کہ ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام نے تو اپنے بعد حضرت یوشع کو اپنا وصی مقرر فرمایا تھا اور آپ فرمایئے کہ آپ کا وصی کون ہے۔ تو آپ نے فرمایا میرا وصی علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے اور اس کے بعد میرے دو سبط امام حسن اور امام حسین علیہم السلام اور ان کے بعد نو امام ہوں گے حسین علیہ السلام کی اولاد سے (دلوامع التنزیل) یہ روایت بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ ہم اس کو مقدمہ تفسیر میں نقل کر چکے ہیں۔ (تفسیر انوار النجف جلد۵، ص۷۶)

درسِ عبرت

خداوند کریم نے اس سورہ مبارکہ میں سب سے پہلے ایمان والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ میرے عہدوں کو پورا کرو اور پھر حلال و حرام کا ذکر کرنے، تکمیل دین کا مژدہ سنانے، نماز کے لئے وضو، غسل اور تیمم کا بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ میری نعمت اور اپنے عہد کو یاد رکھو جو پختہ کر چکے ہو اور پھر فرمایا حق بیانی کے لئے اپنے میں پختہ ملکہ پیدا کرو اور کبھی حق کنارہ نہ کرو۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۷۷)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ

''تحقیق آپ کا تمہارے پاس اللہ سے نور اور کتاب مبین۔''

نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ: کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور نور کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے لیکن اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت رسالت مآبؐ ہیں اور یہی صورت عقل کے فیصلہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ کتاب پڑھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کا پڑھنا عام کتابوں کے پڑھنے کی طرح تو ہے نہیں بلکہ اس کو پڑھنے سے مراد اس کا سمجھنا ہے تو جس روشنی میں ہم نے اس کو سمجھنا ہے وہ دنیاوی ظاہری روشنی نہیں ہے کیونکہ اس ظاہری روشنی میں کتاب پڑھی جا سکتی ہے لیکن سمجھی نہیں جا سکتی پس اس جگہ نور سے مراد عام روشنی نہیں بلکہ اس سے مراد حضرت رسالت مآبؐ ہیں اور انہی کی بدولت قرآن فہمی ہو سکتی ہے اور چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے ورنہ کہنے کو عذر باقی رہ جائے گا کہ ہم کتاب کو کیا کرتے جب کہ ہمارے پاس نور ہی موجود نہ تھا۔ پس خداوند کریم نے قیامت تک کے لئے نور کا انتظام فرمایا چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کے متعلق خود سرور کائنات نے فرمایا: اَنَا وَعَلِیٌّ مِّنْ نُّوْرٍ وَّاحِدٍ یعنی میں اور علی علیہ السلام ایک نور سے ہیں اور خود حضرت امیر

علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

اَنَا مُحَمَّدٌ وَمُحَمَّدٌ اَنَا وَاَنَا مِنْ مُحَمَّدٍ وَمُحَمَّدٌ مِنِّیْ

''یعنی میں اور محمدؐ ایک ہیں میں محمدؐ سے ہوں اور محمدؐ مجھ سے ہیں۔''

جس طرح حضورؐ نے فرمایا:

عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْعَلِیِّ

''علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَکُلُّنَا مُحَمَّدٌ۔

''ہمارا اول محمدؐ ہمارا آخر محمدؐ ہمارا اوسط محمدؐ اور ہم سب کے سب محمدؐ ہیں۔''

اس حدیث کو اور اس قسم کی دیگر احادیث کو ہم نے بالتفصیل تفسیر کی پہلی جلد یعنی مقدمہ تفسیر میں مقبولیت اعمال اور ولایت آل محمدؐ کے عنوانوں میں بیان کر دیا ہے پس جب حضرت رسالت مآبؐ نور ہیں اور نور محمدی کے ہی اجزا ہیں۔ وہ اس کتاب کے ساتھ ہیں پس قرآن مجید رسالت مآبؐ کی موجودگی میں ان کے بیان کی روشنی کا محتاج تھا اور آپ کے بعد ان کے حقیقی جانشینوں کے بیانات کا محتاج ہے اسی بناء پر تو حضور نے اپنی امت کو متعدد مرتبہ ارشاد فرمایا:

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ..........

''یعنی میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرے عترت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ حوض کوثر تک نہیں میرے پاس پہنچا دیں گی۔''

اور نیز فرمایا:

عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ

''یعنی علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ ہے''

ثقلین کے عنوان کے تحت ہم اس بیان کو وضاحت سے مقدمہ تفسیر میں لکھ چکے ہیں اور صواعق محرقہ سے منقول ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

لَا تُعَلِّمُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ اَعْلَمُ مِنْكُمْ

کہ:

يَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''ہدایت کرتا ہے اس کے ذریعے اللہ اس کو جو تابع ہو اس کی رضا کا سلامتی کے رستوں کی اور نکالتا ہے ان کو تاریکی سے روشنی کی طرف اس کے اذن سے اور ہدایت کرتا ہے اس کو سیدھے راہ کی۔''

اہل بیتؑ کو تم نہ سکھانا کیونکہ وہ تم سے عالم ہیں لیکن ان تصریحات کے باوجود کہنے والوں نے کہہ دیا کہ حَسْبُنَا كِتَابَ اللّٰهِ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ امت اسلامیہ تشتت وافتراق کا شکار بن گئی ورنہ اگر وصیت رسولؐ پر عمل ہوتا اور قرآن کو خدا کے فرستادہ نور کی روشنی میں پڑھا سمجھا جاتا تو اسلام کا شیرازہ منتشر نہ ہوتا۔

خداوند کریم نے اپنی کتاب بھیج کر اس کے معلم بھی اپنی جانب سے بھیجے اور ان کو نور کے مقدس لقب سے نوازا اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سکولوں کا کورس اور کتابیں جب حکومت تجویز کرتی ہے تو ان کے مدرس بھی حکومت اپنے مقرر کردہ معیار کے ماتحت متعین کرتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ کورس حکومت بھیجے اور

مدرس خود سکول کے لڑکے مل جل کر تجویز کرلیں ورنہ نتیجہ معلوم ہی ہے لیکن عجیب منطق ہے امت رسولؐ کی کتاب بھیجے خدا اور کتاب کے معلم تجویز کریں۔ ہم بریں عقل و دانش بباید گریست اور قمی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ یہاں نور سے مراد حضرت امیر المومنین اور باقی آئمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔ وَھُوَ الْحَقُّ

یَھْدِیْ بِہٖ: یہاں ضمیر بِہٖ کے مرجع میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں اس کا مرجع نور ہے اور بعض کے نزدیک اس کا مرجع کتاب ہے اور بعض کہتے ہیں اس کا مرجع دونوں ہیں۔ بتاویل واحد یعنی یَھْدِیْ بِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا۔ معنی یہ ہے کہ خدا ہدایت کرتا ہے نور اور کتاب ہر دو کے ذریعے ان کو جو اس کی رضا کے پیچھے جانے والے ہوتے ہیں لیکن جو اپنی مرضی کے پیچھے چلیں ان کو نہ نور فائدہ دیتا ہے اور نہ کتاب۔ پس اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نور اور کتاب ایک دوسرے سے جدا نہیں اور جو بھی خدا کی خوشنودی چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ دونوں سے تمسک پکڑے کیونکہ سلامتی کا راستہ ان دونوں کی اتباع میں ہے نیز ظلمات جہنم سے نجات اور جنت کی بشارت بھی ان دونوں کی اطاعت سے وابستہ ہے۔ صراط مستقیم پر بھی وہی ہوگا جو ان دونوں سے تمسک رکھتا ہو۔

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: مشکوٰۃ سے بروایت احمد بن حنبل منقول ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علیؑ کو تم ہادی و مہدی پاؤ گے اور وہ تمہیں صراط مستقیم پر چلائے گا۔

عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ یَدُوْرُ حَیْثُمَا دَارَ

"علی علیہ السلام حق کے ساتھ ہے اور حق علی علیہ السلام کے ساتھ ہے حق اسی طرف ہوتا ہے جس طرح علی علیہ السلام ہو۔"

اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے بھی نقل کیا اور صواعق محرقہ میں بھی موجود ہے بلکہ فضل بن روز بہان جیسے متعصب شخص نے بھی اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ کتب صحاح اہل سنت میں موجود ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے عمار کو فرمایا تھا میرے بعد اختلافات ہوں گے قتل وغارت کا بازار گرم ہوگا بعض سے بے زاری کریں گے۔ اے عمار تجھے باغی گروہ قتل کرے گا حالانکہ تو اس وقت حق پر ہوگا اور حق تیرے ساتھ ہوگا۔ علی تجھے گمراہی کے قریب نہ لے جائے گا اور وہ تجھے ہدایت پہ لگائے گا کیونکہ علی علیہ السلام ہمیشہ ہدایت پر رہے گا اور اس کی اطاعت میری اطاعت ہے اور میری اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ (دلائل الصدق، تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۸۰تا۸۱)

قَالُوْا يَا مُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ (المائدہ:۲۲)

"کہنے لگے اے موسیٰ تحقیق اس میں ایک سرکش قوم موجود ہے اور ہم ہرگز نہ داخل ہوں گے یہاں تک کہ وہ نکل جائیں، جب وہ نکلیں گے تو ہم داخل ہونے والے ہیں۔"

تفسیر مجمع لبیان میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے وصی یوشعؑ نے دوران جنگ سورج غروب ہونے پر سورج کے دوبارہ پلٹنے کی دعا مانگی تو سورج واپس پلٹا اور انہوں نے فتح حاصل کی پھر فرماتے ہیں ابتدائے عالم سے تا ایں وقت سورج نے کبھی افق مغرب سے طلوع نہیں کیا مگر چار شخصوں کے لئے حضرت سلمانؑ پیغمبر، دوسرے حضرت یوشعؑ بن نون وصی موسیٰ علیہ السلام اور تیسرے خود جناب رسالت مآبؐ اور چوتھے حضرت علی علیہ السلام بن ابی طالب۔ حضرت رسالت مآبؐ کے لئے دو دفعہ سورج نے پلٹا کھایا ایک معراج سے واپسی پر جب آپ نے کفار کو ان کے قافلہ کی واپسی کی اطلاع دی تھی کہ صبح

کو پہنچ جائے گا تو باذن خدا حضورؐ کی دعا سے سورج نے ایک گھنٹہ طلوع میں تاخیر کر دی کہ وہ قافلہ حسب ارشاد نبوی پہنچ گیا اور دوسرے جنگ خندق کے موقع پر کہ نماز عصر قضا ہوگئی تھی پس آپ کی دعا سے سورج دوبارہ پلٹا اور حضورؐ نے بمعہ صحابہ کے نماز ادا فرمائی اور حضرت علی علیہ السلام کے لئے بھی دو مرتبہ سورج واپس پلٹا۔ ایک دفعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں اور دوسری مرتبہ جنگ نہروان سے واپسی پر اور اسی واقعہ پر اخبار متواترہ دلالت کرتی ہیں۔

زمان رسولؐ میں ردِ شمس

ابن مغازلی شافعی سے منقول ہے کہ اسماء بنت عمیس کہتی ہیں: جناب رسالت مآبؐ پر وحی ہو رہی ہو اور آپ کا سر علی علیہ السلام کی گود میں تھا، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا تو جناب رسالت مآبؐ نے دعا مانگی: اے اللہ! اگر علی علیہ السلام تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا تو اس کے لئے سورج کو پلٹا دے۔ پس میں نے دیکھا کہ غروب کے بعد دوبارہ سورج نے طلوع کیا۔ نیز ابن مغازلی نے ابو رافع سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ حضرت علی علیہ السلام کے زانو پر سو گئے اور نماز عصر کا وقت تھا حضرت علی علیہ السلام نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی اور جناب رسالت مآبؐ کو جگانا بھی پسند نہ کیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ جب حضورؐ بیدار ہوئے تو دریافت کیا: اے ابوالحسنؑ! تو نے نماز نہیں پڑھی۔ آپ نے جواب دیا: نہیں حضورؐ پس سورج واپس پلٹا حالانکہ غروب ہو چکا تھا اور مقام عصر تک پہنچا اور حضرت علی علیہ السلام ں ے نماز عصر پڑھی اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو فوراً غروب ہوگیا اور ستارے موجود ہوگئے نیز اسی حدیث کو خطیب موفق بن احمد بن ابوبکر بن مردویہ نے طحاوی حموینی، قسطلانی اور طبرانی سے بھی نقل کیا گیا ہے نیز جامی نے

کتاب شواہد النبوۃ میں اور ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔
جن لوگوں نے عناد و تعصب کے پیش نظر اس حدیث کو موضوع ثابت کرنے کی کوشش کی اور حضرت علی علیہ السلام کی اس فضیلت کا انکار کیا ہے ان کی رد میں سبط بن جوزی نے تذکرہ خواص الامت میں کہا ہے کہ اگر یوشع بن نون کے لئے سورج واپس آ سکتا ہے اور وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ یا حضرت یوشع کی کرامت ہی تھی تو جب موسیٰ کے لئے یہ شرف ثابت ہے تو ہمارے پیغمبر جو حضرت موسیٰ سے افضل ہیں ان کے لئے کیوں بعید ہے اگر یوشع کے لئے ہو سکتا ہے تو حضرت علی علیہ السلام تو یوشع سے افضل تھے۔ ان کے لئے کیوں نہ ہو؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ اَنْبِیَاءُ بَنِیْ اِسْرَائِیْل

"میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔"

جب عام علماء کی یہ شان ہے تو حضرت علی علیہ السلام کی شان کا پھر کیا اندازہ ہوگا اور نیز حضور سے منقول ہے کہ:

اَلصِّدِّیْقُوْنَ ثَلٰثَۃٌ حِزْقِیْلُ مُؤْمِنُ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَحَبِیْبُ النَّجَّارِ وَھُوَ مُؤْمِنُ اٰلِ یٰسِیْن وَعَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِب وَھُوَ اَفْضَلُھُمْ

"یعنی صدیق تین ہیں۔ ایک حضرت حزقیل جو مومن آل فرعون ہیں دوسرے حبیب نجار جو مومن آل یٰسین ہیں اور تیسرے علی علیہ السلام ہیں اور یہ ان سے افضل ہیں لیکن حزقیل حضرت یوشع کی طرح ایک نبی تھا۔"

پس یہ حدیث صاف دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے افضل تھے یہ جواب دینے کے بعد ذکر کرتا ہے کہ اس مقام پر ایک عجیب حکایت ہے جو یہاں ذکر کی جاتی ہے۔ مجھے عراقی لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابو

منصور مظفر واعظ کر رہا تھا اور عصر کا وقت تھا اس نے حضرت علی علیہ السلام کے فضائل میں سے ردشمس کا واقعہ پڑھا اور اپنے دل کش فقرات اور پر لطف لفاظی اور دل آویز لہجہ میں اسے خوب نبھایا۔ پھر اور فضائل بھی بیان کئے۔ اتنے میں ایک بادل نمودار ہوا اور افق مغرب پر چھا گیا اور سورج کے چھپ جانے پر لوگوں نے یہی سمجھا کہ اب شام ہوگئی ہے تو ابومنصور واعظ منبر پر اٹھ کھڑا ہوا اور سورج کو مخاطب ہو کر اس نے اشعار پڑھے:

لَا تَغْرُبِیْ یَا شَمْسُ حَتّٰی یَنْتَهِیْ

مَدْحِیْ لِاٰلِ الْمُصْطَفٰی وَلِنَجْلِهٖ

وَاثْنِیْ عِنَانَكِ اِنْ اَرَدْتِ ثَنَائَهُمْ

اَنَسِیْتِ اَنْ کَانَ الْوُقُوْفُ لِاَجْلِهٖ

اِنْ کَانَ لِلْمَوْلٰی وَقُوْفُكِ فَلْیَكُنْ

هٰذَا الْوُقُوْفُ لِخَیْلِهٖ وَلِرَجْلِهٖ

قَالُوْا فَانْجَابَ السَّحَابُ عَنِ الشَّمْسِ وَطَلَعَتْ

"اے سورج غروب نہ کرنا تا کہ پوری ہو جائے میری مدح وثنا جو آل نبی و ذریت پیغمبر کے لئے ہے اور اپنی باگ موڑ لے اگر ان کی تعریف سننا چاہتا ہے۔ کیا تجھے وہ وقت بھول گیا ہے جب کہ انکے لئے تجھے رکنا پڑا تھا۔ اگر وہاں مولیٰ کے لئے توقف کیا تھا تو اب یہ وقوف اس کے غلاموں اور نوکروں کے لئے بھی ہونا چاہیے۔"

کہتے ہیں جونہی اس نے یہ اشعار پڑھے تو فوراً بادل پھٹ گیا اور سورج ظاہر ہو گیا تو لوگوں نے ابومنصور واعظ کو بڑے مال وعطیے بلکہ زیورات تک پیش کئے۔

ردشمس بعد از جنگ صفین

ثاقب المناقب سے نقل کیا گیا ہے اور ملا جامی سے شواہد النبوہ میں بھی مروی ہے:

عن جويريه بن مسهر قال لما رجعنا من قتال اهل النهروان من ارض بابل فقال امير المومنين ان هذا ارض معذبة قد عذبت مرتين وفي اخرى ان هذه الارض ملعونة عذبت فيها اهلها ثلث مرات وقد هلكت فيها ماة الف ومائتان لا يصلى فيها نبي ولا وصي بني فمن ارادمنكم فليصل نسرنا الى ان غابت الشمس واواشتبكت النجوم ودخل وقت العشاء الاخره فلما خرجنامن ارض بابل نزل عن البغلة ثم انفض التراب من حوافرها وقال لي يا جويريه اذن للعصر فقلت ثكلتك امك يا جويريه ذهب لنهار وهذاليل واذنت للعصر فرجعت الشمس راجعه كالفرس الجواد ثم غربت وصيلنا العصر ثم قال اذن العشاء ثم قلت وصي محمد ورب الكعبة ثلث مرات لقد ضل وهلك وكفر من خالفك

"جویریہ سے مروی ہے کہ جب ہم نہروانیوں کی لڑائی سے واپس پلٹے۔ بابل کے علاقہ سے تو حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا یہ زمین عذاب کردہ ہے تحقیق دو دفعہ اس پر عذاب نازل ہو چکا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہ زمین ملعونہ ہے اس کی اہل تین دفعہ مبتلائے عذاب ہوئی ہے اور اس میں نبی یا وصی نبی نماز نہیں پڑھتے البتہ جو شخص تم میں سے پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ پھر ہم چلے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ ستارے نکل آئے۔ عشاء کا وقت ہو گیا۔ جب آپ بابل کی زمین سے

نکلے تو آپ خچر سے اترے اور مٹی کو اس کے سموں سے جھاڑا۔ اور فرمایا: اے جویریہ! عصر کی اذان کہو۔ میں نے اپنے آپ کو دل میں کہا: اے جویریہ! تیری ماں تجھے روئے دن تو گیا یہ تو رات ہے۔ خیر میں نے عصر کی اذان کہی تو سورج واپس پلٹا تیز رو گھوڑے کی طرح (کڑ کار مارتا ہوا) اور پھر غروب ہو گیا۔ ہم نے نماز عصر پڑھی۔ پھر فرمایا عشاء کی اذان کہو تو میں نے کہا تو بیشک محمد کا وصی ہے خدا کی قسم اور تین دفعہ کہا اور یہ کہ جو بھی تیری مخالفت کرے وہ گمراہ ہے ہلاک ہے اور کافر ہے۔"

اس روایت کو ہمارے علماء اعلام نے معتبر اور صحیح کتب میں درج فرمایا ہے مثلاً کافی من لا یحضرہ الفقیہ، تفسیر ابوالفتوح رازی، عیون المعجزات سید مرتضیٰ، خصائص علوی سید رضی، مناقب شہر آشوب، ارشاد مفید اور بحار الانوار وغیرہ (لوامع)

دشمنانِ علیؑ

حضرت علی علیہ السلام کے اس قسم کے فضائل سن کر پیچ پا ہوتے ہیں اور بدحواس ہو کر قسم قسم کی لایعنی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں ایسی قضا نماز پڑھنے سے حضرت علی علیہ السلام کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے کبھی کہتے ہیں حدیث موضوع ہے۔ ورنہ بخاری مسلم نے ضرور نقل کی ہوتی ہاں! بے شک ان کو ہر دو حدیث موضوع نظر آتی ہے جس میں آل محمدؐ کے فضائل مذکور ہوں اور بخاری و مسلم کیوں ذکر کرتے۔ وہ بھی تو اسی مکتب خیال کے انسان تھے کہ جو حدیث فضائل علی علیہ السلام پر دال ہو اسے موضوع یا ضعیف قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ بعض مقامات پر جو تائید حق ان کے قلم سے ہوئی ہے وہ بے ساختہ ہوئی اور علی علیہ السلام کو ایک عام صحابی سمجھ کر انہوں نے ان کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور یہ حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت و کمال کا

معجزہ ہے کہ دشمن کی زبان سے بھی نکل ہی آتا ہے۔ معجزہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ جن لوگوں کا اقتدار تھا اور جن کے معتقد اطراف مملکت اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کے فضائل ومناقب نقل کرنے اور بیان کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی بلکہ انعامات واکرامات کے اہل گردانے جاتے تھے باوجود اس کے اسی مکتب خیال کے مصنفین کی کتابوں میں ان کے فضائل ومناقب اتنے نہیں مل سکتے جس قدر آل محمدؐ کے ملتے ہیں حالانکہ بنی امیہ وبنی عباس کا دور جو سادات وغلامان سادات کا انتہائی مظلومیت کا دور تھا۔ حضرت علی علیہ السلام اور آل علی علیہ السلام کو اعلانیہ سب کیا جاتا تھا۔ ان کا نام لینا حرام تھا۔ ان کی منقبت بیان کرنا گناہ تھا۔ ایسے پرخطر وپرفتن دور میں جب کہ اپنے وپرائے فضائل کو چھپاتے تھے۔ اپنے چھپاتے تھے دشمنوں کے ڈر سے اور دشمن چھپاتے تھے عناد وتعصب کے پیش نظر۔ اور باوجود ان سب باتوں کے پھر انہی دشمنوں کی کتابوں میں علی علیہ السلام کے فضائل کا دوسروں کے فضائل سے زیادہ ملنا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز ان لوگوں کے فضائل میں تو احتمال ہو سکتا ہے کہ موضوع ہو کیونکہ ان کے فضائل بیان کرنے پر انعام ملتا تھا لیکن جن کا نام لینا جرم اور نام لینے والے کو قتل کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہو بھلا اسے کیا ضرورت کہ خواہ مخواہ کی بات بنا کر موت کو خریدے۔ پس اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل جو دشمن کی زبان سے نکلے بے ساختہ نکلے ہیں اور وہ اس قدر واضح اور متواتر تھے کہ دشمن بھی ان کو چھپا نہ سکے اور ان فضائل کے مقابلہ میں جہاں دوسروں کی تعریفیں درج ہیں ان میں احتمال ہے کہ ممکن ہے انعام کی خاطر ہوں۔ لہٰذا موضوع ہوں۔ چونکہ خداوند کریم نے سورہ مزمل میں جناب رسالت مآبؐ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی ہے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی امت میں ہونے والے

واقعات کو بنی اسرائیل میں ہونے والے واقعات سے تشبیہ دی تھی اور فرمایا تھا کہ اس امت میں سب کچھ وہی ہوگا جو گزشتہ امتوں میں ہو چکا ہے اور اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت علی علیہ السلام کو کبھی حضرت ہارون علیہ السلام سے اور کبھی یوشع سے مثال دی تو من جملہ تمثیلات و تشبیہات کے جواب اسلامیہ میں مثل بنی اسرائیل کے ظہور پذیر ہوئیں ایک روشس کا واقعہ ہے۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۵۸)

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

"اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں۔"

کرے تو یہ سزا ٹل نہیں سکے گی لیکن اگر گرفتاری سے قبل یا حاکم شرع کے سامنے ثبوت سے قبل توبہ کرلے تو اس کی یہ توبہ مقبول ہوگی اور اس سے سزا دفع کی جائے گی۔ پس قاضی کو اس پر قدرت اس وقت حاصل ہوگی جب ثبوت ہو جائے اور اس سے پہلے وہ آزاد ہے اور اس کے لئے توبہ کی گنجائش ہے۔

وسیلہ تلاش کرنے کا حکم

وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ: وسیلہ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہنچا جائے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ خدا تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ڈھونڈو اور اس میں شک نہیں کہ اللہ کی رضامندی کا ذریعہ دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جن جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان سے رُکا جائے اور دوسرا یہ کہ جن چیزوں کی بجا آوری کا اس نے حکم دیا ہے ان کو بجا لایا جائے یعنی محرمات سے پرہیز کیا جائے اور واجبات کی ادائیگی کی جائے مفسرین عامہ نے یہاں وسیلہ سے یہی معنی مراد لیا ہے لیکن

یہ دیکھنا ہے کہ واجبات ومحرمات کا ہمیں از خود تو علم ہو نہیں سکتا اور قرآن مجید میں اگر چہ سب کچھ موجود ہے لیکن وہ محتاج تفصیل ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہمیں اچھائی اور برائی کی تفصیل بتانے والا کوئی ہوتا کہ اچھے کام کر کے اور برائیوں سے بچ کر ہم خدا کا قرب حاصل کریں اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نہ ہم خود تمام عبادات کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ تنہا قرآن مجید سے استفادہ کر سکتے ہیں، لہٰذا اس کے بیان کے لئے ایک ایسے ہادی کی ضرورت ہے جو حرام وحلال اور جائز و ناجائز کی ہمارے سامنے وضاحت کرے اور وہ وجود ذیجود جناب رسالت مآب کا ہے تو بس معلوم ہوا کہ خدا تک پہنچنے کے لئے سب سے بڑا وسیلہ حضرت رسالت مآب کا وجود مبارک ہے اور چونکہ شریعت قیامت تک اور قرآن کے احکام بھی قیامت تک ہیں لہٰذا وسیلہ کی ضرورت بھی قیامت تک ہے تو ضروری ہے کہ قیامت تک کے لئے ایسے ہادی متعین ہوں جو ہر دور میں خدا کی اطاعت کے طریقے تعلیم کرتے رہیں تا کہ ہم نیکیوں پر عمل کر کے اور برائیوں سے بچکر خدا کا قرب حاصل کر سکیں اور اس کا معین کرنا خدا کا کام ہے جس طرح جناب رسالت مآبؐ کو اس نے ہی منتخب فرما کر بھیجا اسی طرح ان کے بعد ان کا ہر قائم مقام جوامت کے لئے وسیلہ ہوگا وہ ہی بھیجے گا۔ چنانچہ اس نے نامزد فرمایا اور حضرت رسالت مآبؐ نے غدیر کے بھرے مجمع میں بازو پکڑ کر اعلان فرمادیا۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ میری رضامندی ڈھونڈنے کے لئے وسیلہ بناؤ بلکہ فرمایا ڈھونڈو یعنی تمہارا کام وسیلہ بنانا نہیں بلکہ وسیلہ ڈھونڈھ کر اس سے تمسک پکڑنا ہے اور میرا کام ہے وسیلہ بنانا اور تم تک پہنچانا جس طرح میرا کام ہے نبی بنا کر بھیجنا اور تمہارا کام ہے عمل کرنا۔ اسی بناء پر تفسیر قمی میں ہے کہ اس سے مراد امام اور عیون میں جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے کہ آئمہ امام حسین علیہ السلام کی

اولاد سے ہوں گے جو ان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے ان کی نافرمانی کی گویا اس نے اللہ کی نافرمانی کی وہ عروہ وثقیٰ ہیں اور وہ اللہ کی طرف وسیلہ ہیں۔ (تفسیر صافی)

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّمِثۡلَهٗ مَعَهٗ لِیَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ○ یُرِیۡدُوۡنَ

"تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سب اور اتنا اور بھی تاکہ فدیہ دیں اس کو عذاب یوم قیامت سے تو نہ لیا جائے گا اور ان کا عذاب دردناک ہوگا چاہیں گے۔"

اہل بیتؑ عصمت کی جانب سے احادیث متواترہ موجود ہیں کہ اس مقام پر وسیلہ سے مراد آل محمدؐ ہیں اسی بناء پر اپنی دعاؤں میں بھی انسان اس وسیلہ کو مقدم رکھتے کیونکہ ان کے واسطے سے دعا جلد مقبول ہوتی ہے۔ لوامع التنزیل میں درمنشور اور معجم طبرانی وغیرہ سے منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی دعا میں محمدؐ و آل محمدؐ کا واسطہ دیا تھا اور نیز مروی ہے کہ نوح علیہ السلام نے بوقت طوفان حضرت براہیم علیہ السلام نے بوقت آتش نمرود عیسیٰ علیہ السلام نے بوقت گرفتاری یہود یونس نے شکم ماہی میں اور حضرت موسیٰ نے بوقت عصا مارنے کے حضرات محمدؐ و آل محمدؐ کے واسطہ و وسیلہ سے دعا مانگی تھی جو مستجاب ہوئی اور مروی ہے کہ وہ دعا جس کے اول و آخر میں درود ہو مستجاب ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: یہ آیت اس مطلب کی تائید کرتی ہے کہ پچھلی آیت میں وسیلہ کا معنی محمدؐ و آل محمدؐ کی ولا تھی کیونکہ وہاں ایمان والوں کو وسیلہ تلاش کرنے کا حکم تھا اور یہاں فرماتا

ہے کہ جو لوگ کافر ہیں۔ ان کے لئے عذاب ہوگا اور ان کا فدیہ بھی قبول نہ کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اصول کے ترک سے کفر لازم آتا ہے نہ کہ فروع کے ترک سے پس معلوم ہوا کہ وہاں وسیلہ سے مراد اصول تھا جس سے تمسک کے بعد فلاح وکامیابی کی بشارت تھی اور یہاں کفر سے مراد اسی وسیلہ کا انکار ہے تا کہ مقدم و مؤخر کا آپس میں ربط بھی بحال رہے اور اگر تسلسل آیات اور ترتیب مضامین کو بغور دیکھا جائے تو یہ سب عہد غدیر کے ایفاء کے تاکیدی پیغامات ہیں اور عناد رکھنے والوں کے لئے تہدیدی سرزنش ہے چنانچہ صحیح بخاری جلد چہارم باب مناقب حضرت عمر سے منقول ہے کہ جب حضرت عمر سے منقول ہے کہ جب حضرت عمر کو زخم لگا اور صاحب فراش ہوئے تو درد سے گھبرائے ہوئے تھے پس ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: اے امیر المومنین اگر یہ تکلیف ہوگئی ہے تو تسلی کرو۔ آپ تو جناب رسالت مآب کی صحبت کا شرف پا چکے ہیں، یہاں تک کہ حضرت عمر نے فرمایا: اے ابن عباس یہ میری گھبراہٹ اور جزع فزع جو تو دیکھ رہا ہے صرف تیرے اور تیرے ساتھیوں کی وجہ سے ہے (یعنی حضرت علی علیہ السلام وغیرہ) خدا کی قسم اگر تمام روئے زمین میرے لئے سونا بن جاتی تو میں وہ سب فدیہ دیتا۔ اس عذاب خدا کا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ اسی طرح تاریخ الخلفاء سیوطی اور استیعاب سے بھی منقول ہے اب دانش مند انسان خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔

لیکن دوسری طرف امام الاولیاء، سید الاوصیاء حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام مہر جنگ میں بغیر زرہ کے شامل ہوتے ہیں اور اپنے فرزند محمد اور دیگر موالیان کے سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

لَا یُبَالِیْ اَبُوْکَ اَسَقَطَ عَلَی الْمَوْتِ اَمِ الْمَوْتُ سَقَطَ عَلَیْہِ

''تیرے باپ کو پرواہ نہیں کہ موت میں جا پڑے یا موت اس پر آ جائے۔''

اور اس قدر اطمینان نفس کہ بوقت شہادت فرماتے ہیں۔ فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَه
کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہوا ہوں اور نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مجھے موت سے اس طرح محبت ہے جس طرح بچے کو اپنے ماں کے سینے سے ہوا کرتی ہے۔" (تفسیر انوار النجف جلد ۵، ص ۹۷)

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

"جو چوری کرے مرد یا عورت پس کاٹ دو ہاتھ ان کے بدلے میں اس کے جو انہوں نے کیا سزا ہے خدا کی جانب سے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

نصب امام

فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ امام کا مقرر کرنا اس امت پر واجب ہے کیونکہ خدا نے امت پر واجب کیا ہے کہ چور پر حد لگائیں اور اس کا ہاتھ کاٹیں۔ اسی طرح زانی کے سنگسار کرنے کا حکم بھی امت کو دیا گیا ہے اور اس پر اجماع قائم ہے کہ ہر ایک فرد امت کو حد جاری کرنے کا حق نہیں، بلکہ حد جاری کرنے کا حق صرف امام کو حاصل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ امت پر واجب ہے کہ اپنے درمیان ایک امام مقرر کریں ورنہ امت کو حدود کا حکم دینا بغیر امام کے تکلیف غیر مقدور ہے اور وہ محال ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ امت پر واجب ہے حدود کا قائم کرنا اور حدود کا قائم کرنا موقوف ہے تعین امام پر لہٰذا امت پر تعین امام واجب ہے۔ گویا امت کو اقامت حدود کا امر بعینہٖ تعین امام کا امر ہے تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

① آیتِ مجیدہ کی دلالت جس سے رازی کو بھی اتفاق ہے اس امر پر یقینی ہے کہ ہر زمانہ میں امام کا موجود ہونا ضروری ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ رازی کہتا ہے وہ ہمیں بنانا چاہیے اور ہم کہتے ہیں یوں نہیں بلکہ یہ خدا کا کام ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نے امام بنایا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میرا عہد امامت ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا اور اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ ہر گناہ ظلم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ گار کو امامت نہیں مل سکتی۔ بعض اہلِ سنت مفسرین نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے اور ناممکن ہے کہ ہم ایسے شخص کو امامت کے لئے چن لیں جو گناہ گار واقعی نہ ہو، کیونکہ ہم تو اس کو چنیں گے جو ہمیں نیک معلوم ہوتا ہو گا لیکن کیا معلوم وہ واقعاً گناہ گار ہو اور عنداللہ ظالم ہو۔ پس یہ انتخاب اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے ہر زمانہ کے لئے امام نامزد فرما دیئے ہیں جو معصوم ہیں۔ اور وہ آلِ محمدؑ۔

② واجب کا مقدمہ واجب تب ہوتا ہے کہ پہلے موجود نہ ہو۔ مثلاً کوٹھے پر چڑھنے کے لئے سیڑھی کا نصب کرنا واجب تب ہوگا کہ سیڑھی پہلے نصب شدہ نہ ہو۔ جب ثابت ہو گیا کہ امام امت خدا کی جانب سے نامزد ہو چکے ہیں تو پھر امت پر دوبارہ نصب کرنے کا وجوب کیسے عائد ہوگا۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ عناد و تعصب کی پٹی آنکھوں پر اگر کوئی باندھ لے اور کہے کہ امام نصب نہیں ہوا، اور یہی رٹ لگاتا رہے تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں، ورنہ خم غدیر کے ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مجمع میں برسرِ عام حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کا اعلان فرمایا اور تمام کو سنایا۔ فخر الدین رازی اس طرف سے آنکھیں بند کر کے کہتا پھرے کہ نہیں انہوں نے نہیں بنایا بلکہ ہم خود بنائیں گے تو بے شک بناتا پھرے کسی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

③ ہر واجب کا مقدمہ واجب نہیں ہوتا بلکہ اس واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے جو واجب مطلق ہو جیسے نماز وغیرہ لیکن اگر واجب مشروط ہو جیسے زکوۃ، حج تو ان کا مقدمہ واجب نہیں، کیوں کہ زکوۃ موقوف ہے نصاب پر اور نصاب کا حاصل کرنا ہم پر واجب نہیں۔ اسی طرح حج موقوف ہے زادِراہ کے وجود پر اور وہ ہم پر واجب نہیں۔ اسی طرح اقامت حدود بھی واجب مشروط ہے کہ اگر امام ہو تو حدود واجب ہیں لیکن امام کی تعیین ہم پر واجب نہیں ہے۔

④ کسی شے کا امر اس کے موقوف علیہ کا امر اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ شے کا موقوف علیہ از قبیل اسباب ہو، کیونکہ مسبب کا امر درحقیقت سبب کا امر ہوا کرتا ہے۔ جس طرح آگ سبب ہے جلنے کا تو کسی شے کو جلانے کا امر درحقیقت آگ لگانے کا امر ہے اور سبب اسے کہتے ہیں جس کے پائے جانے کے بعد مسبب خواہ مخواہ پایا جائے۔ پس اگر موقوف علیہ شے کا سبب نہ ہو بلکہ عام شرط ہو تو شے کا امر اس کا امر نہ ہوگا بلکہ وہ کسی اور دلیل کا محتاج ہوگا اور یہ بات واضح ہے کہ وجودِ امام اقامتِ حدود کے لئے سبب نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ امام بھی موجود ہو اور حدود بھی معطل ہوں۔ جب کہ امام ظالمین کے تشدد میں مجبور ہو۔ پس معلوم ہوا کہ امام کا وجود نصبِ حدود کے لئے شرط ہے سبب نہیں۔ پس اقامت حدود کا امر نصب امام کا امر نہیں بن سکتا۔

⑤ اگر اس آیتِ مجیدہ سے ثابت کیا جائے کہ اقامتِ حدود کا وجوب امام کے نصب کرنے کو واجب کرتا ہے تو پھر اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ نبی کا نصب کرنا بھی امت پر واجب ہے کیوں کہ قرآن کے احکام ابتداءِ اسلام سے قیامت تک سب مسلمانوں کے لئے یکساں ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کچھ مسلمانوں کے لئے نصب امام جو کہ نبی علیہ السلام تھے خود خدا کرے اور باقیوں کو بغیر نصب امام کے چھوڑ دے اور

اقامت حدود کا بھی حکم دے دے کہ امام خود بناتے پھرو؟؟ تو گویا اسلام کے فرائض سابقہ مسلمانوں کے لئے کچھ اور تھے اور ہمارے لئے کچھ اور ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے اور باطل ہے پس ثابت ہوا کہ جس طرح پہلے دور کے مسلمانوں کے لئے نصب امام اللہ نے کیا اور نبی بنا کر بھیجا جو اقامت حدود کرے تو اس کے بعد قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے بھی نصب امام خدا خود ہی کرے گا اور وہ امام جناب نبی علیہ السلام کے قائم مقام ہوں گے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہر زمانہ کا امام معصوم ہی ہوگا۔ ورنہ امت کے بعض افراد کی بعض پر ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی کہ دور اول کو تو خدا نے معصوم ہادی عطا فرمایا جو اقامتِ حدود اور باقی فیصلے اپنی عصمت کے پیش نظر صحیح اور برمحل کرتے تھے اور قیامت تک کے مسلمانوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا کہ ان کو بلا ہادی چھوڑ دیا تا کہ خود بنالیں یا ایسے ہادی ان کے حصے میں رکھ دیئے جو غیر معصوم تھے اور امت کو الٹی چھری کے ساتھ ذبح کرتے تھے۔ پھر تو عجیب و غریب ہو گئی اسلامی مساوات جب کہ اسلام کی بنیاد ہی ترجیح بلا مرجح پر ہو گئی تو کسی دوسرے حکم میں مساوات کا تلاش کرنا تو فضول محض ہی ہوگا۔ حالانکہ اسلام مساوات کا حامی ہے اور اس کے جملہ اصول و فروع میں مساوات ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر دور کا امام خدا کی جانب سے نامزد ہے اور وہ بھی نبی کی طرح معصوم اور پاک ہے جس طرح کہ دور اول کے لئے نبی خدا کی جانب سے نامزد تھا اور معصوم تھا۔

(۹) آیتِ مجیدہ میں چور مرد یا عورت کے ہاتھ کاٹنے کا خطاب امت کے افراد کو ہے ہی نہیں بلکہ خطاب نبی و امام کی طرف متوجہ ہے۔ پس نہ امت کو بالعموم خطاب ہے اور نہ مقدمہ کے وجوب کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح سلطان وقت حکم نافذ کرتے ہیں کہ مجرموں کو فلاں سزا دو تو اگرچہ خطاب عام ہوتا ہے لیکن درحقیقت

سرکاری مجسٹریٹ مخاطب ہوا کرتے ہیں۔

غیبتِ امامؑ

جواب: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اقامتِ حدود نظم امت اور حلال وحرام کی وضاحت نیز جملہ امور دینیہ کی انجام دہی کے لئے امام کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے تو امام کی غیبت کے زمانہ میں وجود امام کا کیا فائدہ ہوگا۔

جس وقت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود تھے تو وہ صرف ایک مقام پر رہتے تھے۔ اطراف مملکت کے مسلمانوں سے تو غائب تھے وہ مسلمان جو مدینہ سے دور تھے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک رسائی نہ کر سکتے تھے ان کو وجود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا فائدہ تھا؟ نیز جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی یہ واجب نہ تھا کہ ہر جگہ، ہر شہر میں جا کر اپنے فرائض کی ادائیگی فرمائیں۔ جو جواب وہاں ہوگا غیبتِ امام میں ہمارا جواب بھی وہی ہوگا۔ اگر وہاں یہ کہا جائے کہ ان کی طرف سے نائبین سب کام کرتے تھے اور ان کی نیابت میں امور شرعیہ کی بجا آوری ہوا کرتی تھی تو زمان غیبت میں امام غائب کے نائب ان کی نیابت میں امور شرعیہ ودینیہ کی تکمیل اور بجا آوری کے ذمہ دار ہیں اور صاحب الزمان علیہ السلام کا فرمان ہے کہ حوادث واقعہ میں ہماری احادیث کے رواۃ کی طرف رجوع کرو کیوں کہ وہ میری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں حجتِ خدا ہوں اور حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص تم میں سے ہماری احادیث کا راوی ہو اور ہمارے حلال وحرام کو پہچانتا ہو تو اس کی حکومت پر راضی ہو جانا چاہیے کہ میں نے اس کو تمہارا حاکم بنا دیا ہے۔ (لوامع التنزیل) (تفسیر انوار النجف جلد ۵ ص ۱۰۵)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ

بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ

''اے ایمان والو! جو مرتد ہو جائے تم میں سے اپنے دین سے پس عنقریب لائے گا اللہ ایسی قوم کو کہ ان کو محبوب رکھے گا اور وہ اس کو محبوب رکھیں گے۔'' (مائدہ آیت ۵۴)

مَنْ يَّرْتَدَّ: اس شرط کی جزا محذوف ہے یعنی اگر کوئی مرتد ہوگا تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ وہ نقصان اس کو ہی ہوگا۔ تفسیر صافی میں قمی سے منقول ہے کہ یہ خطاب اصحاب پیغمبر کو ہے جنہوں نے آل محمدؐ کے حقوق غصب کیے اور دین سے مرتد ہو گئے۔

فَسَوْفَ يَاْتِيَ اللّٰهُ: تفسیر مجمع البیان میں ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا معنی دریافت کیا گیا تو آپ نے سلمانؓ کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا یہ اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔ پھر فرمایا:

لَوْكَانَ الدِّيْنَ مُعَلَّقًا بِالثُّرَيَّا لَتَنَا وَلَهُ رِجَالٌ مِنْ اَبْنَاءِ فَارِسْ

کہ اگر دین ثریا پر لٹکا دیا جائے تب بھی اس کو ایران کے لوگ حاصل کر لیں گے۔ یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد حضرت امیر علیہ السلام اور ان کے اصحاب ہیں جنہوں نے جمل صفین اور نہروان میں ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جہاد کیا اور صادقین علیہما السلام سے بھی ایسا ہی مروی ہے اور اس کے قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جنگ خیبر کے موقعہ پر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو انہی صفات سے یاد فرمایا جب کہ علم اٹھا کر جانے والے یکے بعد دیگرے علم چھوڑ کر بھاگ آتے تھے کہ وہ ساتھیوں کو بزدل کہتے تھے اور ساتھی ان کو بزدل کہتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ لَا یَرْجِعُ حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ عَلٰی یَدِہٖ ثُمَّ اَعْطَاھَا اِیَّاہُ

''یعنی ضرور دوں گا کل میں علم فوج اس شخص کو جو اللہ و رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے، کرار و غیر فرار ہوگا اور نہ واپس آئے گا، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پر خدا فتح رکھے گا اور اس کے بعد علم حضرت کو ہی عطا فرمایا تھا۔''

پھر مومنوں سے نرمی اور کفار پر سختی اور جہاد راہِ خدا حضرت علی علیہ السلام کی وہ صفات ہیں جن کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، جسے ذرہ بھر بھی تاریخ سے مس ہے اور ایک دفعہ قریشی لوگ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے بعض غلام آپ کے ساتھ ملحق ہو گئے ہیں۔ وہ ہمیں واپس دے دیجئے تو آپ نے فرمایا: اے گروہ قریش! ان باتوں سے باز آ جاؤ ورنہ خدا تم پر ایک ایسا شخص مسلط کرے گا جو تاویلِ قرآن کے ماتحت تمہارے سر قلم کرے گا۔ جس طرح کہ میں نے تنزیل کے ماتحت تمہارے سر قلم کئے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ابا رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے تو فرمایا نہیں بلکہ وہ خاصف النعل ہے جو حجرہ کے اندر بیٹھا ہے اور اس وقت حضرت امیر علیہ السلام جنابِ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعلین مبارک کی اصلاح کر رہے تھے اور بصرہ میں جنگِ جمل کے موقعہ پر حضرت علی علیہ السلام نے خود فرمایا تھا کہ اس آیت مجیدہ کے مصداق آج تک نہیں آئے تھے گویا ہم ہی اس آیت کے مصداق ہیں۔ (مجمع البیان)

مرتد کون ہوئے؟

تفسیر کبیر میں کشاف سے منقول ہے کہ کل مرتد ہونے والے گیارہ گروہ ہیں۔ تین گروہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھے اور سات گروہ حضرت اوّل کے زمانہ میں اور ایک حضرت دوئم کے زمانہ میں تھا۔ وہ تین جو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھے:

① ذوالحمار اسود عنسی جو کاہن تھا اور یمن میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور پورے علاقہ پر چھا گیا تھا اور اس کی قوم بنومدلج اس کے ساتھ تھی۔ انہوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارندوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ بن جبل کو لکھا اور آخر کار فیروز دیلمی کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت مسلمانوں کو مژدہ سنایا کہ ذوالحمار قتل ہو گیا ہے۔

② بنوحنیفہ یہ مسلمہ کذاب کی قوم تھی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خط لکھا تھا:

مِنْ مُسَيْلَمَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْاَرْضَ نِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لَكَ

"یعنی یہ خط مسلمہ رسول کا محمد رسول اللہ کی طرف ہے اما بعد تحقیق زمین نصف آپ کی ہو اور نصف میری ہو۔"

تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جوب میں تحریر فرمایا:

مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى مُسَيْلَمَةِ الْكَذَّابِ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

''یعنی محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کو،
اما بعد! تحقیق یہ زمین اللہ کی ہے۔ اس کا وارث بنائے گا جسے چاہے گا
اور انجام خیر متقیوں کے لئے ہے۔''

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اس وحشی کے ہاتھوں قتل ہوا جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا تھا۔ چنانچہ بعد میں وہ وحشی کہا کرتا تھا:

قَتَلْتُ خَيْرَ النَّاسِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَشَرَّ النَّاسِ فِي الْإِسْلَامِ

''یعنی زمانہ جاہلیت میں میں نے ایسے شخص کو قتل کیا جو لوگوں میں سے
بہترین تھا اور مشرف باسلام ہونے کے بعد ایسے شخص کو قتل کیا جو لوگوں
میں سے بدترین انسان تھا۔''

③ قوم بنی اسد جو طلیحہ بن خویلد کے ساتھ تھے۔ اس نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی سرکوبی کے لئے خالد کو بھیجا اور یہ شخص شام کی طرف بھاگ گیا اور بعد میں مسلمان بھی ہوگیا۔ اس کے بعد وہ سات گروہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مرتد شمار کیے گئے:

① بنو فزارہ ② غطفان ③ بنو سلیم ④ بنو یربوع

⑤ بنو تمیم سجاح بنت منذر تمیمیہ کی قوم جس نے نبوت کا دعویٰ کر لیا تھا اور مسیلمہ کذاب سے شادی کی تھی۔

⑥ قوم کندہ

⑦ بنو بکر اور حضرت ابوبکر نے ان کی سرکوبی کی اور حضرت عمر کے زمانہ میں غسان کی قوم مرتد ہوئی اور جبلہ بن ایہم ان کا سردار تھا۔ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا

اور اس کی چادر زمین پر لٹکی ہوئی تھی۔ پس ایک شخص کا پاؤں اس کی چادر پر آ گیا۔ اس نے اپنی سرداری کے گھمنڈ میں غصے سے اس کو ایک طمانچہ مار دیا پھر مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیش ہوا، تو انہوں نے حکم دیا کہ طمانچہ کے بدلہ میں طمانچہ ہوگا، مگر یہ کہ صاحب حق کو راضی کیا جائے تو اس نے ایک ہزار دینا چاہا لیکن وہ شخص نہ مانا پھر وہ رقم بڑھاتا گیا، یہاں تک دس ہزار تک پہنچا لیکن اس شخص نے کہا میں تو بدلہ ہی لوں گا تو جبلہ نے مہلت مانگی اور حضرت عمر نے مہلت دے دی۔ پس وہ وہاں سے روم کی طرف بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا۔ فخر الدین رازی نے یہ سب تفصیل نقل کرنے کے بعد حسن کا قول نقل کیا ہے۔ خدا جانتا تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایک قوم اسلام سے پھر جائے گی پس خبر دے رہا ہے کہ میں ایسی قوم کو لاؤں گا جو میرے محبوب بھی ہوں گے اور محب بھی۔ پس یہ آیت مجیدہ غیب کی خبروں میں سے ایک خبر ہے جو واقع ہو کے رہی اور اعجاز قرآن کی دلیل ہے۔

حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اور مطلب میں الجھاؤ پیدا کرنے کی خاطر رازی اور اس کے تمام ہم مشرب مفسرین نے بہت تانا بانا شروع کر دیا اور مرتدوں کو تلاش کرنے کے لئے بہت دور دور تک اپنی باریک بین نگاہوں کو دوڑانے لگ گئے پس کسی کو یمن سے ڈھونڈھ لائے اور کسی کا کسی اور جگہ سے کھوج نکال لیا گیا۔ مثال کے طور پر اگر کسی سفید پوش کی چوروں کے ساتھ سازش ہو تو کبھی پولیس کو چوروں کے گھروں کی تلاشی کا مشورہ نہ دے گا بلکہ اگر پولیس احتیاطاً اس طرف ارادہ کرے بھی تو صاف کہہ دے گا حضور یہ تو بڑے شریف لوگ ہیں اور خود پولیس کے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں اور چوروں کو سزائیں دینے والے ہیں۔ ان کے متعلق تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ خود

چور ہوں۔ پس وہ پولیس کو حقیقی چوروں کے گھروں سے کوسوں دور پھراتا رہے گا اور بے گناہوں اور غیر خوشامدیوں کو مروا پٹوا کر دفتر سرکار میں سے اپنا نیک نامی کا سرٹیفکیٹ بھی لے لے گا اور کسی نہ کسی بے گناہ کو فرد جرم کی سزا بھی دلوا دے گا۔

آیئے صحیح بخاری کا مطالعہ فرمایئے تاکہ پتہ چل جائے کہ مرتد کون تھے۔ حضور فرماتے ہیں: بروز محشر

① یجاء برجال من امتی فیوخذبهم ذات الشمال فاقول یارب اصحابی فیقال انك لا تدری مااحدثوا بعدك (الی ان قال) فیقال ان هولاء لم یزالوا مرتدین (تفسیر سورہ مائدہ)

"میرے پاس میری امت کے چند آدمی لائے جائیں گے اور ان کو دوزخ میں لے جایا جائے گا: تو میں کہوں گا میرے رب یہ تو میرے اصحاب ہیں تو کہا جائے گا آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ (حتی کہ فرمایا) یہ لوگ مرتد ہو گئے تھے۔"

کتاب الفتن میں ایک حدیث صحیح بخاری میں مروی ہے:

② قال النبی انافرطکم علی الحوض لیرفعن الی رجال منکم حتی اذا هویت لاناولهم اختلجوا دونی فاقول ای رب اصحابی فیقول لاتدری ما احدثوا بعدك

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں حوضِ کوثر پر تمہارا منتظر ہوں گا اور تم میں سے چند آدمی میرے پاس لائے جائیں گے۔ جب میں ان کو جام کوثر دینا چاہوں گا تو وہ ہٹا لئے جائیں گے تو میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ خدا فرمائے گا۔ آپ نہیں

جانتے کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا گل کھلائے ہیں۔"

④ حدیثِ حوض میں ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں:

فیقال لا علم لك بما احدثوا بعدك انهم ارتدوا علی ادبارهم القهقری

"تو جواب ملے گا کہ آپ کو علم نہیں جو آپ کے بعد یہ لوگ کرتے رہے ہیں یہ تو مرتد ہو گئے تھے اپنے پچھلے پاؤں۔"

بہرکیف اس باب کی احادیث بہت کافی ہیں۔ ہم نے مقدمہ تفسیر (ص ۱۴۸ تا ۱۴۹) پر بھی بعض کا ذکر کیا ہے۔ ان میں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ ذوالحمار، سود عنسی یا مسیلمہ کذاب یا طلیحہ کو لایا جائے گا اور ان کا ارتداد مجھے سنایا جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے اصحاب ہوں گے جن کی عیب پوشی کے لئے یہ مفروضہ حدیث پڑھی سنی جاتی ہے۔ اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم کہ میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے اور رِجَالٌ مِنْكُمْ کے خطابی الفاظ تو یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ خطاب مجلس وعظ میں سامنے بیٹھے ہوئے حضرات کو ہو رہا ہے کہ تم میں سے کئی ایسے ہوں گے اور یقیناً یہاں یمن وطائف کے لوگ مقصود نہیں ہیں یا گردونواح کے دیہاتی مراد نہیں ہیں بلکہ مہاجرین وانصار میں سے پہلو بہ پہلو بیٹھنے والے ہی مخاطب ہو رہے ہیں اور صحاح ستہ کی مسلم حدیث کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لتتبعن سنن من كان قبلكم شبر الشبر وذراعا بذراع حتی لو سلكوا جحر ضب السلكتموه قلنا يارسول الله اليهود

والنصاری فقال النبی فمن

''جو کہ تم اپنے سے پہلی امتوں کے قدم بقدم چلو گے حتی کہ اگر وہ سوسمار کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں تو تم بھی وہی راہ لو گے۔''

راوی کہتا ہے کہ ہم نے دریافت کیا کہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: پھر اور کون مراد ہے؟ یعنی میں وہی مراد لے رہا ہوں کہ تم انہی کے قدم بقدم چلو گے یعنی جس طرح انہوں نے اپنے نبیوں کا طریقہ چھوڑ کر ان کے حقیقی دین کو مسخ کر ڈالا تم بھی ایسا ہی کرو گے اور یہ خطاب بھی اپنوں کو اور بالخصوص انہی لوگوں کو ہے جو ساتھ اور آس پاس بیٹھے ہیں نہ کہ گرد و نواح کے دیہاتی بدوی مراد ہیں اور نہ طائف و یمن کے مدعیانِ نبوت مقصود ہیں۔ نیز دور والے اور جنگل کے باشندے دین کا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں۔ یہ خطاب انہی کو تو ہے جن کے بگڑنے سے دین کو خطرہ تھا۔ نیز حدیث قرطاس جس کو بخاری میں متعدد جگہ ذکر کیا گیا ہے:

اکتب لکھ کتابا لا تضلوا بعدی

''میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں تا کہ تم گمراہ نہ ہو۔''

(بقیہ آئندہ جلد میں دیکھیے)



ادارہ منہاج الصالحین لاہور